
بارش میری سہیلی
راحت وفا

انتساب

حشمت وفا کے نام

جنہیں مرحوم لکھنے کو

جی نہیں چاہتا

فہرست




پیش لفظ

[illegible] وفا ایک بے حد روشن خیال کشادہ دل اور پیش قدم صحافی اور ادیب حشمت وفا [illegible] مرحوم ان قلم کاروں میں سے تھے جو اپنی اولاد کیلئے جذبات خواب آدرش قرضے [illegible] باقی محبتیں اور احباب کے منافقانہ دلاسے چھوڑ جاتے ہیں۔ راحت کی اپنی زندگی میں [illegible] ہیں اپنے قریبی رشتوں میں بہن بھائیوں کی خاطر کی جانے والی ملازمت میں ایک انسان [illegible] وہ ان ذہنی رفاقت میں بڑی بڑی کہانیاں موجود ہیں۔ مگر ان کہانیوں کو بیان کرنے کیلئے [illegible] کشور ناہید فہمیدہ ریاض یا فردوس حیدر بننا پڑتا ہے۔ راحت وفا ابھی رومان کی گرفت [illegible] آنچل کی سرسراہٹ محرومیوں کی داستان طرازی خواب ناک دلدلیں سسکتی [illegible] محبتیں اور رنگین جذباتی سہارے فی الوقت راحت کی افسانوی کائنات کے اہم [illegible] کے کرداروں کی وجاہت ایثار دردناک موت پچھتاوا واپسی اس کے رومانوی [illegible] کشش پیدا کرتے ہیں جو زندگی کی سنگینی نے ہم سے چھین لی ہے حتیٰ کہ اس کا تصور [illegible] کشش کا اپنا ذائقہ اور رنگ ہے جو تکیئے کے میلے اور متعفن غلاف کو اجلا چمکیلا اور [illegible] ٹوٹی جھلنگا چارپائی کو مخملیں ڈبل بیڈ حقیقی رشتوں کے کھردرے پن کو [illegible] [illegible] میں تبدیل کرتا ہے------

راحت کے افسانوں کے کردار جس طرح ایک باڑ پھلانگ کر دوسرے گھر میں چلے جاتے [illegible] طرح وہ زندگی سے موت کے آنگن میں بھی محض ایک باڑ پھلانگ کر چلے جاتے ہیں۔ ان [illegible] کے مناظر پیدا کرتی ہے جو خواتین کے افسانوں اور ناولوں سے مخصوص ہو گئے

مجھے یقین ہے کہ ایک بہادر باپ کی حوصلہ مند بیٹی' جو تخلیقی شعور رکھتی ہے' وہ آنچل' سے باہر آئے گا' اس کے کردار رندھی ہوئی آواز کے گلوگیر لہجے کی نمکینی پر ہی اکتفا نہیں کریں گے' وہ رقت اور جذباتیت کی شرابور حالت سے نکلیں گے' وہ پورے کے پورے بولیں گے' حرکت کریں گے' زندگی کی کشاکش کے عقدے خوابوں میں نہیں کھولیں گے' من چاہی راہوں کے فریب میں نہیں بھٹکیں گے۔ بالائی طبقے کے کرداروں سے انسان دوستی کی بھیک پر گزارہ نہیں کریں گے' تب افسانے کے قارئین کا اس راحت وفا سے تعارف ہو گا۔ جس سے میرا خیال ہے کہ میں واقف ہوں۔

ڈاکٹر انوار احمد

محبتوں کی شبنم

راحت وفا عصر نو کی افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کی بنت ہمارے معاشرتی ڈھانچے کی اونچ نیچ سے نمو پاتی ہے۔ جہاں زندگی کی بنیاد صرف محبت ہے۔ دولت ذات پات یا اس قسم کے تمام بکھیڑے محبت سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ زیر نظر افسانوی مجموعے "بارش میری سہیلی" میں راحت وفا کی ساری کہانیوں میں عورت کی فطری وفا کی خوشبو ہے ------ عورت جو محبت کو مہک کی طرح محسوس کر لیتی ہے ------ اور احساس کی طرح اپنے قلب و جان میں اتار لیتی ہے۔ ان کی کہانیاں بڑی معصوم' بڑی گداز اور شبنم کی طرح ٹھنڈک پہنچانے والی ہوتی ہیں۔

زندگی ایک تجربہ گاہ ہے۔ ایک مصنف جب قلم کا تیشہ ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے تو وہ اپنے لئے ایک راہ گزر بھی متعین کر لیتا ہے۔ جہاں اسے واقعات و مناظر نظر آتے ہیں۔ انہیں آپنے ہی انداز میں قلمبند کرتا رہتا ہے۔

اگرچہ راحت وفا کی کہانیوں کا موضوع محبت ہی رہا ------ ایک ایسی محبت جو ان جانے لمحوں میں انسانوں کو انسانوں سے ہو جاتی ہے اور جس کے ساتھ ہی دل دھڑکنا اور آنکھ خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہے مگر ان کی کہانیوں کی زیریں لہروں میں اپنے معاشرے کی اخلاقی و روحانی اقدار کی کھنک صاف سنائی دیتی ہے۔ ان کا لہجہ بہت شستہ ہے اور ان کی قلم میں بہت روانی ہے ----- مگر ان کے سامنے ابھی زندگی کی ایک بہت بڑی تجربہ گاہ ہے ------ جہاں زمیں اور بھی آسماں اور بھی ہیں۔ وہ ذہن رسا رکھتی ہیں اور امید ہے وہ ابھی زندگی کے بہت سے مسائل کو بھی اپنے قلم کا موضوع بنائیں گی۔

بشریٰ رحمن

گھنگھرو ٹوٹ گئے

"اماں خاموشی توڑ دے۔ مجھے بتا کہ اس رئیس زادے نے جو کہا ہے کیا وہ سچ ہے؟" افشاں نے بلکتے ہوئے نیلوفر کو جھنجھوڑ دیا۔

"بیٹا' آج پہلی بار تو کسی نے یہ سب نہیں کہا' اب تک تمہیں میری طرح عادی ہو جانا چاہئے تھا۔" نیلوفر کے چہرے پر آنسوؤں نے پرانے زخم تازہ کر دیئے تھے۔

"اماں!" آج تک ایسا زہر کسی نے نہیں اگلا تھا۔" وہ سسکی۔

"پگلی اس طرح پریشان ہونے سے کیا فائدہ۔"

"کاش تو پیدا ہوتے ہی میرا گلا دبا دیتی مگر یہاں مجھے اس شیش محل میں جنم نہ دیتی۔" اس نے ڈبڈباتی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔

"تقدیر بڑی ظالم ہوتی ہے کاتب تقدیر کا یہی فیصلہ تھا۔" نیلوفر کے شکستہ لہجے پر وہ مزید بکھر گئی۔

"اماں! کیا واقعی میں کسی بگڑے ہوئے امیر کا......؟"

"چپ ہو جا' چپ ہو جا منہ بند کر' میرا دل پھٹ جائے گا۔ نہ تیری رگوں میں ایسا خون ہے اور نہ تیری ماں کے۔ بس قسمت کا لکھا سمجھ کر تیری ماں نے قبول کیا ہے اور تجھے بھی قبول کرنا پڑے گا۔" نیلوفر اس کا جملہ کاٹتے ہوئے کرب زدہ لہجے میں بولی:

"تیری باتوں سے لگتا ہے کہ تو ہمیشہ سے یہاں کی نہیں' مگر پھر خانم کے پاس ہونے کا جواز کیا ہے اور بیس سال سے اماں' میں یہاں کیوں ہوں؟"

"مجھے نہیں پتہ۔ خدا کے واسطے مجھے تنگ مت کر۔ نیلو فر پھٹ پڑی۔

"اماں! آج خاموش نہ کر' میرے انگ انگ میں اس کی نفرت بھری اور حقارت سے پر نظریں گھسی ہوئی ہیں۔ اس نے مجھے کوٹھے کی گالی دی ہے اور اس نے کہا ہے کہ جا اپنی ماں سے پوچھ کہ میرا باپ کہاں ہے؟ اور اماں اس نے مجھے نہ جانے کیا کچھ کہا ہے' تو بتا میں کیا کروں؟" وہ تڑپ کر تکیئے میں منہ چھپا کر رو دی۔

"جان کر کیا کرے گی؟ اور کیا کوئی تیری بات پر یقین کر لے گا۔ لوگ تو تجھے گندا خون ہی کہیں گے۔" نیلوفرا فسردگی سے بولی۔

"اماں! کم سے کم مجھے تو سکون مل جائے گا۔" وہ بے تابی سے بولی۔

اور نیلوفرا سے سینے سے لگا کر بیس سال پیچھے کے موسموں میں کھو گئی۔

وہ موسم بہار کا خوبصورت ترین دن تھا جب وہ نیلوفرا قبال سے نیلوفر رحمٰن بن کر "خان ولاز" میں آگئی۔ پوری خان فیملی نے دل کے ارمان نکالے ہر طرح کی رسم ہوئی اور اسے ایسا لگا کہ وہ آکاش سے اتر کر پھولوں کے دیس میں آگئی ہو پھولوں سے بھری زمین پر رحمٰن کے سنگ چلنا اسے شروع شروع میں بہت اچھا لگا۔ رحمٰن خان بہت اچھی اور نفیس طبیعت کے مالک تھے ان کا اعلیٰ ذوق ایک اچھے پڑھے لکھے انسان کی غمازی کرتا تھا مگر غصے کے بھی بہت تیز تھے۔ جب کسی بات پر مشتعل ہو جاتے تو پورا گھر آگے پیچھے ہوتا۔ تب کہیں وہ مسکراتے' نیلوفر ان کی پسند تھی ان کے گھر والوں کی پسند تھی وہ تھی بھی تو بہت خوبصورت' کومل سی' نازک نازک' دودھیا رنگت والی۔ رحمٰن اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے...... ان کا بزنس کچھ اس قسم کا تھا کہ سال میں بمشکل ایک دو مہینے وہ پاکستان میں رہتے باقی کے دن دنیا بھر کے بزنس ٹور پر پورے ہو جاتے تھے وہ دو بھائی تھے۔ بڑے بھائی احسان خان پاکستان میں سارا بزنس سنبھالتے تھے۔ شادی شدہ تھے اور علیحدہ رہائش پذیر تھے۔ شادی کے کچھ دنوں بعد بیگم خان کا انتقال ہو گیا۔ گھر میں صرف نیلوفر اکیلی رہ گئی۔ رحمٰن خان اکثر گھر پر نہیں ہوتے تھے۔ ایسے میں سوائے ملازموں کے اور نیلوفر کے گھر میں کوئی نہیں ہوتا تھا...... تنہائی سے وہ سخت گھبراتی تھی رحمٰن کی غیر موجودگی میں بولائی بولائی سی پھرتی تھی۔

اس روز بھی وہ سخت اداس اور پریشان سی ٹی وی لاؤنج میں آگئی رحمٰن آسٹریلیا گئے ہوئے تھے اس نے ٹی وی آن کرنا چاہا مگر ٹی وی نے معذوری ظاہر کر دی۔ سخت غصہ آیا ملازم کو آواز

دے کر کسی ٹی وی مکینک کو بلانے کے لئے کہا اور اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں کرم داد نے اطلاع دی۔

"بیگم صاحبہ! اشتیاق باؤ آگیا ہے۔"

"کون اشتیاق باؤ؟" وہ سلیپر پاؤں میں ڈال کر کمرے سے باہر آگئی۔

"وہ جی ٹی وی مکینک۔" کرم داد نے کہا۔

اچھا تو اسے ٹی وی دکھاؤ۔"

"وہ جی وہ جانتا ہے کیونکہ پہلے بھی کئی بار آیا ہے۔"

کرم داد نے کہا اور کچن کی طرف مڑ گیا اور وہ اچھی طرح تسلی کرنے کی غرض سے خود ٹی وی لاؤنج میں آگئی۔

"السلام علیکم جی۔" اس کے قدموں کی آہٹ پر اس نے نظر اٹھا کر کہا۔ مگر پھر لمحہ بھر کو اس کی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ پلک جھپکنا بھول گئیں۔

"وعلیکم السلام۔" نیلوفر نے اس کی محویت توڑی اور خود بھی اس کے سجیلے بانکے روپ میں محو سی ہو گئی۔ اس کے تو تصور میں بھی نہیں تھا کہ ٹی وی مکینک اتنا خوش شکل اور خوش وضع قطع ہو گا۔ آج تک جتنے مکینک دیکھے تھے وہ ان سب سے منفرد نظر آرہا تھا۔ گرے کلر کی پینٹ شرٹ میں ملبوس نفاست سے بال سجائے' آنکھوں میں جگنوؤں کی سی چمک لئے' لبوں پر مسکراہٹ لئے' وہ ہاتھ میں پیچ کس تھامے کھڑا تھا۔

"آپ نے جب ٹی وی آن کیا تو' کیا تصویر آئی تھی یا نہیں؟" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس پر سے توجہ ہٹاتے ہوئے بولا۔

"آن کرتے وقت یہ بالکل خاموش رہا' کوئی آواز یا تصویر نہیں آئی۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ پھر ٹی وی پر جھک گیا اور وہ نجانے کن خیالوں میں گم' گلے میں پڑی زنجیر سے کھیلنے لگی۔

"آپ جی رحمٰن صاحب کی کیا لگتی ہیں؟" اس نے اس خیالات کا سلسلہ توڑا تو وہ چونک کر بولی:

"بیوی ہوں میں ان کی۔"

"جی۔" وہ حیران سارہ گیا۔

"کیوں، آپ کو اتنی حیرت کیوں ہوئی؟ کیا میں ان کی بیوی نہیں ہو سکتی؟" وہ تشویش بھرے انداز میں مخاطب ہوئی۔

"نہ حیرت ہوئی اور نہ پریشانی صرف افسوس ہوا۔" وہ ایک دم ہی افسردہ سا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے جگنو ماند پڑتے گئے اور مسکراتے لب آپس میں جڑ گئے۔ نیلو فر کو عجیب سا احساس ہوا۔ آہستہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

"کس بات کا افسوس؟"

"کچھ نہیں بیگم صاحب آج ایک اور حسرت ناتمام رہ گئی۔" اس کا لہجہ بے باک تھا مگر پھر بھی وہ الجھ سی گئی وہ اس سے کیا کہہ رہا تھا؟

"کیسی حسرت؟" وہ بھی شاید یہ بھول گئی تھی کہ گھر پر آئے ایک معمولی ٹی وی مکینک سے اس طرح برابر کی سطح پر گفتگو نہیں کرنا چاہیے۔

"او چھوڑیں جی۔ میں اب چلتا ہوں۔ یہ فلائی بیک جلا ہوا ہے ایک دو روز میں نیا لا کر تبدیل کر دوں گا۔" وہ اوزار سمیٹتے ہوئے بولا۔

"ارے نہیں ایک دو روز نہیں، دن تو جیسے تیسے گزر جاتا ہے رات کی تنہائی بہت بے کل کرتی ہے۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"واہ بیگم صاحبہ کیا آپ گھر میں تنہا ہیں کیا رحمٰن صاحب گھر پر نہیں ہوتے؟" وہ تھوڑا تعجب سے بولا۔ نیلو فر کو اس کا انداز نجانے برا کیوں نہیں لگا کسی اجنبی کو اس طرح کی بات کرنے کا کیا حق پہنچتا تھا مگر وہ تو اس کی آنکھوں کے سحر میں کھوئی جا رہی تھی۔

"ایسا ہی ہے دراصل رحمٰن صاحب اکثر بزنس ٹور پر ہوتے ہیں اور تنہائی میرا مقدر بن گئی ہے۔" وہ طویل سانس بھر کے رہ گئی۔

"کمال ہے آپ جیسی صاحب حیثیت تنہائی سے اس قدر خوفزدہ، ہمارا تو تنہائی نے ویسے ہی حلیہ بگاڑا ہوا ہے۔" وہ اپنا سامان سنبھال کر اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے جائیں آپ مگر کل ٹی وی چلنا چاہیے۔" اس نے آہستہ سے کہا اور وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا..... اور اسے نجانے کیوں ایسا لگا کہ وہ گھنٹوں سے مصروف تھی بہت مصروف، جیسے بوریت تو نام کو بھی نہیں ہوئی ایک محفل سی ارد گرد لگی تھی...... ورنہ وہ اس وقت شدید کوفت محسوس کرتی تھی مگر آج دل و دماغ تروتازہ لگ رہے تھے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی محسوس ہو رہی تھیں۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں نیلو فر رحمٰن" ایک معمولی سے ٹی وی مکینک نے تم پر کونسا سحر پھونک دیا ہے جو اس طرح تم نئے زاویئے سے آج کی تنہائی دیکھ رہی ہو کیا تمہیں یہ زیب دیتا ہے کہ تم شادی شدہ ہو کر اپنے شوہر کی محبت میں خیانت کرو۔ بولو؟" دماغ کی سرزنش پر وہ پریشان سی ہو گئی مگر پھر فوراً ہی دل نے وضاحت کی کہ "میں نے کوئی خیانت نہیں کی، کسی سے بات کر لینے میں تو کوئی حرج نہیں، اگر وہ حسین ہے رحمٰن سے زیادہ سمارٹ تو اس میں اس کا کیا قصور؟ اور کسی کو سراہنے کا مقصد یہ تو نہیں کہ وہ دل میں بسا لیا جائے۔ اس نے صرف میری بوریت اور تنہائی کی دیوار میں ہلکا سا شگاف ڈالا ہے۔ رحمٰن نے مجھے اس محل میں سونے کے پنجرے میں قید کر ڈالا ہے۔ دو ماہ ہوئے شادی کو ایک دن بھی انہوں نے میرے ساتھ نہیں گزارا۔ میرا دنیا میں کوئی اور نہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں یہ تنہائی کا عذاب کب تک برداشت کروں گی؟ میری ہر صبح کا نکھار زرد دوپہر میں بدل جاتا ہے اور میری ہر سلونی شام کا روپ تنہائی کی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ میری سج دھج دیکھنے والا مجھ سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ ایسے میں، میں کیا کروں، کیسے صبر کروں؟" وہ سسک اٹھی۔

☆ ☆ ☆ ☆

شام کو سو کر اٹھی تو کرم داد نے اطلاع دی کہ اشتیاق باؤ آ گیا ہے۔ وہ فوراً بولی۔

"اچھا۔ اسے کام کرنے دو اور اچھی سی چائے بنا کر پہنچاؤ میں کپڑے تبدیل کر کے آتی ہوں۔" کرم داد گردن ہلا کر چلا گیا اور اس نے جلدی سے نارنجی، سیاہ سیاہ بارڈر والی ساڑھی نکالی اور نہانے کے لئے باتھ روم میں گھس گئی۔

بال برش کرتے وقت وہ ہلکے ہلکے گنگنا رہی تھی۔ لپ اسٹک کا شیڈ درست کر کے اس نے گھوم کر اپنا جائزہ لیا تو ششدر رہ گئی...... رحمٰن بریف کیس پکڑے بڑی محویت سے دروازے کے بیچ میں کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ اسے دیکھنے پر وہ قریب چلے آئے۔

"نوازش کرم، شکریہ مہربانی، حضور اس خوبصورت استقبال پر ہم مشکور ہیں۔" انہوں نے سرشاری میں اسے بانہوں میں جکڑ لیا اور وہ دل کے بے ہنگم شور کی وجہ سے پسینے میں نہا گئی۔

"ارے خیریت، ناراض ہو، یا پھر ہمیں دیکھ کر یقین نہیں آرہا۔" انہوں نے اس کے رخسار چھوتے ہوئے کہا۔

"نہ، نہیں ایسی کوئی بات نہیں آپ کے اچانک آنے پر تھوڑی سی حیرانی ہوئی ہے۔" وہ بات بناتے ہوئے بولی۔

"کیا تمہیں شدت سے انتظار تھا؟" انہوں نے شوخ نظروں سے اس کی سجاوٹ کا جائزہ لیا۔

"کیا اچھا نہیں کیا میں نے؟" وہ آہستہ سے بولی۔

"بہت اچھا کیا ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ اسی سج دھج کے ساتھ ہمارا انتظار کیا کرو۔" وہ شرارت سے چھیڑتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئے اور وہ خاموش سی سوچ میں گھر گئی........

تھوڑی دیر میں جب وہ باہر آئے تو اسے وہیں اسی طرح کھڑا دیکھ کر حیرت سے بولے:

"کیا بات ہے جان؟"

"کچھ نہیں آپ کو میرا ذرا خیال نہیں، ہروقت مصروفیت۔" وہ خواہ مخواہ رونے لگی۔

"ارے ارے۔ میری زندگی۔ یہ بزنس کے جھمیلے ہیں بھلا کیا کریں مصروفیت تو ہوتی ہے اور باہر کے معمولات کیسے سمجھائیں آپ کو؟" انہوں نے اسے چمکار کر سینے سے لگا لیا۔

"کبھی تو میرے پاس رہیں۔" وہ منمنائی۔

"او کے کیوں نہیں اب تم جلدی سے چائے پلواؤ، بہت تھکاوٹ ہے۔" وہ بستر پر دراز ہو گئے۔ وہ جانا ہی چاہتی تھی کہ کرم داد آ گیا۔

"بیگم صاحبہ! ٹی وی ٹھیک ہو گیا ہے وہ آپ کو بلا رہا ہے۔"

"ارے ان کو بلانے کی کیا ضرورت ہے اسے جتنے پیسے چاہئیں دے دو اور ہاں اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔" اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی رحمٰن نے کچھ پیسے اٹھا کر کرم داد کو دیئے اور چلتا کر دیا اور وہ نجانے کیوں ایک دم ہی اداس سی ہو گئی..... مگر پھر رحمٰن کے شریر اشارے پر مسکرا کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

رحمٰن آفس جانے کے لئے جونہی تیار ہوئے اس نے دھیرے سے کہا۔

"کچھ شاپنگ کرنی ہے آپ ساتھ چلیں۔"

"کیا؟ اتنے معمولی سے کام کے لئے میں نہایت قیمتی وقت ضائع کروں، ہرگز نہیں، ڈرائیور گاڑی لے آئے گا تم خود چلی جاؤ، یا پھر بھابی کو ہمراہ لیتی جانا۔" وہ ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے بولے۔ وہ خاموش ہو گئی۔ ان کے جانے کے بعد وہ تیار ہوئی ڈرائیور کے آتے ہی وہ بازار چلی گئی۔ واپسی پر کافی دیر ہو گئی وہ گھر پہنچی تو نہایت تیزی سے کچن میں آ گئی۔

"کرم داد کیا کھانا تیار کیا ہے؟ صاحب کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"جی چکن مصالحہ بنایا ہے اور قیمہ مٹر، لیکن صاحب تو آ کر چلے گئے۔"

"کہاں چلے گئے؟" اسے شاک لگا۔

"کہہ رہے تھے کہ فیکٹری کے لئے نئی مشینیں آئی ہیں اسی سلسلے میں کراچی جانا ہے۔" کرم داد نے وضاحت سے کہا۔

"مگر ایسی بھی کیا ایمرجنسی تھی کہ مجھے ملنے کا وقت بھی نہیں تھا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ دل میں ڈھیر سارا احساس محرومی پیدا ہو گیا، خود بخود پلکیں بھیگ گئیں۔ "میں تمہارے اس محل میں صرف ایک قیمتی ڈیکوریشن پیس سے زیادہ اہم نہیں ہوں اس لئے تم مجھے بھلا کیوں اہمیت دو، تمہارے نزدیک تمہارا بزنس سب کچھ ہے۔ پیسے کی بھاری سل سے میری محبت اور احساس کا نازک آبگینہ اگر ٹکرائے گا تو چکنا چور ہو جائے گا۔ یہ میں اب سمجھنے لگی ہوں۔" اس نے پلو سے رگڑ کر پلکیں صاف کیں اور بے دم سی بستر پر گر سی گئی۔

شام ڈھلے دروازے کی دستک نے اسے جگایا۔ دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ باہر کرم داد کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"جی وہ اشتیاق باؤ آیا ہے اور۔"

"اچھا لیکن کیوں؟" اس نے چونک کر خود سے پوچھا تو جواب ملا کہ "تم اس کی منتظر جو تھیں اس لئے۔" کرم داد چلا گیا اور وہ سوچ میں گھر گئی۔ پھر نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی ڈرائنگ

روم کی طرف آ گئی .... اس نے صوفے سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ سفید شلوار میں سلیقے سے بال سنوارے وہ اس کے روبرو تھا۔ وہ ٹھٹھک سی گئی۔

"آپ شاید حیران ہیں کہ میں کس لئے آیا ہوں؟" وہ متانت سے بولا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"دراصل تیار ہو کر جیسے ہی باہر نکلا قدم آپ کے گھر کی طرف بڑھنے لگے وجہ میں نہیں جانتا۔" اس کے اس بے باکانہ انداز پر وہ حیرت زدہ سی صوفے پر ٹک گئی۔

"حیران ہوں ایسا کیوں ہوا؟"

"آپ ناراض تو نہیں میری اس جسارت پر؟" وہ ہلکے سے مسکرا کر بولا۔

"آں' ہاں۔ نہیں' لیکن میں اس وقت بہت ڈسٹرب ہوں۔" وہ کچھ بیزار سی نظر آ رہی تھی۔

"یہی تو وجہ ہے کہ میں بھی بہت ڈسٹرب ہوں۔" وہ دھیمے سے بولا۔

"آپ' خیر مجھے کیا۔" وہ اس وقت کوئی بات کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

"آپ اس قدر پریشان اور اداس کیوں رہتی ہیں؟" اس نے اچانک سوال کیا۔

"اس کہرزدہ زندگی میں اداسی اور پریشانی کے سوا ہے ہی کیا؟" صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر وہ کچھ سکون محسوس کرنے لگی۔

"کیا یہ شادی آپ کی پسند کی ہے؟" وہ نجانے کیوں اتنی بے تکلفی پر اتر آیا تھا کہ وہ ششدر سی چند لمحے اسے دیکھتی رہی اور پھر پلکیں موند لیں۔ "کیا بتاؤں تمہیں......؟"

نہیں' رحمٰن صاحب اور میری ماسی کی جو اب اس دنیا میں نہیں' ویسے بھی غریب اور بے سہارا لڑکیاں کب پسند اور ناپسند کے چکر میں پڑتی ہیں۔ ڈھیر ساری لڑکیوں کی طرح میں ان دیکھے مجازی خدا کی منتظر تھی اور ماسی اپنی بیماری سے بے زار تھی اور میری طرف سے فکر مند بھی۔ اس نے اپنی حیثیت کے مطابق مجھے پالا پوسا' پڑھایا اور کیا کرتی۔ رحمٰن نے ایک روز ماسی کے ساتھ اپنے گھر میں دیکھا اور نجانے کیوں اتنا بڑا فیصلہ کر لیا؟"

"کتنے خوش نصیب ہیں رحمٰن صاحب جسے چاہا اسے پا لیا محبت کے پھول ہر شاخ پر تھوڑا کھلتے ہیں۔" سارے جہاں کا درد اس کے لہجے میں سمٹ آیا اور اس وقت نیلوفر کو وہ دنیا بھر کا

مظلوم شخص لگا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں ایک یاسیت اور بے چینی نظر آئی وہ خود بھی افسردہ سی ہو گئی۔

"مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں آپ سے کس تعلق کی وجہ سے یہ سب باتیں کر رہی ہوں؟"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میرے تصور میں آنے والا ہر چہرہ آپ ہی کا تھا اور قدرت نے حقیقت میں مجھے اس کے روبرو کر دیا۔" وہ دور کہیں نکل گیا۔

"آپ کو مجھ سے اس طرح بے تکلف نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے تنبیہہ کی۔

"جانتا ہوں مسز رحمٰن لیکن اطمینان رکھیں میری ایسی کوئی خواہش نہیں جس سے آپ کی پاکیزہ زندگی پر حرف آئے مجھے آپ بہت اچھی لگی ہیں بہت دلکش۔ آپ سے مل کر میری تنہائی کے پھول مہک اٹھے ہیں' دل چاہتا ہے کہ میں روز آپ سے ملوں' ہر لمحہ' ہر پل ملوں اور آپ پر اتنا اعتماد کروں کہ زندگی بھر کسی کی کمی محسوس نہ ہو کیا آپ میرے اس پاکیزہ جذبے کی قدر کریں گی؟" وہ ملتجی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور نیلوفر کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ دوسری ملاقات میں کیا کوئی اس طرح کے جذبات رکھ سکتا ہے اور کیا یہ مناسب ہے کہ ایک اجنبی نوجوان اس طرح اس کی زندگی میں ہلچل مچا دے۔ "میں شاید ایسا تو نہیں چاہتی یہ ایسا کیوں چاہتا ہے؟ اور رحمٰن کو اگر پتہ چل جائے تو...... تو...... نہیں وہ نجانے کیا کر دیں۔"

"اشتیاق صاحب آپ شاید ذہنی طور پر پریشان ہیں۔" وہ ایک دم کرخت ہو گئی۔

"آپ کہہ سکتی ہیں' آپ چاہیں تو میری اس گستاخی پر ملازموں سے دھکے دے کر باہر نکلوا سکتی ہیں مگر میں نے صرف دوستی کی خواہش کی ہے کیونکہ ایک جانا پہچانا جذبہ مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر چکا ہے اگر آپ ملنا نہ بھی چاہیں تو میں گیٹ سے لوٹ جاؤں گا۔" وہ سخت مضطرب سی ہو گئی۔ "بھلا کیا کروں؟ میرا دل اتنے اچھے شخص کو چھوڑنا نہیں چاہتا پھر کسی سے ملنے میں حرج ہی کیا ہے شاید میں بھی تو کل سے اس کی منتظر تھی۔" اس نے سوچا اور مطمئن ہو گئی۔

"اشتیاق صاحب! میں ڈرتی ہوں رحمٰن اس بات پر کبھی خوش نہیں ہوں گے۔" وہ خوفزدہ سی تھی۔

"ٹھیک ہے میں آپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتا۔" اس نے جانے کے لئے قدم اٹھائے تو وہ سامنے آگئی۔

"جسے دیکھ کر دل دھڑکے اور نظر میں چمک آجائے اسے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ قسمت نے تمہیں میری زندگی میں داخل کر ہی دیا ہے تو میں خود سرکش جذبے کے آگے مجبور ہوں۔" وہ طمانیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولی اور وہ اس کے چہرے کے دلفریب رنگوں میں کھو سا گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆

رات گئے رحمٰن لوٹے تھے وہ کسل مندی سے بستر پر پڑی رہی نہ اسے ان کے آنے کی خوشی ہوئی تھی اور نہ احساس۔ وہ بھی تھکاوٹ کے باعث کپڑے تبدیل کر کے آئے اور بیڈ پر لیٹتے ہی لائٹ آف کر دی۔ نہ اسے کچھ کہا اور نہ سنا ان کی مصروفیت اتنا موقع ہی کب دیتی تھی۔ وہ چپکے چپکے خود ہی ان کے گرم جذبوں کی حدت محسوس کرتے کرتے سوگئی۔

صبح رحمٰن صاحب بیدار ہوئے تو بولے:

"سوری ڈیئر رات میں تھکا ہوا تھا۔" انہوں نے معذرت کی وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ "مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں تمہیں اتنا ٹائم نہیں دے سکتا۔ جتنی ایک بیوی خواہش کرتی ہے لیکن بزنس کے لئے فل ٹائم توجہ چاہیے' مصروفیت چاہیے۔" انہوں نے خود ہی جواز پیش کیا تو وہ سپاٹ سی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی کوئی بات نہیں کی۔

"تم سناؤ کیا حال ہے؟" انہوں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ سٹپٹا سی گئی۔

"بتایا نہیں تم نے؟" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

"ک' ک' کچھ نہیں' تنہائی میں جو کسی کا حال ہوتا ہے وہی میرا سمجھ لیں۔"

"سمجھتا ہوں جان' تھوڑے دن صبر کر لو میرے بھتیجے جیسے ہی جوان ہوں گے تو مجھے اور بھائی کو ریسٹ ملے گا۔" وہ بات مزاح میں اڑا کر باتھ روم میں گھس گئے اور وہ پھر خلاؤں میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

"نیلو' یاد آیا تھوڑا سا وقت ملا تھا تو میں نے تمہارے لئے کندن کا سیٹ خرید لیا تھا' بریف کیس سے نکال لو۔" رحمٰن بال تولئے سے خشک کرتے ہوئے بولے تو وہ اٹھ کر بریف کیس سے سیٹ نکال کر دیکھنے لگی پھر خاموشی سے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر ناشتے کی تیاری کے سلسلے میں کچن میں

چلی گئی۔ رحمٰن تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچ گئے۔ کرم داد نے موقع غنیمت جان کر درخواست پیش کر دی۔

"صاحب جی' دو ماہ کی چھٹی چاہئے۔ مجھے گاؤں جانا ہے۔"

"کیا دو ماہ کی؟"

"دے دیجئے۔" نیلوفر نے حمایت کی۔

"مگر تم اکیلی ہوتی ہو؟" رحمٰن بولے۔

"کوئی بات نہیں' چوکیدار تو ہے اور پھر کام ہی کتنا ہوتا ہے میں کر لوں گی۔" اس نے کہا تو رحمٰن صاحب نے شانے اچکا کر چھٹی منظور کر لی۔ اس نے چور نظروں سے رحمٰن کی طرف دیکھا اور اطمینان سے ناشتے میں مصروف ہو گئی۔

آفس جاتے ہوئے رحمٰن نے اسے کھانے پر انتظار نہ کرنے کا کہا اور چلے گئے۔ کرم داد بھی تھوڑی دیر میں چلا گیا۔ گھر میں سناٹا اور بھی بڑھ گیا۔ سارے کام سمیٹ کر بھی وقت گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ رسالے پڑھ ڈالے' وی سی آر لگا کر فلم بھی دیکھ لی مگر جس انداز سے تنہائی وہ محسوس کرتی تھی اس کا انداز ہی مختلف تھا۔

بڑی مشکل سے چار بجے اس نے نہا کر پنک ساڑھی پر رحمٰن کا لایا ہوا سیٹ پہنا اور بڑی توجہ اور مہارت سے میک اپ کر کے وہ ڈری ڈری سی اور بے چین' بے تاب سی اشتیاق کی راہ دیکھنے لگی کہ دل میں ایک خیال نے سر اٹھایا کیا واقعی مجھے اشتیاق سے محبت ہو گئی ہے؟ کیا اس کی طلسماتی شخصیت نے مجھ پر جادو کر دیا ہے؟ اور میرے اندر جو تلاطم پیدا ہو چکا ہے اس کا انجام کیا ہو گا؟" نیلوفر اس کا انجام اب کچھ بھی ہو بہرکیف تم نے اسے اور اس نے تمہیں پسند کر لیا ہے۔ تم شادی شدہ ضرور ہو مگر شادی انسان کی تکمیل تو نہیں ہوتی۔ تمہیں تنہائی بانٹنے کے لئے کوئی سچا اور مخلص ساتھی چاہیے تھا رحمٰن تمہارا شوہر ضرور ہے مگر اسے تمہارے احساسات اور جذبات کا کبھی خیال نہیں آیا۔ تم متلاشی تھیں اشتیاق کی۔ اس کی نظروں میں تمہارے لئے جو جوت جگمگا رہی ہے کیا وہ تمہیں نظر نہیں آئی؟ آئی ہے' اچھی طرح آئی ہے۔" وہ خود کلامی کی فضا میں کچھ دیر اور رہتی اگر اشتیاق کمرے میں نہ آچکا ہوتا۔

"کیا حال ہے؟" وہ مخصوص دھیمے انداز میں مسکرایا۔

"ٹھیک ہے بیٹھو۔" وہ جواب دے کر دروازے کی طرف گئی اور چٹخنی چڑھادی۔

"یہ کیا دروازہ بند کیوں کر دیا؟" اشتیاق نے حیرانی سے پوچھا۔

"رحمٰن کسی بھی وقت آسکتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"تو پھر کیا تم مجھے رحمٰن سے چھپاؤ گی۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"ہاں' اس لئے کہ رحمٰن ایسا کبھی پسند نہیں کریں گے بلکہ نجانے وہ کیا کر دیں۔ تم کبھی بھی رحمٰن کے سامنے نہیں آؤ گے۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

"لیکن بھلا کیسے؟" اسے تعجب ہو رہا تھا۔

"یہ کھڑکی دیکھ رہے ہو نا' اس کے بالکل سامنے عقبی گیٹ ہے تم وہاں سے چھلانگ مار کے آیا کرو گے اس وقت جب اس کھڑکی پر سیاہ پردہ لٹک رہا ہو اگر سیاہ پردہ نہ ہو تو سمجھ لینا کہ رحمٰن یا کوئی اور گھر میں موجود ہے۔"

"کیا' کیا' یہ بیوقوفانہ بات ہے' بھئی میں پڑھا لکھا ٹی وی مکینک ہوں کوئی ایسا ویسا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ میرے دل میں تمہارے لئے عقیدت ہے تم سے کوئی غلط سلط تعلق تو نہیں جو چوروں کی طرح آؤں۔" وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"پلیز اشتیاق دوست بنے ہو تو میرا احساس کرو' میں مجبور ہوں۔"

"لیکن تم خود ہی سوچو یہ کتنا غلط انداز ہے اس طرح اگر کبھی رحمٰن صاحب نے دیکھ لیا تو؟" وہ سمجھانے لگا۔

"کچھ نہیں ہوتا لیکن ویسے تم اطمینان رکھو رحمٰن بہت کم گھر میں ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بابا پہلی بار کوئی دوست بنایا ہے۔" وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا تو وہ ہنس دی۔

پھر بہت دیر دونوں گپ شپ کرتے رہے۔ اشتیاق اپنی زندگی کے بارے میں بتاتا رہا اور وہ دلچسپی سے سنتی رہی۔ وقت کے گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا اشتیاق کے جانے کے بعد وہ مسرور سی رات کے کھانے کی تیاری کے لئے کچن میں آگئی۔

☆ ☆ ☆ ☆

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے وہ روز بروز اشتیاق کی محبت میں ڈوبتی چلی گئی۔ اس کی زندگی سے بھرپور باتوں نے اسے اور رحمٰن کو سوائے واجبی سے رشتے کے

کوئی اور احساس ہونے ہی نہ دیا وہ ہر وقت مسرور رہتی تھی۔ بھول کر بھی رحمٰن سے کسی قسم کا شکوہ نہیں کرتی تھی۔ دن بھر ڈھیروں خوبصورت باتیں اکٹھا کرتی اور سیاہ پردہ ڈالتے ہی اس کی بے چینی ختم ہو جاتی۔ اشتیاق کو دیکھ کر وہ ہر غم سے بیگانہ ہو جاتی تھی۔ رحمٰن نے کبھی اس سے کوئی بات نہیں کی تھی اب تک سارا ڈرامہ کامیابی سے چل رہا تھا۔

رحمٰن ایک ہفتے کے لئے چین سے لوٹے تھے اس کی طبیعت رات سے خراب تھی پہلے کرم داد کی غیر موجودگی کی وجہ سے تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی مگر تین روز ہوئے کرم داد آچکا تھا وہ مکمل ریسٹ میں تھی۔ صبح اس سے اٹھا ہی نہیں گیا سر چکرا رہا تھا۔ رحمٰن خوش دلی سے اسے لٹا کر اس کی پیشانی چوم کر بولے۔

"جان! آرام کرو۔ شام کو ڈاکٹر سے ٹائم لے کر چیک اپ کے لئے لے چلوں گا۔" اتنی مٹھاس اور محبت تھی ان کے لہجے میں کہ وہ دل ہی دل میں نادم سی ہو گئی۔

سارا دن وہ بستر میں پڑی رہی آج اسے اندازہ تھا کہ رحمٰن کسی وقت بھی گھر آسکتے ہیں۔ اس لئے نہ اس نے اشتیاق کے لئے پردے کی تبدیلی ضروری سمجھی اور نہ کوئی خاص تیاری کی۔ رحمٰن کی گاڑی کی آواز پر وہ اٹھی اور باتھ روم میں گھس گئی۔ رحمٰن اسے کمرے میں نہ پاکر کرم داد سے چائے کا کہنے کے لئے کچن میں چلے گئے۔ وہ نہا کر تیار ہو کر وہیں ان کا انتظار کرنے لگی مگر رحمٰن کافی دیر اندر نہ آئے تو وہ خود ساڑھی سنبھالتی ہوئی کچن کی طرف آگئی اسے دیکھ کر رحمٰن اور کرم داد کوئی بات کرتے کرتے چپ ہو گئے۔ کرم داد تیزی سے چینی کپ میں ہلانے لگا اور رحمٰن کچھ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کمرے کی طرف چلے گئے۔ وہ خود چائے لے کر کمرے میں پہنچی تو رحمٰن کھڑکی میں کھڑے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کپ خاموشی سے اس نے آگے بڑھایا تو وہ بولے:

"رات کے کھانے پر خوب اہتمام کرو' مہمان آرہا ہے۔"

"جی بہتر۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"ٹھیک ہے جاؤ چھ بج رہے ہیں تیاری کرتے کرتے آٹھ بج جائیں گے۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولے تو وہ کمرے سے باہر آگئی مگر دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ کمرے سے باہر کھڑے ہو کر پردے کی اوٹ سے دیکھا رحمٰن نے کالا پردہ کھڑکی پر پھیلا دیا تھا۔ وہ

زرد پڑگئی' آواز حلق میں اٹک گئی' توکیا رحمٰن کو علم ہوگیا ہے؟ اف میرے خدا اب کیا ہو گا؟ رحمٰن تو اشتیاق کو جان سے مار دیں گے میں کیا کروں؟ کیسے اشتیاق کو اطلاع دوں۔" خوف اور بے چارگی سے اس کے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے ایک ہلکی سی لرزش بہت بڑے نقصان کی شکل میں سامنے آنے والی تھی وہ بمشکل ہانپتی کانپتی کچن میں آکر کرسی پر گر گئی...... وقت گزر رہا تھا اور اس کی ساری توجہ کمرے کی طرف تھی۔ برائے نام وہ کھانا تیار کرا رہی تھی وگرنہ دھیان تو کسی اور طرف تھا۔ ہلکی سی آہٹ پر بھی دل اچھل کر حلق میں آجاتا تھا۔ عجیب چوروں کا سا حال تھا' کرم داد بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے اپنی نظروں سے دور کرنے کے لئے اس نے کہا۔

"کرم داد' ڈائننگ ٹیبل کی اچھی طرح صفائی کرو۔"

"جی بہتر۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور اس نے کفگیر اٹھایا ہی تھا چاول دیکھنے کے لئے کہ ریوالور کے دو فائر اسے سرتاپا لرزا گئے۔ خوف سے چیختی چلاتی کمرے کی طرف بھاگی دروازہ اندر سے بند تھا۔ رحمٰن کی غصیلی آواز گونج رہی تھی۔

"میں اپنی بیوی کو بھی تمہارے ساتھ موت کی نیند سلاؤں گا۔" اس کا مطلب تھا کہ رحمٰن نے اشتیاق کو دھوکے سے بلا کر مار ڈالا تھا۔ وہ نیم پاگلوں کی طرح موت کے خوف سے سرپٹ بھاگ پڑی۔ اردگرد کے ہر خوف سے عاری نہ سمت کا تعین اور نہ منزل کا نشان' بس رحمٰن کی خونخوار آواز کے خوف نے اس کے حواس چھین لئے تھے وہ اس وقت یہ بھول چکی تھی کہ اس کا عزیز غمگسار دوست مرچکا ہے اور وہ اس کے لئے رونے پیٹنے کی بجائے بھاگی جارہی ہے۔ مگر یہ موت بھی بڑی ظالم چیز ہے اس کا تو احساس بھی انسان کو ہر بات سے بیگانہ بنا دیتا ہے' بھاگتی گئی...... بھاگتی گئی' وحشت زدہ سی لوگوں کو حیران پریشان کرتی ہوئی نجانے کہاں جارہی تھی...... ہوش ہی نہ رہا کہاں گری؟ کہاں شب گزری اور کہاں آنکھ کھلی......؟

☆ ☆ ☆ ☆

بستر کے اطراف میں مسکراتے چہرے اسے مسرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ کون تھے؟ اور وہ کیسے ان کے پاس آگئی؟ یہ جاننے کے لئے وہ بے چین تھی رحمٰن کا خوف اسے یہاں بھی محسوس ہو رہا تھا اس نے گھبرا کر ہر طرف دیکھا۔

"کیا نام ہے میری حور پری کا......؟ بھاری بھرکم بنی سنوری عورت نے اس کے سرہانے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"خانم اب تو جو تم نام رکھو گی وہی نام ہو گا۔" ایک مکروہ شکل مرد نے دانت نکالتے ہوئے کہا تو اسے بہت برا لگا۔

"کون ہیں آپ سب اور میں؟"

"ہم تمہارے اپنے ہیں اور تم اپنوں میں ہو۔" سرہانے بیٹھی عورت نے اس کی بلائیں لیں۔

"نہیں' نہیں یہ تو مجھے وہ جگہ لگتی ہے جو......؟"

"ہاں' ہاں' بڑی سمجھ دار ہے ہماری لکشمی۔" ایک دوسرا ادھیڑ عمر شخص بولا۔

"میرا نام لکشمی نہیں' نیلوفر ہے' نیلوفر رحمٰن اور میں؟" وہ ہکلائی۔

"بس' بس اور کچھ مت بتاؤ۔ نیلوفر ہی رہے گا تمہارا نام۔" خانم نے اٹھلا کر کہا تو وہ چونک سی ہو کر اٹھنے لگی مگر سر چکرا کر رہ گیا بے اختیار ہی سر تکیئے پر ڈھلک گیا۔

"آرام کرو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی' ڈاکٹر کو بلا کر دکھاتی ہوں۔" خانم اٹھ کر جانے لگی۔

"لیکن تم لوگ کیوں مجھے بچالائے ہو؟" وہ سسکی۔

"لڑکی! پاگل پنے کی باتیں مت کرو یہاں تمہاری تقدیر لے آئی ہے اور خانم بائی کے کوٹھے آنے کے بعد جانے کا راستہ نہیں ملتا۔" خانم بائی نے کرخت لہجے میں پہلی بار اپنی حیثیت واضح کی ہ سناٹے میں آگئی...... بھاڑ سے نکل کر تنور میں آگری تھی۔ موت کے خوف سے بچ کر جہنم آگئی تھی۔ چیخیں اس کے اندر بلند ہونے لگیں۔" یہ کیا ہو گیا نیلوفر کس جرم کی سزا میں خدا نے ن دکھلایا ہے ایک چھوٹی سی بھول اور لرزش نے' تحقیر اور ذلت کے کس دوراہے پر لاکھڑا کیا نہ پیچھے جاسکتی ہوں اور نہ آگے اس دلدل میں تو میری سانس ہی گھٹ جائے گی۔ رحمٰن مجھے دو' میری خطا معاف کر دو' رحمٰن خدا کے واسطے آؤ اور مجھے ان سفاکوں کے درمیان سے نکال جاؤ۔ اف میرے خدا میں کیا کروں؟" بے شمار چیخیں اس کے حلق میں دم توڑ گئیں۔ روتے تے بے دم سی ہوگئی۔

"آنکھ اٹھا کر دیکھا ایک معصوم پیاری سی لڑکی' سوچ کی تصویر بنی اس کے قریب کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں برسوں کا انتظار چھپا تھا۔ اس کے لب شکایتی انداز میں نیم وا سے ہو گئے تھے۔ نیلوفر نے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں اور پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

"ایک پہیلی۔" مختصراً جواب ملا۔

"کیا مطلب۔" وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تمہاری طرح بدنصیب ہوں۔"

"یہ تمہارے کون ہیں؟"

"سوداگر۔"

"اور تم کیا یہاں؟"

"ناچتی ہوں' گاتی ہوں روز جیتی ہوں روز مرتی ہوں۔ ستارہ بائی نام ہے میرا۔" طویل سانس بھر کے نہایت سنجیدگی سے اس نے بتایا۔ وہ مزید فکر مند ہو گئی۔

"تمہیں کہاں سے لائے تھے؟"

"بدنصیب رہ گزاروں سے۔ مت پوچھو ماضی کے عذاب' اب کا حال تمہارے سامنے ہے۔ افسوس اب تو تم ایسی ہر نئی آنے والی پر ہوتا ہے۔" ستارہ کی آنکھوں سے مینہ برسنے لگا' وہ بھی وحشت زدہ سی رونے لگی۔

"چپ کرو اگر ان لوگوں نے سن لیا تو بڑی مشکل آ جائے گی۔" ستارہ نے پلو سے اس کی آنکھیں صاف کیں...... قدموں کی آواز پر ستارہ سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ خانم بائی ڈاکٹر کے ہمراہ آ چکی تھیں...... نیلوفر کی جان سمٹ کر لبوں پر آ گئی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب یہ ہماری پیاری بیٹی ہے اس کا علاج فوری طور پر کرو۔" خانم مکاری سے بولی تو ستارہ کی آنکھوں میں نفرت سمٹ آئی...... ڈاکٹر نے اسے اچھی طرح چیک کرنے کے بعد چونک کر کہا۔

"یہ ماں بننے والی ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔" نیلوفر کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو' شدت غم سے اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ کتنی بڑی خوشخبری کہاں آ کر سنی تھی۔ اگر پہلے سے جانتی تو رحمن

ا اس کا واسطہ دے کر جان کی معافی مانگ لیتی۔ مگر اب' اب...... کیا میرا بچہ بھی اپنے باپ کو نہیں سکے گا" وہ درد سے آنکھیں موند کر لیٹ گئی......

"ستارہ اسے دودھ گرم کر کے دو اور پورا خیال رکھنا۔" خانم نے تحکم سے کہا اور ڈاکٹر کو اتھ لئے باہر چلی گئی۔

"ستارہ' ستارہ' یہ کیا ہو گیا' مجھے یہاں سے نکالو' میں ایسی ویسی نہیں' میں اپنے شوہر کے س جانا چاہتی ہوں۔ رحمٰن کے پاس۔" وہ اس کی بانہوں میں جھول گئی۔

"پگلی' مجھے آزمائش میں مت ڈالو۔ یہ خانم وہ جلاد ہے جو ہمارے ٹکڑے کرا دے گی۔ خدا ے تیرا شوہر تجھے تلاش کر لے مگر یہ تو بتا کہ تو کس طرح ان کے ہاتھ لگی؟" ستارہ نے آہستہ سے ھا اور اس نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی پوری کہانی سنا ڈالی۔ زندگی عجب موڑ پر آ چکی تھی وہ نہیں جانتی لہ اب کیا کرے۔ بس ایسا لگتا تھا کہ جس قفس کا انتخاب اس نے خود کیا تھا یہیں عمر کے باقی دن گزارنے ہیں۔ روز مرنا ہے اور روز جینا ہے۔ عزت کا مہین سا پیرہن اتار کر تار تار وجود ساتھ ریشمی پردوں کے پیچھے گھنگھروؤں کی جھنک میں زندگی کی شام ہو جائے گی اور کوئی نام کا نام نہ ہو گا اور کوئی شناخت نہ ہو گی ماضی اس سے جدا ہو چکا تھا وہ حال کے لمحے میں مقید ہو ی۔ ایسے لمحے میں جہاں آ کر ماضی اور مستقبل کا سنگم ہوتا ہے' ماضی اس کا گمنام ہو چکا تھا اور ل داغ دار...... ذلت کی جس دلدل میں وہ پاؤں رکھ چکی تھی اس سے باہر نکلنا مشکل ہی ممکن بھی تھا۔ ویسے بھی اس کا تھا ہی کون سوائے رحمٰن کے لیکن رحمٰن تمہیں تو خود میں نے دیا ہے۔ تم مجھے کیوں چاہو گے؟ کیوں تلاش کرو گے؟ وہ کپکپاتے لبوں کو بری طرح کاٹتے خود سے گلہ کرنے لگی...... اس کے سامنے آنے والے ننھے پھول کا بھی مسئلہ تھا...... اس ت وہ بھی قصوروار ہو گیا تھا......"اف میرے خدا یہ میں نے کیا' کیا؟ میرے چھوٹے سے نی بڑی سزا۔" وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔

یکن یہاں اس کا تڑپنا اور سسکنا فضول تھا۔ خانم اور خانم کا کوٹھا ہر احساس اور جذبے سے جو اس میں ایک بار آ گیا' حنوط شدہ ہو گیا...... خانم کی اپنی یہی حقیقت تھی۔ کبھی وہ خود تھی۔ اب نچاتی تھی' گانے پر مجبور کرتی تھی...... مگر کسی پر رحم نہیں کھاتی تھی کیونکہ اس انے رحم نہیں کھایا تھا...... لیکن نیلوفر تو پھر بھی خوش قسمت تھی کہ خانم کو اس کی طبیعت

اور کوکھ میں پلنے والے بچے کا کافی خیال تھا وہ خاصی نرمی اور رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ فی الحال اسے تنگ اور بیزار کرنے کا خیال بھی نہیں تھا...... بلکہ ہر طرح اس کی دلجوئی میں مصروف تھیں...... مگر وہ تو زندہ لاش کی مانند اس اجنبی اور گھناؤنے ماحول میں سلگ رہی تھی' تڑپ رہی تھی۔ نجانے اسے ابھی کیا کچھ دیکھنا تھا...... کچھ تو اسے صبر آ گیا تھا' یا پھر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ ستارہ نے اسے سمجھا بجھا دیا تھا اور وہ کافی حد تک سمجھوتہ کر چکی تھی۔

دن پر لگا کر اڑتے چلے گئے۔ ایک اداس شام اس نے امتثال کو جنم دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ خانم کی چمک دار نگاہیں مزید چمک اٹھیں اور اس کا کلیجہ جیسے پھٹ سا گیا۔ وہ بہت روئی' اسے سینے سے لگا کر بھینچ بھینچ کر روئی۔

"مجھے معاف کر دینا میری زندگی میری وجہ سے تمہارا وجود اس گندے ماحول میں آیا ہے جہاں کوئی تمیز اور تفریق نہیں۔ تمہیں میرے ساتھ شاید ساری زندگی یہ زہر پینا ہے۔" اس کو تسلی دینے کے لئے صرف ستارہ رہ گئی تھی جب کہ ننھے وجود کو تو اس کی بانہوں سے آزاد کرا کے خانم کب کا لے جا چکی تھیں...... وہ ستارہ کے کندھے پر سر رکھ کر بے حال سی ہو گئی۔

پھر جس انداز سے خانم نے چاہا اسے ڈھال لیا۔ اس کا وجود بکھر چکا تھا...... گانا اس کی مجبوری تھی لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکی۔ اس کی سخت اور غصیلی باتوں پر خانم نے اسے مجبور بھی نہیں کیا...... یا پھر خانم کے سامنے ننھی امتثال کا مستقبل روشن تھا...... اس لئے نیلوفر انہیں خاصی عزیز تھی۔ مگر وہ خوفزدہ تھی اپنی بیٹی کی طرف سے رو رو کر خدا کے حضور اس کی ناموس اور بہتری کے لئے گڑگڑاتی تھی' روز بروز وہ زمین سے آسمان کی طرف سفر کر رہی تھی۔

خانم امتثال پر بہت مہربان تھیں اس کی تعلیم شروع کروا دی تھی ابھی تک وہ ہر بات سے ہر غم سے دور تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے میٹرک کر لیا تو خانم نے مزید تعلیم کے لئے انکار کر دیا اور اپنے مخصوص انداز میں نیلوفر سے کہا۔

"دیکھ نیلو یہ کتابی تعلیم ہو چکی لہٰذا ہماری دنیا کی تعلیم اب شروع ہو جانی چاہئے۔" نیلوفر جو امتثال کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی چونکی۔

"کیا مطلب؟"

"بھئی پیٹ کا دھندہ جس طرح چلتا ہے وہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔" خانم نے تنک کر کہا۔

"نہیں' نہیں ایسا نہیں ہو گا خانم تم جانتی ہو کہ میں سب کچھ کر سکتی ہوں مگر یہ نہیں ہو گا' میں خود گھنگھرو باندھ سکتی ہوں لیکن میری امتثال...... نہیں...... نہیں...... نہیں......" وہ دیوانی سی ہو گئی' امتثال کچھ کچھ سمجھ گئی تھی۔

"پگلی ہو تم' کتنے دن تمہارے گھنگرو اور چھنک سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ ایک دو سال اور پھر یہ کونسا اس ماحول سے باہر ہے اس کا مستقبل بھی یہیں ہے۔ یہ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی۔ خانم نے ذرا دھیرے انداز میں کہا۔

"مت بھولو کہ یہ یہاں کا گندہ وجود نہیں اس کا باپ اور خاندان......؟"

"ہاں' ہاں جانتی ہوں لیکن یہ سب اس وقت تک تھا جب تک تم اس عزت دار آدمی کی بیوی تھیں...... اب جانتی ہو تم کیا ہو......؟" خانم نے تیز نظروں سے اس کا دل چیر ڈالا وہ لرز سی گئی...... اور ندامت سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"کان کھول کے سن لو' آج سے یہ استاد فتح خان سے تربیت حاصل کرے گی۔" خانم کے لہجے میں فیصلہ تھا' ٹھوس فیصلہ اور اس کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے بے بسی سے امتثال کو بانہوں میں بھینچ لیا۔ ہمیشہ کی طرح ستارہ اس کے غم میں برابر کی شریک تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆

امتثال کو اپنی بات کا جواب مل چکا تھا اور اس کے اندر ایک ٹھہراؤ آ چکا تھا۔ اب اسے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا تھا اب وہ خانم سے بھی نہیں الجھتی تھی۔ بس قسمت پر شاکر ہو گئی تھی...... اسے یا اس کے اندر کی خوبصورتی کسی کو اسیر نہیں کرے گی۔ سب اسے خریدنا تو چاہیں گے لیکن وہ کسی کو نہیں خرید سکے گی۔ اس کے اندر کی معصوم لڑکی ہمیشہ کے لئے مر چکی ہے۔

مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا...... اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ خانم نے اس کے لئے کیا فیصلہ کیا ہے؟ اور وہ کس کے ہمراہ جا رہی ہے......؟ نیلوفر کا سنگین احتجاج بھی اس کے لبوں پر لگے قفل نہ توڑ سکا...... اس نے ماں کے گلے لگ کر اسے تسلی دی۔

"دعا کرنا کہ ہم دونوں جلد مر جائیں۔" نیلوفر کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور پھر وہ بھی جیسے سکون ہو گئی۔

"خدا حافظ میری زندگی۔" اس کے اس اشارے کے بعد وہ نئے سفر پر نکل پڑی......

رات اندھیری تھی...... کار تیزی سے آگے کی طرف دوڑ رہی تھی وہ اپنا سب کچھ ماں کے روپ میں پیچھے چھوڑے جا رہی تھی...... آگے کی اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ آنکھیں موند کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ خاموش تھی' بالکل خاموش اس نے تو یہ بھی نہیں پوچھا تھا اس کا خریدار کون تھا......؟ اور کیسا تھا......؟ لیکن جب بکنا ہی مقدر ٹھہرا تو پھر خریدار کوئی ہو......؟ وہ بھلا پھر کیا کرتی......؟

اس نے تو خود کو وقت اور حالات کے حوالے کر دیا تھا۔ زندگی کی تمنا تو ویسے بھی نہیں تھی...... کاتب تقدیر نے جو لکھ دیا تھا وہ آخر ہونا ہی تھا۔ قصور وار کون تھا؟ کس کو سزا ملتی......؟ اس کا جرم تو صرف اتنا تھا کہ وہ ایک ماں کی بھول تھی جسے تقدیر نے اس کے ہنستے مسکراتے چمن سے نکال کر سفاکوں اور بے رحموں کی دنیا میں پیدا کیا تھا...... وہ کس سے یہ جنگ کرتی کہ میرا قصور کیا ہے......؟ جب جنگ ہی نہیں کر سکتی تھی تو خاموش رہنا ہی بہتر تھا اور یہ خاموشی اس کی بڑی گہری اور جامد تھی۔

چمکیلی سنہری دھوپ نے سردی کی شدت میں کافی کمی کر دی تھی۔ ہر طرف پھیلی دھوپ دھند اور اوس زدہ ہر چیز کو خشک اور اجلی کر چکی تھی۔ اونچے اونچے پہاڑوں کے بیچ سرسبز وادی میں زندگی کی لہر دوڑ چکی تھی۔

جیسے ہی گاڑی کے بریک چرچرائے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ گاڑی ایک بہت وسیع و عریض عالی شان محل نما کوٹھی کے اندر کھڑی تھی جہاں پہلے سے تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔

"احمد علی! لڑکی کو اندر لے آؤ۔" اگلی سیٹ سے اترنے والے شخص نے غالباً ڈرائیور سے کہا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر چلا گیا...... وہ بغور تو اسے نہ دیکھ سکی مگر حیران تھی کہ یہ کس قسم کا انسان ہے؟

"آؤ بی بی۔" ڈرائیور نے پچھلا دروازہ کھول کر کہا اور وہ بغیر کچھ پوچھے اتر کر اس کے ساتھ اندر چلی آئی......

"بی بی صاحبہ' یہ انا بوا ہیں اس گھر کی اور میں ملازم۔"

"ٹھیک ہے جان محمد تم جا کر ناشتہ لاؤ میں اتنے میں بچی کو ہاتھ منہ دھلا کر تیار کرتی ہوں۔" انا بوا نے اس سہمی سہمی سی لڑکی کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ جان محمد چلا گیا...... تو وہ حیرت سے اہر نکلی۔

"یہ کونسی جگہ ہے' یہ کس کا گھر ہے......؟"

"ارے یہ بھی نہیں معلوم؟" انا بوا نے بے اختیار ہنس کر پوچھا

"نہیں۔" اس نے معصومیت سے گردن ہلا دی۔

"تم اس وقت سوات میں ہو اور یہ نواب بختیار احمد صاحب کی کوٹھی ہے جو کہ اب ان ے بعد ان کے بیٹے افراسیاب احمد کی ہے۔" انا بوا نے مختصراً بتایا گو کہ اس کی پوری طرح تسلی یں ہوئی لیکن خاموش رہی۔

"یہ سامنے غسل خانہ ہے ہاتھ منہ دھو لو' ناشتہ آتا ہی ہو گا۔" انا بوا نے غسل خانے کی ف اشارہ کیا اور وہ خاموشی سے اس طرف چلی گئی۔

ناشتہ کیا تھا پوری برات کے لئے کھانا تھا اتنی زیادہ چیزیں دیکھ کر وہ حیران تھی۔

"اتنا ناشتہ......؟"

"اس گھر کی روایت ہے۔" انا بوا نے کہا اور وہ پھر ناشتے میں مصروف ہو گئی لیکن ایک دم ے نوالہ اس کے منہ میں پھنس گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ہاتھ پلیٹ میں رک گیا...... وہ ماں سے کتنی دور آ چکی تھی اور وہ نجانے اس کی جدائی میں رو رو کر مر ہی نہ گئی ہو...... "نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔" یکلخت ہی وہ بڑبڑائی۔

"ارے کیا ہوا......؟" انا بوا پریشان ہو گئیں۔

"کچھ نہیں بس ویسے ہی۔" اس نے جبر سے آنسو صاف کر لئے۔

"انا بوا چھوٹے صاحب بلا رہے ہیں۔" جان محمد نے آ کر اطلاع دی۔

"بیٹا! تم ناشتے کے بعد آرام کرو بستر پر میں فارغ ہو کر آتی ہوں۔" انا بوا نے بستر کا ذکر خصوصاً ر جان محمد کے ہمراہ باہر چلی گئی۔

پھر واقعی وہ آرام کی غرض سے جیسے ہی بستر پر لیٹی نیند نے آ لیا...... اور اسے کچھ ہوش ہ رہا وہ بے خبری کی نیند میں کھو گئی۔

کسی نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ہلایا تو وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ انا بوا اس کے قریب تھیں۔

"بہت سوئیں بٹیا، دوپہر کھانے پر بہت جگایا مگر تم تو ہلی بھی نہیں، اٹھو کچھ کھالو اور چھوٹے صاحب نے تمہیں اپنے کمرے میں بلایا ہے۔" انا بوا نے کہا تو وہ لرز سی گئی۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" انا بوا نے اس کے چہرے کے تاثرات جان لئے تھے وہ ہمت کر کے اٹھی اور ان کے ہمراہ چل دی۔ طویل راہ داری عبور کر کے وہ دائیں ہاتھ والے کمرے کے سامنے جاکر رکیں۔

"جاؤ میں ذرا رات کے کھانے کا انتظام دیکھ لوں۔" انا بوا نے نہایت محبت سے کہا اور خو دوسری طرف مڑ گئیں...... اس نے ڈرتے جھجکتے دروازہ اندر کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گئی۔ خوبصورت انداز میں نفاست سے سجے کمرے میں بند کھڑکی کے شیشوں سے باہر گہری ہوتی شام دیکھ رہے تھے۔

"آیئے محترمہ صوفے پر تشریف رکھئے۔" پشت کئے کئے ہی بھاری آواز میں کہا گیا۔ کر شلوار سوٹ میں وائٹ گرم شال کندھوں پر ڈالے وہ جو کوئی بھی تھے ان کی آواز بہت خوبصور تھی...... اور یہ اس شخص کی آواز سے مختلف تھی جو اسے لے کر آیا تھا۔

"ہم آپ سے بہت شرمندہ ہیں اور نہایت افسوس سے کہہ رہے ہیں کہ ہمارے اتنے عز اور گہرے دوست نے ہمیں اپنی ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔ ہم سے نجانے کس دشمنی کا بدلہ ہے ہم نے تو ایسا کبھی تصور میں بھی نہیں کیا تھا پھر نجانے کیوں ہماری سالگرہ پر دینے کے لئے انہیں کوئی دوسرا تحفہ نہ ملا...... اس سے تو بہتر تھا کہ وہ ہمیں زہر دے دیتے مگر ان کی اس حرکت ہم تو بخدا آپ سے نظر بھی نہیں ملا سکتے، اتنے شرمسار ہیں کہ اپنے مقام سے چھوٹا محسوس کر ر ہیں، ہم نہیں جانتے کہ آپ کون ہیں؟ کیسی ہیں اور کہاں سے لائی گئی ہیں، لیکن یقین دلاتے ہیں ہم معذرت کے ساتھ آپ کو پوری عزت واحترام کے ساتھ چھوڑ کر آئیں گے اپنے دوست ساتھ مصلحتاً واپس نہیں بھیجا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو رات یہاں اطمینان سے بسر کر سکتی ہیں فوراً جانا چاہیں تو ہم ابھی اسی وقت چھوڑ کر آنے کو تیار ہیں سوچ کر جواب دیجئے۔"

وہ اتنی دیر سے مسلسل ایک سحر میں گرفتار تھی آواز کا جادو نشے کی شکل میں اس پر چھا گیا تھا اور وہ اس عظیم دیوتا نما انسان کے سامنے خود کو بہت گھٹیا اور چھوٹا محسوس کر رہی تھی...... یہ وہ کس دیوتا کے روبرو تھی؟ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی......

"جی کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟" ان کی بھاری آواز دوبارہ ابھری۔ تو تب وہ واقعی فیصلے کے پیچ پھنس گئی...... اسے یاد آیا ماں نے کہا تھا "بیٹا یہاں واپس کبھی مت آنا" کسی دریا میں چھلانگ لگا دینا، کسی کھائی میں گر جانا، کسی بھاڑ میں جل جانا، مگر اس دوزخ میں بار بار مرنے کے لئے مت آنا...... میرے لئے بھی نہیں۔"

"صاحب! مجھے کسی بھی دریا کے پل پر چھوڑ دیں۔" پہلی مرتبہ وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔

"پل، کس لئے؟" ان کی آواز میں حیرت اور تعجب سمٹ آیا۔

"کیونکہ وہی میری منزل ہے۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"بخدا ہمیں اب بھی آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔" افراسیاب احمد ابھی تک حیران تھے۔

"صاحب! جہاں سے لائی گئی ہوں اس سے بہتر ہے کہ دریا میں ڈوب جاؤں آپ مہربانی کر کے مجھے آزمائش میں نہ ڈالیں بلکہ چھوڑ آئیں یا پھر مجھے راستہ سمجھا دیں۔" اس کے لہجے میں سارے جہاں کا درد اور بے بسی پوشیدہ تھی جس نے انہیں مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا...... کمرے کی خواب ناک روشنی میں نظریں جھکائے وہ افراسیاب احمد جیسے بھاری بھرکم شخصیت والے شخص کے دل کے تمام تار جھنجھنا گئے...... انہوں نے اس معصوم سی ادھ کھلی کلی کو آنکھیں مسل کر غور سے دیکھا...... اس کا حسن واقعی بے مثال تھا، ملکوتی جادو بھرا۔ "تم ٹھیک کہتے تھے توصیف مرزا، یہ بے مثال حسن و جمال ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔" بے اختیار ہی ان کے لب ہلے...... وہ سمجھی کہ شاید اس سے مخاطب ہیں......

"جی کیا فرمایا آپ نے؟" اس نے انہیں چونکا سا دیا......

"آپ کی بات ہم سمجھ گئے ہیں لیکن فی الحال فیصلہ نہیں کر سکتے آج رات آپ آرام کریں، صبح ناشتے پر بات ہوگی۔" وہ پھر رخ موڑ کر بولے...... اور وہ پلٹنا ہی چاہتی تھی کہ وہ پھر بولے۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بتا دیجئے گا۔"

"جی بہتر۔" وہ نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی اسی کمرے میں آ گئی......

ساری رات اسی خوف میں گزری کہ نجانے صبح کس سفر پر روانہ ہونا پڑے؟ کونسی منزل ہو؟...... پھر رات بھر اسے ماں بھی بہت یاد آئی اور وہ جی بھر کے روئی۔

بہت جلد سو کر اٹھی تو سر بھاری ہو رہا تھا لیکن دل میں ایک ہلکی سی لہر طمانیت کی بھی تھی۔ اس نے غسل کیا اور نماز کے لئے خدا کے حضور جھک گئی...... قادر مطلق سے اپنے لئے صرف اور صرف عزت کی زندگی اور عزت کی موت مانگی...... ماں کے لئے رو رو کر دعائیں مانگیں...... جیسے ہی فارغ ہوئی تو انا بوا آگئیں...... ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

"ہاں بوا، شاید اتنی پرسکون رات اور اتنی اچھی صبح کبھی میری زندگی میں پہلے نہیں آئی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"بیٹی! چھوٹے میاں تمہارے لئے پیغام دے گئے ہیں اور یہ لفافہ بھی دے گئے ہیں۔" انا بوا نے بھاری سا لفافہ اسے پکڑا دیا۔

"ک ک کیا ہے اس میں؟ اور وہ کہاں گئے ہیں؟"

"اپنے آبائی گاؤں ان کے بہت پرانے ملازم بابا عنایت فوت ہو گئے ہیں اس لئے رات ہی چلے گئے جانے سے پہلے مجھے کہا تھا کہ اس لڑکی سے کہہ دیں کہ اب وہ یہیں رہے گی۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔" انا بوا نے لفظ بہ لفظ افراسیاب احمد کا بیان پیش کر دیا...... جیسے وہ ششدر رہ گئی۔

"اور یہ کیا ہے......؟" اس نے لفافہ کی طرف اشارہ کیا۔

"روپے، ناشتے کے بعد ڈرائیور تمہیں شہر لے جائے گا کپڑے اور دیگر ضرورت کی چیزیں خرید لینا۔" انا بوا نے بتایا۔

"مگر۔"

"اگر مگر نہیں، چھوٹے میاں کا حکم ہے۔"

"انا بوا وہ کب تک آئیں گے؟" پتہ نہیں کیوں اسے یہ سب کچھ اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔

"میں ناشتہ تیار کرواتی ہوں۔" انا بوا اسے پریشانی کے عالم میں کھڑا چھوڑ کر چلی بھی گئیں اور وہ کافی دیر اسی زاویے سے کھڑی ہی رہی۔

کل تک ماں کو اپنے عذاب سے نجات دینے کے بعد جتنی خوش اور مطمئن وہ تھی آج زندگی کے سکھ حاصل کرنے کے بعد ماں کی یاد اسے ایک پل بھی چین نہیں لینے دے رہی تھی...... اب دل چاہ رہا تھا کہ کہیں سے ماں آ جائے اور وہ اس کے بازوؤں میں چھپ کر سو جائے...... مگر جتنا یاد کر رہی تھی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ آنسوؤں سے تکیہ بھیگ گیا اور ہلکی ہلکی سسکیاں چاروں طرف پھیلی تھیں۔

کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے افراسیاب احمد ٹھٹھکے اور پھر بلاتامل کمرے میں داخل ہو گئے...... اس نے تکئیے پر منہ رکھا ہوا تھا لیکن اس کا نازک سا جسم لرز رہا تھا۔

"کیا ہم یہ سمجھیں کہ ہمارا فیصلہ آپ کے حق میں غلط ہے......؟" وہ اس کے رونے کی وجہ نہ جان سکے...... وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی...... اس کی خمار آلود آنکھیں بری طرح سرخ ہو رہی تھیں...... وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے کے بعد رخ موڑ کر کھڑے ہو گئے۔

"نہ، نہ۔ نہیں۔ اس کے لئے تو میں شکر گزار ہوں، لیکن......؟"

"لیکن کیا......؟"

"ماں یاد آ رہی تھی۔" وہ معصومیت سے بولی اور چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ اس وقت وہ بہت چھوٹی سی بچی لگی...... انہیں چپ کرانا مشکل ہو گیا۔

"ہم بہت شرمندہ ہیں آپ سے، آپ منہ دھو کر ہمارے کمرے میں آئیں پوری بات بتائیں ہم وعدہ کرتے ہیں کہ کسی بھی طریقے سے آپ کی ماں کو بھی یہیں لے آئیں گے۔" یہ ڈھارس دے کر وہ باہر نکل گئے اور وہ رونا دھونا بھول کر اس فرشتہ صفت، حسین اور وجیہ سراپے کے بارے میں سوچتی رہ گئی۔

جیسے ہی سہمے سہمے قدموں سے وہ ان کے کمرے میں پہنچی تو انہیں منتظر پایا۔

"آپ خوش تو ہیں یہاں یا کہ نہیں؟" انہوں نے پہلا سوال کیا۔

"جی چھوٹے میاں، لیکن ہمیں آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ چھوٹے میاں صرف انا بوا کو کہنے کی اجازت ہے...... دوسری بات یہ کہ ہماری پناہ، ہمارا گھر پل سے کہیں زیادہ بہتر اور محفوظ ہے ہم نے آپ پر رحم نہیں کھایا بلکہ اپنی

تمام تر ذہنی صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے فیصلہ کیا ہے اور یہاں تاحیات آپ پر' آپ کی عزت پر' کوئی حرف نہیں آئے گا۔" انہوں نے بغیر کسی توقف کے روانی میں کہا۔

"لیکن صاحب' میں کیا ہوں میری حقیقت کیا ہے؟ اس گھر میں میری وجہ سے بہت ذلت آ سکتی ہے۔" وہ ڈرتے ہوئے دل میں کروٹیں لیتے خوف کا ذکر کر بیٹھی۔

"آپ اگر بتانا چاہیں تو ضرور بتائیں ویسے ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے' تاہم آپ صرف اور صرف ننھی پری ہیں۔ اب تسلی سے بیٹھ کر سب کچھ بتائیں۔" انہوں نے نہایت میٹھے انداز میں اسے جکڑ بند کر دیا اور وہ واقعی سحرزدہ سی ہو کر سب کچھ بتانے کے لئے بیٹھ گئی...... جیسے وہی پہلے اور آخری سننے والے تھے جیسے ان کے پاس ہی اس کے ہر دکھ درد کا علاج تھا...... جیسے روشنی کی کرن ان کے دم سے اس کے اجڑے صحن میں اترے گی...... اس نے زندگی کے وہ تمام اوراق الٹ دیئے جو اس کا اور ماں کا ماضی تھا۔

بات ختم کر کے سہمی نظروں سے چپ چاپ بیٹھے ہوئے انہیں دیکھا تو وہ چونکے اور چند ثانئے کے بعد انہوں نے اس کی سوالیہ نظروں کا جواب پیش کر دیا۔

"کوڑے کے ڈھیر پر اگر کوئی مقدس کاغذ گرا ہوا ہو تو وہ غلیظ نہیں ہو جاتا لوگ اسے اٹھا کر چوم کر کسی جگہ پر رکھ دیتے ہیں۔" اس کا چھوٹا ذہن اچھی طرح بات کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ وہ پھر آہستہ سے بولے۔

"ایس پی انوار احمد ہمارے بہت اچھے دوست ہیں آپ کی ماں اور باپ ہم ڈھونڈ لائیں گے' وعدہ کرتے ہیں لیکن ایک وعدہ آپ بھی کریں۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"ان لوگوں کے آنے تک کم سے کم آپ یہاں خوش و خرم رہیں گی۔" اس نے اثبات میں گردن ہلا دی...... اور افراسیاب احمد کے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا...... زندگی کے اس عجیب سے موڑ پر وہ خود بھی متحیر تھے...... لیکن...... یہ حیرانی پریشانی کا باعث نہیں تھی...... وہ اٹھ کر جا چکی تھی۔ انابوا انہیں بغور دیکھ رہی تھیں۔

"چھوٹے میاں! یہ تو بتاؤ کہ یہ لڑکی ہے کون......؟" کئی روز سے انابوا اس الجھن میں گرفتار تھیں۔

"یہ ننھی پری ہیں جو چھم سے اس سونے آنگن میں اتری ہیں۔" وہ کھوئے کھوئے بولے۔

"ہیں' بھئی ہم نہیں سمجھے کیا کہہ رہے ہو......؟"

"سمجھ جائیں گی آپ' فی الحال اتنا جان لیں کہ یہ ہماری عزت اور ہمارا وقار ہیں ان کا آپ ہماری طرح خیال رکھیں۔" ان کی اس بات سے انابوا بہت کچھ سمجھ گئیں ان کی بوڑھی آنکھوں میں چمک آ گئی...... جو سوال ایک عرصے سے وہ ان سے کر رہی تھیں اس کا جواب مل گیا تھا...... چھوٹے میاں تو اولاد کی طرح عزیز تھے ماں باپ کے بعد وہی تو ان کا سب کچھ تھیں...... پھر بھلا کیسے نہ سمجھتیں......؟ ہلکے سے مسکرائیں اور کمرے سے باہر آ گئیں۔

وہ آرام کرتے کرتے عاجز آ چکی تھی...... انابوا اسے کچھ کرنے ہی نہیں دیتی تھیں...... ملازمین کی فوج اتنی زیادہ تھی کہ کوئی کام ادھورا رہتا ہی نہیں تھا...... بس اس کا کام تھا صرف دن بھر میں دو تین قیمتی لباس تبدیل کرنے' انواع و اقسام کے کھانے اور خوب آرام لیکن ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ سخت بیزار ہو کر سیدھی وسیع و عریض باغیچے میں نکل آئی' بہت خوبصورت پھولوں کا انتخاب تھا...... وہ لمبی لمبی سانس لیتی ہوئی ٹہلنے لگی...... دھانی آنچل سنبھالتے ہوئے بے اختیار اس کا دل چاہا کہ کہیں سے پھولوں کے کسی کنج کے پیچھے سے وہی مہربان چہرے ابھرے اور اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرے...... مگر کئی روز ہو گئے تھے ان سے ملے ہوئے پتہ نہیں وہ گھر پر تھے بھی کہ نہیں آپ ہی آپ دل مچلنے لگا کہ وہ کہاں ہیں......؟

"پاگل ہو گئی ہو امتثال' اپنی حیثیت مت بھولو' تم ان کے ملازمین سے بھی کمتر ہو لہذا اپنی اوقات میں رہو۔" وہ جیسے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی۔ لبوں کی مسکان پھیکی پڑ گئی اور اداس سی قریب پڑی کین کی نازک کرسی پر بیٹھ گئی...... بال ہوا سے الجھنے لگے' دوپٹہ سرکش ہو گیا...... مگر وہ نجانے کہاں تھی کہ قدموں کی بالکل قریب دھمک سے چونکی...... چاکلیٹی پینٹ اور سفید شرٹ میں اپنے وجیہہ ترین سراپے سمیت وہ اس کی بکھری زلفیں اور خواب آلود نگاہوں کے سحر سے بچتے ہوئے بولے۔ "آپ پھر اداس ہیں۔"

"جی' نہ' نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" انہیں قریب پا کر وہ بری طرح پزل ہو گئی حالانکہ کچھ ہی دیر پہلے وہ اس تمنا کا شکار تھی...... وہ مزید کچھ کہے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اندر چلے گئے...... پھر اسے اندازہ ہوا کہ یقیناً وہ زمینوں پر یا شہر فیکٹری گئے ہوں گے...... ایک دم ہی چند لمحے

پہلے ان کے جسم کی خوشبو اسے مخمور سی کرنے لگی...... ایسا کرنے میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں تھا ......وہ تو بیٹھے بیٹھے وہیں سو گئی......

شام ڈھلے انا بوا نے اسے جگایا تو وہ خجل سی ہو گئی

"ارے بیٹا چلو اندر کمرے میں چل کر آرام کرو۔"

"نہیں انا بوا مجھے کوئی کام بتائیں میں آرام کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔" وہ ٹھنکی

"ایسا نہیں کہتے، بھلا ملازمین کس لئے ہیں؟"

"میں بھی تو ایک ادنیٰ سی ملازم ہی ہوں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"ہش چھوٹے میاں نے سن لیا تو قیامت آجائے گی۔" انہوں نے ڈانٹا اور وہ منہ بسورتی ہوئی کمرے میں آگئی۔ رات کو کھانے کے بعد جیسے ہی سونے سے پہلے انا بوا دودھ لے کر آئیں تو بول پڑی۔

"یہ اتنا بڑا محل مجھے قید خانہ لگنے لگا ہے۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہیں، آپ بھی مصروف رہتی ہیں اور صاحب تو جیسے بات کرنا ہی نہیں جانتے۔" اس کے لبوں کی شکایت انا بوا کو بہت اچھی لگی۔ ہلکے سے مسکرائیں۔

"تمہیں کس نے منع کیا ہے بولنے کو، خوب بولو، گھومو پھرو، گاڑی چلانا سیکھ لو، پیدل وادی کی سیر کرو اور صاحب کی بات چھوڑو، وہ تو ہفتے میں ایک آدھ دن گھر آتے ورنہ زمینوں پر یا پھر شہر میں فیکٹری کے بکھیڑے نمٹاتے رہتے ہیں۔" انا بوا نے بتایا تو وہ چپ ہو گئی...... دودھ بھی پی لیا ......انا بوا چلی بھی گئیں۔ اس نے لائٹ آف کی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی...... پہلے ماں سے خیالوں میں محبت بھری باتیں کیں...... پھر کوئی اور ذہن کے دریچے سے جھانکا تو وہ بے کل سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور سلیپر پہن کر بے خیالی میں کمرے سے باہر آئی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھتے گئے اور وہ افراسیاب احمد کے کمرے کے باہر پہنچ گئی۔ دروازے کو جیسے ہی چھوا تو وہ کھلتا چلا گیا ......جیسے وہ اس کا ہی منتظر تھا...... مدھم سی روشنی میں بستر پر دراز آنکھوں پر ہاتھ رکھے پتہ نہیں سوئے ہوئے تھے یا جاگ رہے تھے۔ وہ بیڈ سے چند قدم پرے کھڑی ایک ٹک انہیں دیکھنے میں محو تھی وہ اٹھے اور بالکنی میں جا کھڑے ہوئے......

"کچھ کہنا چاہتی ہیں آپ؟" ان کی آواز پر وہ شرمندہ سی کٹ کر رہ گئی۔ وہ تو بغیر بتائے صرف دیکھنے کے بعد واپس جانا چاہتی تھی یہ کیسی بے خودی ہے؟ مارے خجالت کے وہ نظر نہ اٹھا سکی۔

"کک...... کچھ نہیں جی......" بمشکل کہا اور تیزی سے بھاگی...... سیدھی کمرے میں پہنچ کر دم لیا...... پوری پسینے میں نہا گئی...... اپنی اس حرکت پر دل چاہا کہ ڈوب مرے، بھلا وہ کیا سوچیں گے......؟

"نہیں، نہیں آئندہ تم اتنی گھٹیا حرکت بالکل نہیں کرو گی امتثال، تمہیں عزت اور پناہ دینے کا یہ مقصد نہیں کہ تم سنہرے خواب بھی دیکھنے لگو۔" اس نے پیشانی سے پسینہ صاف کیا اور دھم سے بستر پر گر گئی...... دوسری طرف افراسیاب احمد کس طرح رات بھر کروٹیں بدلتے رہے وہ اس بات سے انجان تھی۔

آج صبح سے وہ بہت اداس تھی۔ اسے رہ رہ کر ماں یاد آرہی تھی۔ ناشتے کے بعد سے مسلسل وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ آنسو نکلتے تو جلدی سے صاف کر دیتی مگر دل بے قابو ہی ہوا جا رہا تھا...... گو کہ سارے گھر میں افراتفری کا عالم تھا...... رمضان سے پہلے پینٹ اور رنگ و روغن ہونے شروع ہو چکے تھے۔ بقول انا بوا کے چھوٹے میاں ہر سال عید سے پہلے گھر صاف ستھرا ضرور کراتے ہیں۔ اس مرتبہ فرنیچر کی تبدیلی بھی ہونی تھی...... ان کے سمیت سب ملازمین نماز روزے کے پابند تھے۔ انا بوا کو تو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ ہفتہ رہ گیا رمضان شروع ہونے میں۔

افراسیاب احمد گئے ہوئے تھے اس کے پاس یادوں کے سوا کچھ نہیں تھا...... وہ انہی میں کھوئی ہوئی تھی کہ انا بوا نے آکر کہا۔

"بیٹا، یہ رنگ والے پوچھ رہے ہیں کہ چھوٹے میاں کے کمرے میں کونسا رنگ کرنا ہے۔"

"تو میں، میں کیا بتاؤں انہی سے پوچھئے۔" وہ بوکھلا سی گئی۔

"بھئی یہی تو مشکل ہے انہوں نے کہا کہ جو امتثال کہیں وہ کرا دیں۔" انا بوا نے ماتھا پیٹتے ہوئے کہا۔

"جی میں، مگر ان کے کمرے کا...... وہ تو بری طرح الجھ سی گئی۔

"ارے پگلی کیا ان کا کیا تمہارا...... ؟" نابوا ذو معنی سی ہنسی میں کہہ گئیں۔

"نابوا میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتی۔" اس نے تو ہاتھ اٹھا لئے' مجبوراً چھوٹے میاں کے آنے تک ان کا کمرہ رہنے دیا گیا۔

وہ دو روز کے بعد لوٹے تھے۔ وہ بے چین سی مضطرب سی ٹہل ٹہل کر ان کا انتظار کرتی تھی...... خود پر جبر کر کے کمرے میں بند پڑی تھی ان سے ملنا چاہتی تھی' باتیں کرنا چاہتی تھی...... لیکن اپنی حیثیت کے ہاتھوں پابندیاں لگا چکی تھی۔ دل نے کہا کہ چل تو ان کے لئے اداس تھی اور مان لے کر وہ تیری آنکھوں میں بسے ہوئے ہیں...... نہیں میری کیا اوقات اتنے باوقار آدمی کے لئے یہ سب سوچنے کی۔ میں تو ان کی خاک پا بھی نہیں۔" پھر وہ زبردستی تکیہ منہ پر رکھ کر لیٹ گئی۔

افراسیاب احمد کو ایک یقین سا تھا کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں ان کی منتظر رہتی ہوگی' یاد کرتی ہوگی اور سب سے پہلے گھر میں مسکرا کر سواگت کرے مگر ایسا تو انہوں نے محسوس نہیں کیا۔ وہ صرف سوچ کر رہ گئے۔" انسانیت نہیں افراسیاب احمد کہ تم یک طرفہ اس سے توقعات وابستہ کر لو پناہ دی ہے تم نے اس کا دل و دماغ خریدا تو نہیں۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ جس طرح وہ تمہیں اچھی لگی ہے وہ بھی تمہیں اچھا جانے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا تمہیں زیب نہیں دیتا۔" انہوں نے دل کو ڈانٹا اور لمبی سانس کھینچ کر بستر پر دراز ہو گئے۔

صبح ناشتے پر بھی وہ منتظر رہے مگر لاکھ بار بلانے پر بھی وہ نہیں آئی کیونکہ وہ ان کے اور اپنے درمیان فاصلہ رکھنا چاہتی تھی...... ان سے مل کر وہ بے چین ہو جاتی تھی۔ یہ فیصلہ اس نے رات ہی کیا تھا...... وہ ناشتے کے بعد سیدھے اس کے کمرے میں آ گئے...... وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"بخدا ہم نے ہر ممکن اپنے دوست کی زیادتی کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے تاہم پھر بھی اگر کوئی شکوہ شکایت ہے تو بتایئے۔"

"جی ایسا بالکل نہیں ہے بس میں یہاں کے قابل نہیں۔" اس کا بس رونے پر چلا سو رو پڑی۔

"ننھی پری! بہت جلد ہم آپ کو خوشی کی خبر سنائیں گے اور دکھائیں گے بھی۔" انہوں نے نظر بچا کے اس کی گھنیری بھیگی پلکوں کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

اس وقت اس کا دل چاہا کہ وہ ان کے سینے سے لگ کر محبت کی وسعتوں میں کھو جائے لیکن یہ خواہش اس نے بری طرح کچل ڈالی یہ وہ نہیں جانتی تھی کہ دونوں ہی ایک دوسرے کی تلاش میں ہیں......

"آپ کے والدین مل جائیں پھر آپ جا سکتی ہیں ہم آپ کو اداس رکھنا بالکل نہیں چاہتے۔" ایک دم ہی ان کا لہجہ تبدیل ہو گیا۔ وہ پوری سنجیدگی سے کہہ کر چلے بھی گئے اور وہ سوچتی رہی۔ "ہنہ دیکھ لیا امتثال بی بی۔ تمہاری اوقات کیا ہے...... ؟" اس نے شدید غصے سے سوچا اور بیزاری سے بیٹھ گئی۔

دوپہر کے کھانے پر بھی اس نے انکار کر دیا۔ کیونکہ افراسیاب احمد آج گھر پر تھے اور کھانے پر وہ منتظر تھے اس کا انکار ان کی سمجھ سے باہر تھا...... مضطرب سے خود بھی دو چار نوالے لے کر اٹھ گئے...... کچھ کہنے کی غرض سے اس کے کمرے کی طرف آئے تو اندر آتی اس کی آواز نے قدم روک لئے۔ وہ غالباً نابوا سے شکایت کر رہی تھی۔

"کیا ہے ہماری حیثیت' مہمان ہیں' والدین مل جائیں گے تو چلے جائیں گے میری شکل اتنی خراب ہے کہ آپ کے چھوٹے میاں بات کرنا نہیں چاہتے۔ بہت مصروف رہتے ہیں۔ بڑا احسان کیا ہے انہوں نے مجھے گھر میں پناہ دے کر بس کیا یہی چاہتی ہوں میں۔" اس سے آگے وہ رو دی۔ باہر کھڑے افراسیاب احمد پر جیسے فہم فراست کے نئے دروازے کھل گئے وہ ان کے ضبط کو لاپرواہی سمجھ رہی تھی بھلا اسے کیا سمجھاتے' زیر لب مسکرا کر واپس کمرے میں آ گئے۔

پھر دانستہ وہ لاپرواہ بن گئے آج صبح خاموشی سے شہر گئے۔ شام جب لوٹے تو اس کے لئے جو شاپنگ کی تھی۔ جان محمد کے ہاتھ اسے بھجوا دی...... وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔ بھنا اٹھی۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ غصے میں سرخ ہو گئی۔

"شکریہ کہو ان سے' مجھے ان کی ضرورت نہیں کیا سمجھ رکھا ہے انہوں نے بھیک منگی۔"

جان محمد ہکا بکا سا ہو گیا اور لفظ بہ لفظ ان سے کہہ دیا وہ شرارت سے مسکرائے اور پھر خود چلے آئے۔

"سمجھتے ہیں کہ بڑی ضرورتیں ہیں میری' ٹھیکہ لے رکھا ہے مہربان بننے کا' یہ تو پتہ نہیں کہ کوئی کیا چاہتا ہے ......؟ ایک لمحہ دیکھنا تو چاہتے نہیں میں تو عذاب میں پھنس گئی ہوں۔" وہ روتے روتے شکایتی انداز میں بول رہی تھی ان کی آمد سے بے خبر۔

"تو آپ بتا دیجئے کہ آپ کیا چاہتی ہیں؟" انہوں نے کہا تو وہ ڈر کے خوفزدہ سی ان کا منہ تکنے لگی...... ہلکے گلابی' سیاہ پرنٹڈ سوٹ میں سادہ سی انہیں بہت اچھی لگی۔

"جی' وہ میں؟"

"آج تو بتانا پڑے گا کہ ہمارا جرم کیا ہے؟" وہ بے نیازی سے صوفے پر بیٹھ گئے اور وہ تھوک نگلنے لگی۔

"کک' کچھ بھی تو نہیں۔" وہ شرمندہ سی تھی۔

"ہم بچے نہیں ہیں' تمہیں بتانا پڑے گا۔" وہ شوخ نظروں سے انگلیاں مروڑتی اس دھان پان سی لڑکی کو دیکھتے اور پھر نظر چرا جاتے۔

"وہ بس یہی کہ ...... کہ ہم اب اپنے گھر جائیں گے؟" اپنی دانست میں اس نے بڑے قرینے سے بات بنائی تھی اور وہ دل ہی دل میں ہنس دیئے تھے۔

"دیکھ لیجئے سچ ہونا چاہیئے" ...... انہوں نے کہا۔ تو اس نے اثبات میں تیزی سے گردن ہلا دی۔

"ہماری شادی تک تو رک سکتی ہیں یا......؟" انہوں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا...... اس کی ساعت پر جیسے بم گر گیا...... دل اچھل کر جیسے بے دم ہو گیا...... آنکھیں جھلملا گئیں یہ سب بے اختیار ہی ہوا تھا۔

"آپ کی شادی۔"

"ہاں سوچ رہے ہیں کہ کر ہی ڈالیں' کوئی لڑکی نظر میں ہو تو بتایئے۔ ہم نے صرف لڑکی ابھی فائنل نہیں کی۔" انہوں نے جیسے اس کا دل مٹھی میں لے لیا...... وہ بری طرح گھبرا گئی۔

"وہ جی میری کیا اوقات آپ کو جو پسند آجائے کر لیجئے۔" لڑھک کر آنسو رخسار پر آئے
وہ رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ کو شاید پھر ماں یاد آ گئی۔" جان بوجھ کر انہوں نے اس کے آنسوؤں کی طرف اشارہ کیا۔

"بس ایسا ہی ہے۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"ٹھیک ہے آپ کا بندوبست جلد کر دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور وہ الٹے منہ بستر پر گر کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی...... اس کا دل بری طرح بین کر رہا تھا۔

دو روز مزید اداسی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ماہ رمضان شروع ہو چکا تھا...... سب کے ساتھ وہ بھی پابندی سے روزے رکھ رہی تھی...... روزے اور نماز کی پابندی سے کافی سکون محسوس کرتی تھی...... کرنے کو اور تھا بھی کیا...... افراسیاب احمد پورے رمضان گھر پر رہتے تھے کسی بہت ہی ضروری کام سے جانا پڑتا تو جاتے ورنہ نہیں...... ویسے بھی اس کو کیا فرق پڑتا تھا اس دن کے بعد سے ویسے بھی ان سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی اگر وہ نہیں چاہتے تھے تو بھلا وہ کیوں بات کرتی ......؟ اور کیا بات رہ گئی تھی......؟ زندگی کی آخری امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ بس وہ تو یہاں چند روز کی مہمان تھی اور پھر ان سے کیا رابطہ' کیا تعلق......؟

صبح سے وہ اسی طرح کے جوڑ توڑ میں مصروف تھی۔ عین افطار کے وقت ہاتھ منہ دھو کر باہر نکلی...... میز پر معمول کے مطابق چیزیں سجی تھیں۔ افراسیاب احمد میز پر نہیں تھے...... انا بوا نے بتایا کہ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔"

"کیا ہوا......؟" اس نے پوچھا۔

"کہہ رہے ہیں کہ سر چکرا رہا ہے صرف چائے بھجوائیں۔" انا بوا نے بتایا۔

چند لمحے وہ کچھ سوچتی رہی پھر تیزی سے کچھ ہلکی پھلکی کھانے کی چیزیں ٹرے میں رکھیں اور جلدی سے خود چائے تیار کی اور ان کے کمرے میں پہنچ گئی۔

دونوں نے اکٹھے افطار کیا۔ افراسیاب احمد نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے بغور اسے دیکھا پیازی رنگ کا ڈھیلا سا کرتہ اور شلوار میں بکھرے بکھرے بے ترتیب بالوں سمیت' کاجل بغیر کالی آنکھیں جو اداسی اور ناامیدی کے تاثر میں گہری ہو گئی تھیں...... ان کے لئے دو جہاں کا حسن جیسے سارا سمٹ آیا تھا...... چائے ختم کر کے کپ رکھتے ہوئے جیسے ہی نظروں کا تصادم ہوا...... جذبے

قندیلوں کی طرح ارد گرد جھلملانے لگے ...... مگر محسوس صرف افراسیاب نے کیا کیونکہ اس کی نظر میں تو وہ تھے ہی پرائے ......

"جب آپ یہاں سے جائیں گی تو کیا ہمیں یاد کریں گی؟" اتنی دیر کی خاموشی کو انہوں نے بھاری آواز سے توڑا ...... تو وہ غلافی آنکھوں سے دیکھ کر رہ گئی۔

"صاحب! ہمارے یاد کرنے سے کیا ہوتا ہے ہم آپ کے شایان شان نہیں تو بھلا یہ جرات کر سکتے ہیں۔"

"کیا ہم بہت خراب ہیں۔" انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"نہیں صاحب، ہم اپنی بات کر رہے ہیں۔"

"بھول ہے تمہاری سب اچھے ہوتے ہیں ماحول اچھا یا برا ہو سکتا ہے۔"

"ماحول ہی پھر طبقاتی فرق پیدا کر دیتا ہے جیسے آپ اور میں۔" اس نے مثال دی تو وہ ہنس دیئے ......

"جانے سے پہلے بہرحال لڑکی ضرور پسند کرنی ہے ہمارے لئے۔" موقع دیکھ کر انہوں نے وار کیا اور اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا۔ جسے ترچھی نظروں سے انہوں نے دیکھا ...... وہ صرف چپ چاپ کمرے سے باہر آ گئی۔

دن برق رفتاری سے گزرتے چلے گئے پلک جھپکنے میں روزے اختتام کو پہنچ گئے۔ ستائیسویں روز عشاء کے بعد افراسیاب احمد کے طلب کرنے پر وہ آ گئی ...... وہ باغ میں کھلنے والی کھڑکی میں کھڑے باہر کے معطر موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے ...... بہت زیادہ حسن پرست تھے، یہی مزاج ان کے والد کا تھا بھی تو انہوں نے اس جنت نظیر وادی میں رہائش اختیار کی تھی ان کا بھی یہی خیال تھا۔

اس وقت بھی چاند کی روشنی میں باہر کی فضا اچھی لگ رہی تھی ...... اس کے قدموں کی آہٹ پر وہ پلٹے ...... اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا ...... وہ بیٹھ گئی۔

"ہم نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کے ماں باپ ڈھونڈ لائیں گے اور واقعی ہم نے آپ کے پاپا کو تلاش کر لیا ہے۔"

"کیا، سچ میرے پاپا کو، وہ زندہ ہیں، ٹھیک ہیں؟" مارے بوکھلاہٹ کے وہ دوڑ کر ان کے قریب آ گئی۔ پھر جیسے ہی احساس ہوا تو خجل سی ہو گئی۔

"وہ بالکل ٹھیک ہیں اپنے بڑے بھائی کے ہاں مقیم ہیں آپ کے لئے بہت اداس اور بے چین۔"

"مجھے لے چلئے۔ فوراً ابھی" وہ منت کرنے لگی۔

"صبر، حوصلہ، لے جائیں گے۔" انہوں نے کہا۔

"اور ماں، ماں نہیں ملی آپ کو؟" اسے ماں کا خیال بھی شدت سے آیا۔

"ماں ...... ہاں ملی تھیں ...... لیکن ...... ؟"

"لیکن کیا، کہاں ہے ماں ...... ؟ وہ رو دی۔

"وہ تو ایک ماہ پہلے ملی تھیں ہسپتال میں ایڈمٹ تھیں انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا ان کی حالت سیریس تھی تمہیں ملوانا چاہتا تھا لیکن ان کے پاس وقت نہیں تھا انہوں نے منع کر دیا۔ فقط اتنا کہا۔" خدا میری گڑیا کو خوش رکھے، میرا مرجانا اس کے حق میں بہتر ہے کیونکہ واپسی کے ہر رستے پر کانٹے بچھے ہیں جو مجھے لہولہان اور میری بیٹی کو زخمی کر دیں گے دلدل میں پھنسے پاؤں سہارا دینے والوں کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں ...... اسے دعا دینا اور کہنا کہ تمہاری جدائی نے تمہاری ماں سے ہر بھول، ہر زیادتی کا بھرپور انتقام لیا ہے۔ ہو سکے تو وہ مجھے معاف کر دے اور رحمٰن بھی اس گناہ گار کو معاف کر دیں" ...... ان کی اپنی آواز رندھ سی گئی ...... اور وہ تو جیسے ہونق سی صرف ان کا منہ تک رہی تھی۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

"امتثال یہ زندگی کی حقیقتیں بڑی تلخ مگر ٹھوس ہوتی ہیں اور انہیں حوصلے اور صبر سے برداشت کرنا پڑتا ہے۔" پہلی بار انہوں نے دھیرے سے اس کا نام پکارا اور سمجھایا۔

"ماں نہیں مر سکتی۔" وہ بری طرح سسک اٹھی ...... کافی دیر وہ سسکیاں لیتی رہی انہوں نے نہیں روکا ...... جب سسکیوں میں کمی واقع ہوئی تو وہ آہستہ سے بولے۔

"غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے لیکن ہمارا معاشرہ عورت کی غلطی کو سنگین سزا میں بدل دیتا ہے پر لاکھ عورت اپنی پاکیزگی یا سچائی کا بین کرے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہم افسردہ ہیں۔ اس زیادتی پر جو تمہارے اور تمہاری ماں کے ساتھ ہوئی مگر ہم اور ہمارے جیسے بے شمار لوگ ہیں جو

صرف افسردہ ہوتے ہیں مگر اس سفاکانہ' جارحانہ رویئے کو بدل نہیں سکتے کیونکہ ہمیں کھرے کھوٹے کی پہچان نہیں ہوتی ایک ہی عینک سے سب کچھ دیکھتے ہیں...... لیکن ہم منفرد ہیں ہمیں کیچڑ میں پھنسا کنول 'کنول ہی نظر آتا ہے۔ ہم بے گناہ کو گناہ گار نہیں کہہ سکتے...... ہم جانتے ہیں کہ عورت خریدی نہیں جاتی بلکہ اسیر کی جاتی ہے عورت صرف شاعری اور عاشقی کے لئے نہیں سکون' راحت' چاہت اور شادی کے لئے ہوتی ہے...... ہم ایک بدنصیب عورت کی انجان سی لرزش کی سزا اس کی معصوم مضطرب بیٹی کو نہیں دینے دیں گے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتے رہے اور وہ الفاظ کے زیروبم میں ڈوبتی رہی ابھرتی رہی......

"ہماری بات سمجھ آئی یا کہ نہیں۔" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

"مجھے پاپا کے پاس لے چلیں۔" وہ جذباتی ہونے لگی۔

"ضرور لیکن ایک شرط پر......" انہوں نے توقف سے اس کے دل میں جھانکا۔

"کیا......؟"

"آپ ہمارے لئے پہلے لڑکی پسند کریں گی۔"

"کیا...... میں...... لڑکی؟" اس کا جیسے زخم تازہ ہو گیا' لب کپکپا کے رہ گئے۔

"کیوں کیا ہوا......؟"

"کچھ نہیں"...... وہ دھیرے سے بولی۔

"یہ دیکھئے یہ لباس ہم نے بڑی چاہ سے تیار کرایا ہے آپ کو جو لڑکی پسند آجائے عید کے دن اسے یہ لباس پہنا کر ہمارے پاس لے آئیں۔" انہوں نے وارڈروب کھولی تو اس کی آنکھیں نہایت بھاری خوبصورت کامدانی کے جھلملاتے کپڑوں پر ٹک گئیں۔ میرون رنگ پر گمان ہوتا تھا کہ ستاروں کی محفل سجی ہے...... کسی دیس کی شہزادی کا شاید ایسا لباس ہو۔"

"مگر دو روز میں لڑکی اور لباس......؟" وہ خیال آنے پر بوکھلاہٹ میں بولی:

"جی' اگر پاپا سے ملنا ہے تو یہ سب کچھ کرنا پڑے گا۔" انہوں نے لباس ہینگر سمیت اتار کر بیڈ پر رکھ دیا...... اور ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے کندنی جڑاؤ سیٹ بھی قوب رکھ دیا...... وہ تذبذب میں گرفتار تھی' دل میں درد کروٹیں لے رہا تھا۔ اپنی آرزوؤں کا خون اپنے ہاتھ سے کیسے ہو سکتا ہے......؟

"یہ زیادتی ہے۔" وہ چلائی۔

"کوئی زیادتی نہیں ہے' آپ ہمارا اتنا سا کام نہیں کر سکتیں؟"

"مگر میں ایسا کیسے کروں کسی کو نہیں جانتی۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"ایک لڑکی کو آپ جانتی ہیں اسے دیکھیں' فیصلہ کریں۔" انہوں نے گرہ لگائی۔

"اور میرے پاپا۔"

"عید والے روز اگر آپ نے ہمارا کام کر دیا تو ہم فوراً آپ کو لے جائیں گے۔"

"ورنہ......؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"ورنہ پاپا سے ملنے کا خیال ترک کر دیں۔" انہوں نے تیزی سے جواب دیا۔ تو وہ سناٹے میں آگئی......

چاند رات سر پر آگئی مگر وہ کچھ نہ کر سکی۔ بھلا کرتی بھی کیا نہ کوئی واقف نہ جان پہچان پھر بھلا لڑکی کس درخت سے توڑ لاتی مگر شرط بڑی کڑی تھی پاپا کے لئے دل مچل رہا تھا مگر درمیان کی دیوار سے سر پھوڑنا ضروری تھا "یا اللہ میں کیا کروں" وہ تو میری بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ صبح کہاں سے لڑکی لاؤں گی اور لباس پہناؤں گی۔" وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر رہ گئی۔

لمحہ لمحہ کر کے وقت گزر رہا تھا چاند رات تھی انابوا بڑے اہتمام سے عید منانے کے چکر میں بہت مصروف تھیں صبح کے لئے بے شمار چیزیں تیار ہو رہی تھیں۔ اس کے لئے مہندی انہوں نے بھگودی تھی جسے دیکھ کر وہ جل بھن گئی۔ اس کی جان پر بنی تھی بھلا مہندی کا خیال اسے کیسے آتا۔ مگر انابوا نے ڈپٹ کر تاکید کی تھی...... رات کے بارہ اسی سوچ بچار میں بج گئے...... پھر اس نے خود کو تسلی دی۔ "جہنم میں گئی لڑکی کہاں کی انسانیت ہے کہ کرے کوئی بھرے کوئی۔ مجھ سے نہیں۔ ہوتا یہ سب کچھ صبح دیکھا جائے گا جو رانی توپ چلنی ہے چل جائے۔ پاپا نہیں ملیں گے تو کیا ہے میں تو ہوں ہی بدنصیب اب تک صبر کیا ہے۔ مزید بھی کر لوں گی۔" کچھ رو کر کچھ غصے میں سوچا اور مہندی کا پیالہ اٹھا کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آگئی۔ سوچ سوچ کر تو زرد پڑ گئی تھی ایک تو ویسے ہی اداس تھی نے اچھا سمجھا وہ بھی پرایا ہونے کو تھا۔ دوسرے خواہ مخواہ کی تکلیف وہ تو سرسوں کا پھول بن گئی تھی۔

صبح آنکھ کھلی تو آٹھ بج رہے تھے۔ تیزی سے اٹھی گھر میں مکمل سناٹا تھا غالباً سب لوگ نما
کے لئے جاچکے تھے۔ انابوا کچن میں مصروف تھیں۔ اس نے کپڑے زیورات نکالے' نہاکر آئی او
تیاری میں مصروف ہوگئی...... کئی گھنٹوں کے بعد اس نے جو پوری طرح خود کو آئینے میں دیکھا
خود بھی شرماگئی...... فوراً ہی حیا سے پلکیں جھک گئیں اسی لمحے دل میں خوف پیدا ہوا...... قدم ل
کھڑائے مگر وہ ڈٹی رہی...... کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ پر جسم جیسے لرزے کی زد میں آگ
...... ساری کی ساری پسینے میں بھیگ گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ساری جرات اور حوصا
کہیں دفن ہوگئے ہیں۔

تیز خوشبو کا جھونکا اس کے احساسات سے ٹکرایا...... تو بے اختیار ہی اس نے مار۔
شرمندگی کے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لئے۔

وہ اندر آکے خود کو کسی ماورائی فضا میں خیال کررہے تھے بے چین تھے اس کے رخ روشر
کا نظارہ کرنے کے لئے مگر روشنیوں' کا' خوشبوؤں کا ایک سیلاب تھا' ایک طوفان تھا...... جو ا
کے مدمقابل تھا...... وہ اس صندلی' مرمریں' مومی جسم کو چھوتا' محسوس کرتا اور اپنے مضبوط حصہ
میں قید کرنا چاہتے تھے مگر مجبوری' تکلف روایت اور تہذیب نے احساسات کی گرمی پر اوس گر
دی...... مگر جذبات کی حد کے سامنے آج کچھ نہیں ٹھہر سکتا تھا...... واہ' بہت خوب آپ کو
خوش فہمی بھی تھی۔" انہوں نے چڑانے کے لئے ذرا دل سنبھالا۔

"میں اس قابل نہیں۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز اور دکھ تھا۔

"پھر یہ سب کچھ......؟"

"صرف آپ کی بے جاضد"...... وہ احساس توہین سے سرخ ہوگئی۔

"ورنہ"...... انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ورنہ مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی یہ ناٹک کرنے کی۔"

"تو یہ ناٹک ہے' لیکن ہم نے سچ مچ کی لڑکی کے لئے کہا تھا۔"

"وہ آپ خود تلاش کریں"...... اس نے ساری شرم' شرمندگی بالائے طاق رکھ کر کہا۔

"تو یعنی آپ معذور ہیں اس مد میں۔"

"جی ہاں۔"

"دیکھ لیجئے "ہماری پسند آپ کو شاید اچھی نہ لگے۔"

"میں کون ہوتی ہوں پسند ناپسند کرنے والی' مجھے خدا کے واسطے پاپا کے پاس پہنچادیں۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"کچھ ہونے میں کونسی دیر لگتی ہے۔ ابھی چند لمحے بعد آپ دیکھیں گے کہ آپ کے سامنے بہت کچھ ہوگا اور آپ بول بھی نہیں سکیں گی۔" وہ بڑا ٹھہر ٹھہر کر بولے۔

"میرا کیا ہے...... کچھ بھی ہو فرق نہیں پڑتا۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"اب اگر ہم لڑکی پسند کرلیں تو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟" انہوں نے پوچھا تو اس نے رضامندی میں گردن ہلادی۔

"او کے تو سن لیجئے کہ ہمیں جو لڑکی پسند تھی اور ہے ہم بھی اس لڑکی کو پہلی اور آخری پسند ہیں کیونکہ اس نے ہماری خواہش کا اظہار لباس پہن کر کردیا ہے۔ انہوں نے لہک لہک کر کہا تو وہ بری طرح چونکی کبھی انہیں دیکھا اور کبھی لباس کو۔

"حیران مت ہوں آپ کا لباس زیب تن کرنا' سجنا سنورنا اس بات کا غماز ہے کہ آپ ہماری دلہن بننا چاہتی ہیں...... ورنہ......؟"

"کیا' کیا؟ آپ سمجھتے ہیں کہ میں ایسا چاہتی ہوں۔" اس نے بھنا کر درمیان سے فقرہ کاٹا۔

"سنئے آپ اس کے علاوہ جو چاہتی ہیں اور جو پہلے دن سے چاہتی تھیں ہم وہ بھی بتاتے ہیں۔ دراصل ہم جیسے بانکے سجیلے نوجوان کو دیکھ کر ہر خوبرو لڑکی یہی چاہ سکتی ہے کہ ہم دن رات پیار سے اسے دیکھیں' چاہیں' سراہیں'

"نہیں' نہیں غلط ہے یہ سب" ان کے بے لگام بولنے سے اس نے چیخ کر روکا یہ سچ ہی تو تھا...... مگر اعتراف کیسے کرتی......؟"

"خاموش' بہت بولتی ہیں آپ' اگر یہ نہیں چاہتیں تو کیا چاہتی ہیں آپ؟" انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔

"کیا آپ ایسا سمجھتے ہیں؟"

"ابھی بتا نہیں سکتے۔ چند منٹ' چند لمحے انتظار کیجئے جان حیات' قاضی صاحب پہنچتے ہی ہوں گے ان کے کام کے بعد ہم فوراً اپنا کام شروع کر دیں گے۔" ان کا چہکنا تھا کہ وہ سر پکڑ کے ان کے بازوؤں میں جھول گئی۔

"ارے رے 'ابھی نہیں' بابا ابھی تو قاضی صاحب کے سامنے ہاں کرنی ہے۔" وہ پریشان ہو گئے۔

"میرے پاپا' آپ ایسا میری مرضی کے خلاف"......وہ بجلی کی طرح لہرائی اور ہاتھ جھٹک کر دور جا کھڑی ہوئی۔

"حضور سن تو لیجئے کہ وہ آپ کے پاپا حضور ڈرائنگ روم میں آپ کے منتظر ہیں ہم نے اپنی شادی کے مبارک موقع پر انہیں۔ خصوصی طور پر بلایا ہے۔

پھر واقعی ان کے کہنے کے مطابق قاضی صاحب آئے بھی چلے بھی گئے۔ وہ ہاں کے سوا کچھ نہ کہہ سکی...... پاپا کو پہلی بار دیکھا ان کے گلے سے لپٹ کر خوب رونا چاہتی تھی کہ انہوں نے شفقت سے خاموش کرا دیا۔

"اب ہم پرمٹ حاصل کر چکے ہیں لہٰذا فوری طور پر آپ کی ایک خواہش کا احترام کرنا چاہتے ہیں۔" وہ شوخی سے اسے بانہوں میں بھر کے بولے......

"اللہ ابھی تو صبر کیجئے۔" وہ بمشکل کسمسا کر آزاد ہوئی۔

"اب تو مانتی ہیں آپ کہ آپ کیا چاہتی تھیں؟"

"مان لیا بابا۔ آپ بڑی چیز ہیں۔ آپ نے پاپا کو بھی مشن میں شامل کر لیا۔" وہ شرارت سے بولی۔

"اچھا کیا نا......؟" وہ ہنس کر بولے تو واقعی سچے دل سے وہ دوڑ کر ان کے سینے میں سما گئی۔

خاموش

"لگتا ہے بہت خوش ہو توصیف رضا سے منگنی ہونے پر۔" نیرا نے شرارت سے کہہ کر مسکراتی ہوئی دھنک کو دیکھا جو یکلخت افسردہ سی ہو گئی۔

"سچ کہتی ہو تم میں واقعی بہت خوش ہوں۔" اس نے زبردستی ---- مسکرانے کی کوشش کی۔

"اچھا بابا خوب جشن مناؤ' لکی ہو' سبحان اللہ توصیف رضا کی کیا بات ہے؟" نیرا نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"نیرا! توصیف رضا تمہارے خیال میں بہت اچھے ہیں؟"

"صرف اچھے ہی نہیں بلکہ بہت اچھے' قسم سے عیش کرو گی میری جان۔" نیرا نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ دھنک کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟" نیرا نے کریدا۔

"کچھ بھی نہیں' توصیف رضا تو میرے آئیڈیل ہیں۔" اس نے تیزی سے کہا۔ نیرا مطمئن ہو گئی۔

"اچھا تم یہ بتاؤ کہ تمہارے مجازی ٹینک کا کیا حال ہے؟"

"ان کی نہ پوچھو' آج کل اسمارٹ ہو گئے ہیں۔" نیرا اس کے مذاق کو یکسر ٹال گئی۔

"شکر ہے کہ ٹینک بھی سمارٹ ہوا۔" اس نے دوبارہ چھیڑا۔

"کیا بک بک کئے جا رہی ہو' میرے شوہر نامدار کے بارے میں۔" اب کے نیرا پھٹ ہی پڑی۔

"نیرا! اللہ قسم انہیں دیکھ کر میری ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔" دھنک کو یہ پیاری سی سہیلی چیختی چلاتی ہوئی بہت اچھی لگتی تھی۔

«خیر کوئی بات نہیں دیکھ لیں گے توصیف رضا کو، شادی ہونے دو۔» نیرا نے پرس اٹھایا اور تیزی سے کھڑی ہوگئی اور اس نے شرارت سے ٹکڑا لگایا۔

«ارے میرے توصیف رضا جیسا تو کوئی ہے ہی نہیں۔»

«کیا تمہارے کزن حماد خان بھی نہیں۔» نیرا نے گویا اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ مسکراتی، مسکراتی زرد ہوگئی۔

«ہاں وہ بھی نہیں۔» لہجہ شکست خوردہ سا تھا پھر نیرا خاموشی سے چلی گئی اور اسے برہا کی آگ میں جلا گئی۔ نیرا نے اس کے دل کا ایک، ایک تار چھیڑ دیا۔ دل میں چھپا وہ درد آج پھر جاگ اٹھا جو کچھ عرصے سے اس نے توصیف رضا کی تصویر کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ نیرا نے اس کے دل کے خاموش سمندر میں پتھر پھینک کر طغیانی پیدا کردی تھی۔ وہ سسک اٹھی۔ «کاش! حماد خان تم میری سچی محبت کو سمجھ سکتے، سمجھتے تو تم تھے لیکن تم نے نہ سمجھنے کا اظہار کیا تھا۔ تم نے تو کبھی اتنا بھی نہ کیا کہ نظریں اٹھا کر میری خوابوں سے بھری آنکھیں دیکھتے تم تو اپنے خول میں سمٹے ہوئے تھے، مجھے یقین ہے تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو گے لیکن اظہار سے ڈرتے ہو۔ میں نے تم سے بے لوث محبت کی تھی لیکن تم بزدل ہو، مجھے نفرت ہے تم جیسے مردوں سے، نفرت ہے، نفرت ہے۔

» وہ ہچکیاں لیتی، لیتی غنودگی میں ڈوبتی......... چلی گئی۔

دھنک، اپنے نام کی طرح پیاری، شوخ چنچل سی تھی۔ بچپن..... میں بھی اپنی شرارتی طبیعت کی وجہ سے ہر ایک کی توجہ کا مرکز ہوتی تھی۔ خوبصورت فراک پہن کر اٹھکیلیاں کرتی ہوئی وہ امتیاز خان کو اتنی پیاری لگتی کہ وہ بے ساختہ اسے چومنے لگتے۔ امتیاز خان کی دراصل وہ چہیتی اور اکلوتی اولاد تھی، کافی عمر میں، بڑی منتوں مرادوں سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کی وسیع جائیداد کی واحد مالک تھی۔ امتیاز خان کی بیوی، بیٹی اور چھوٹے بھائی اشفاق خان اور ان کے بیٹے حماد خان کے سوا تھا ہی کون، اشفاق خان انہی کے ساتھ رہتے تھے۔ حماد خان کی پیدائش پر بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس لئے انہوں نے دوسری شادی نہیں کی یہی وجہ تھی کہ ان کی بھی واحد اولاد حماد خان تھی۔ دونوں .... بھائیوں میں بے انتہا محبت تھی۔ کسی چیز میں فرق نہیں تھا۔ کاروبار بھی دونوں مشترکہ تھا۔ دونوں بچے، پورے گھر کی آنکھ کا تارا تھے۔

حماد، دھنک سے چار سال بڑا تھا۔ اپنے اندر ہی چھپا ہوا کتابوں میں گم، کمرے میں بند، جبکہ دھنک اس سے معصوم، شرارتیں کرنے کی کوشش کرتی ادھر، ادھر پورے گھر میں اسے تلاش کرتی پھرتی حماد کو کھیل سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو بس ہر کام مشینی انداز میں وقت پر کرلیتا اور پھر کتابیں ہی کتابیں۔ اسے بچوں کی طرح کھیل کود سے لگاؤ نہ تھا۔ اور نہ ہی دھنک کی ہمراہی کی پرواہ تھی۔ ایک دھنک ہی تھی جو اس کی دیوانی تھی۔ کیونکہ بچے، بچوں کے ساتھ ہی خوش ہوتے ہیں۔ ان کے گھر میں وہ دو ہی تھے لیکن الگ، الگ بچپن کے علاوہ جوانی میں بھی وہی کچھ ملا جو بچپن میں دھنک کے ساتھ ہوا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ حتیٰ کہ دونوں بچے جوان ہوگئے۔

حماد خان اب کڑیل وجیہہ جوان تھا۔ بی اے کا امتحان دیا تھا۔ دھنک نے تو جوان ہوکر پھولوں کو بھی شرما دیا تھا۔ وہ چٹکتی ہوئی کلی کی طرح تھی۔ اس میں ابھی تک وہی لاابالی پن تھا۔ مسکراہٹیں تھیں، شوخیاں تھیں۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں اب بھی حماد خان کی تلاش تھی اب بھی وہ اس سے بات کرنے کو ترستی تھی اور کمرے، کمرے کونے، کونے میں تلاش کرتی رہتی۔ وہ اس کے قرب کی متمنی تھی مگر حماد کی سنجیدہ روش نہ بدلی۔ گھر کے افراد سے بھی کم ہی اس کی ملاقات ہوتی تھی۔ پڑھائی اور پھر سوشل ایکٹی ویٹیز میں مصروف، یہ بات بھی نہیں تھی کہ وہ بدمزاج تھا۔ اکھڑ تھا، بلکہ وہ کم گو تھا، تنہائی پسند تھا۔ دھنک کے لئے اس کے دل میں نرم، نرم جذبے موجود تھے لیکن اس نے انہیں سختی سے دبا رکھا تھا۔ دھنک کو اس کے اس رویے سے سخت الجھن ہوتی تھی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ حماد اس کے ساتھ شوخیاں کرے۔ مگر حماد میں تو ان باتوں کا شائبہ تک نہ تھا جبکہ دھنک کا آئیڈیل ایک مضبوط اور .... نٹ کھٹ سا ضدی نوجوان تھا۔ حماد میں یہ باتیں بے شک نہیں تھیں لیکن اسے آس تھی کہ ایک دن وہ اس کی محبت کا اقرار کرے گا۔ وہ اپنی سہیلیوں میں حماد کا ذکر کرتی رہتی تھی۔

اس کی امید، ناامیدی میں بدلتی جارہی تھی کیونکہ حماد میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ ابھی کل ہی کی بات تو ہے کہ وہ سخت جھنجلا گئی۔

ہوا یوں کہ کالج سے چھٹی تھی۔ امی کسی ملنے والی کے یہاں چلی گئی تھیں۔ وہ گھر میں تنہا تھی۔ سخت بور ہورہی تھی۔ حماد اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے آہستہ سے اندر کمرے میں

قدم رکھا۔ وہ کوئی کتاب لئے میز پر جھکا ہوا تھا۔ گرے رنگ کے شلوار سوٹ میں بہت پیارا لگ رہا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔

"بیٹھ جاؤں؟" اس نے کمرے کا گہرا سکوت توڑا۔

"ضرور۔" اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔ وہ کرسی پر ٹک گئی۔

"میں مخل تو نہیں ہوئی؟" اس نے اسے منہمک دیکھ کر جل کے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" اسی انداز میں جواب دیا گیا ہے۔ وہ دل ہی دل میں کھول کے رہ گئی۔

"انکل کا پتہ ہے کہاں ہیں؟" اس نے موضوع بدلا۔

"مجھے علم نہیں ہے۔" مختصر سا جواب ملا۔

"حد ہوگئی دنیا جہان کا علم تو آپ رکھتے ہیں لیکن کسی کی ذات..... کا علم بھی رکھ لیا کریں۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"جی۔" اس نے آہستہ سے پہلی مرتبہ پلکیں اٹھائیں۔ بڑی' بڑی آنکھوں میں کیسا سحر تھا وہ ڈول سی گئی۔

"جی۔" وہ تیزی سے کہہ کر کمرے سے نکل آئی لیکن آج اس کی یہ تمنا تو پوری ہوگئی کہ وہ چند لمحے ہی سہی اس کی طرف دیکھے تو سہی۔

☆ موسم بہت دلفریب ہو رہا تھا۔ آکاش پر جھکے' جھکے بادل مہکتی ہوئی ہلکی' ہلکی ہوا بہت بھلی لگ رہی تھی۔ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے' ساتھ' ساتھ چائے چل رہی تھی۔ ایسے میں دھنک بھلا گھر میں کیسے رہ سکتی تھی۔ فوراً آؤٹنگ کا پروگرام بنالیا۔ امتیاز خان نے تو مصروفیت کا کہہ کر ٹال دیا۔ اشفاق چچا نے اسے حماد خان کے ساتھ جانے کو کہہ دیا۔ کیونکہ آج حماد ان کے درمیان نظر آرہا تھا۔ اس نے فوراً چونک کر باپ کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"سوری ڈیڈی! مجھے کچھ کام ہے۔"

دھنک غصے سے انگارہ بن گئی۔

"اچھا ایسے کرو' دھنک بیٹی! اپنی کسی سہیلی کو بلالاؤ' ڈرائیور کو لے جاؤ۔" اشفاق چچا نے کہا۔

"رہنے دیجئے چچا! اب ضرورت نہیں رہی۔" اس نے تیزی سے کہا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

حماد نے بی اے کا رزلٹ نکلتے ہی یونیورسٹی میں داخلے کا فیصلہ کرلیا۔ بی اے میں اس کے فرسٹ کلاس نمبر آئے تھے۔ وظیفہ منظور ہوا تھا اس کی کامیابی پر دھنک قدرتی طور پر بہت خوشی محسوس کررہی تھی۔ اس نے ایک شرٹ خرید کر اسے گفٹ میں دی تو وہ بولا۔

"شکریہ' اس کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے گویا صاف انکار کردیا۔ وہ نفرت سے الٹے قدموں واپس چلی آئی پھر کئی روز تک اس نے اس کی شکل نہ دیکھی۔ حماد کے رویئے کو وہ کچھ بھی تو نام نہیں دے سکتی تھی۔ وہ اس سے نفرت بھی نہیں کرتا تھا کیونکہ اس کے لہجے میں جو نرمی اور گہرائی تھی نظروں میں جو چمک تھی وہ تو محبت کی علامت تھی لیکن وہ ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔

"اگر محبت ہے تو پھر یہ بیگانگی کیوں؟ لاپرواہی کیوں؟ وہ خود سے سوال کرتی لیکن اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

پھر وہ اس کو نظرانداز کر کے کالج کی پڑھائی میں مصروف ہوگئی۔ اس گھر کے اندر اور باہر ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ مگر اس نے اس آزادی سے کسی قسم کا غلط فائدہ اٹھانے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔

دھنک' کی سالگرہ ہونے والی تھی۔ کارڈ چھپ کر آگئے تھے۔ اس نے سب دوست احباب میں تقسیم کردیئے۔ کچھ کارڈ بچا کر حماد کے کمرے میں آگئی۔ وہ اخبار پڑھ رہا تھا کریم کلر کی پینٹ' سفید شرٹ میں گریبان کے بٹن کھولے۔ وہ بہت جاذب نظر اور لاپرواہ سا لگ رہا تھا۔ بے ساختہ وہ کھل اٹھی۔ پیازی سوٹ میں گلابی ہوگئی۔ آہستہ قدم آگے بڑھائے۔

"ہفتے کو میری سالگرہ ہے۔ یہ کارڈ ہیں' آپ اپنے دوستوں کو بلانا چاہیں۔" اس نے کارڈ اس کے پاس رکھ دیئے۔ دراصل وہ اسے یاددہانی کرانے آئی تھی کہ کہیں لاپرواہی کا مظاہرہ نہ کرے اور شریک نہ ہو کیونکہ اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ یوں بھی وہ گھر سے لاتعلق ہی رہتا تھا۔

"میں اپنا دوست خود ہوں یا پھر میرا علم ہے۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"ٹھیک ہے' کیا آپ بھی شریک نہ ہوں گے؟" وہ اس کی منطقی باتوں سے سخت گھبراتی تھی۔

"کوشش کروں گا۔" اس نے اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے کہا۔

"کوشش نہیں وعدہ۔" وہ ڈٹ گئی۔

"وعدہ....." اس نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔ وہ مطمئن ہوگئی۔

سالگرہ کی تیاری بڑے زوروشور سے ہو رہی تھی۔ ہر کام دھنک کی پسند سے ہو رہا تھا۔ اب تو سالگرہ میں ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ وہ شدت سے اس لمحے کی منتظر تھی جب حماد اسے مبارکباد دے گا۔ اس کے دل کی محفل کو رونق بخشے گا۔

آج تو کچھ سماں ہی اور تھا۔ ہر سو ہنستے مسکراتے نکھرے نکھرے چہرے تھے۔ لہراتے آنچل، خوشبوئیں بسی سانسیں، سب کچھ اتنا خوبصورت تھا کہ مدہوشی طاری ہوئی جارہی تھی۔ سب مہمان آگئے تھے۔ لیکن امتیاز خان اور بیگم امتیاز کچھ دیر اور انتظار کرنا چاہتے تھے تاکہ کوئی مہمان بھی شریک ہونے سے رہ نہ جائے اور واقعی ان کے بہت قریبی جاننے والے تو اب آئے تھے۔

"السلام علیکم۔" حسن رضا اور مسز رضا نے بیک وقت کہا۔

"خوش آمدید۔" امتیاز خان اور بیگم امتیاز نے خوش دلی سے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"توصیف بیٹے سلام کرو آنٹی، انکل کو۔" مسز رضا نے اپنے کھڑے ہوئے خوبرو نوجوان سے کہا۔ توصیف نے بڑھ کر آداب کہا۔

"جیتے رہو۔" دونوں نے دعا دی۔

"آیئے اندر تشریف لایئے، بس آپ کا ہی انتظار تھا۔" وہ انہیں لئے اندر آگئے۔

"بھئی ہماری بیٹی کہاں ہے؟" حسن رضا صاحب نے جلدی سے پوچھا۔

"جی یہیں تھی ابھی۔" بیگم امتیاز نے جواب دیا اور آوازیں دیتی ہوئی، مہمانوں کے درمیان آگئیں۔

"دھنک! دھنک بیٹے....."

"جی امی!" وہ جھکی جھکی بولی۔ سب کے درمیان ہلکے پنک کلر کی نفیس سی ساڑھی میں ملبوس، گہری چمکدار سیاہ زلفوں کو شانوں پر سنوارے میز پر جھکی توصیف رضا کی توجہ اپنی جانب مرکوز کر رہی تھی۔

"بیٹے دیکھو تو، پیچھے۔" امتیاز خان کے کہنے پر اس نے زلفوں کو جھٹک کر کھلی، کھلی آنکھوں سے جو دیکھا تو ایک خنجر سا توصیف رضا کے دل میں اتر گیا۔ اف اتنا مسحور کن حسن، وہ مبہوت سا رہ گیا۔ نیوی بلو سوٹ میں، وہ وجاہت سے بھرپور شاہکار لگ رہا تھا۔ وہ حیران نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"دھنک بیٹے! یہ انکل حسن رضا اور آنٹی ہیں اور یہ توصیف رضا ہیں۔" امی نے تعارف کرایا۔ اس نے اخلاقاً "سلام کیا لیکن توصیف رضا تو اس کے گلابی، گلابی سراپے میں گم تھا۔

"چلو بیٹے! اب چھری سنبھالو۔" امتیاز خان اور اشفاق چچا نے ایک ساتھ کہا۔ وہ سٹپٹا گئی۔ نظریں ادھر، ادھر بھٹک گئیں۔ وہ قاتل جان تو ابھی تک نہیں آیا تھا۔ جس کے لئے اس نے خود کو آراستہ کیا تھا۔ خوشبوؤں میں بسایا تھا۔

ابھی اس کی منتظر نظریں اردگرد بھٹک ہی رہی تھیں کہ وہ اپنی پوری وجاہت کے ساتھ آگیا۔ مہمانوں میں سب ان کی طرف متوجہ تھے۔ اشفاق چچا خوش ہوگئے۔ امتیاز خان بھی مسکرائے، توصیف رضا نے ایک بھرپور نظر ڈالی۔ دھنک نے سب سے اس کا تعارف کرایا اور پھر سالگرہ کی رسم ادا ہوگئی۔ فوراً ہی حماد خان نے اسے اپنے قریب بلایا اور کہنے لگا۔

"اب مجھے اجازت دیجئے، ایک جلسہ ہے۔"

وہ ایک دم دکھی ہوگئی۔ چہرہ متغیر سا ہوگیا۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے نکل گیا اور توصیف تھوڑی دیر بعد اس کے قریب آگیا۔

"ارے یہ چہرے کے گلاب کیوں مرجھا گئے؟" اس نے گہری نظروں سے دیکھا۔

"جی۔" اس نے تیز نظروں سے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ کے رخ روشن کی بہاریں ماند پڑ گئیں۔"

"آپ سے مطلب۔" وہ جل گئی۔

"گستاخی معاف، مس دھنک، ویسے تو آپ ہر روپ میں پیاری لگتی ہیں لیکن آج..... اس روپ نے مجھے فیصلہ کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔" اس نے مخمور لہجے میں کہا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" وہ بوکھلا سی گئی۔

"دھنک! اس وقت تو آپ رہنے دیں، پلیز..... ہم آپ کے مہمان ہیں کمپنی دیں۔"

"یہ سب میرے مہمان ہیں۔" اس نے .... اس کے ذو معنی فقرے پر کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن نوجوانوں میں تو میں ہی آپ کا حقیقی مہمان ہوں۔" اس نے فخر سے گردن اکڑائی۔

"میں کیا کہوں آپ کو۔" اس نے طنز سے کہا اور آگے جانے لگی کہ وہ آگے آگیا۔

"صرف اپنا کہہ دیں۔"

"منہ دھو رکھئے" وہ غصے سے کہتی ہوئی چلی گئی۔ وہ وہیں کھڑا مسکراتا رہ گیا۔

اگلے روز ہی حسن رضا اور مسز رضا رشتہ لے کر آگئے۔ تقریباً سب ہی چونک سے گئے۔ امتیاز خان اور بیگم امتیاز کو پہلی مرتبہ بیٹی کے جوان ہونے کا احساس ہوا۔ ان کی نظریں سوچ میں گم اشفاق چچا کی طرف اٹھ گئیں لیکن وہاں خاموش' ملال سا تھا۔ انہوں نے ان سے مہلت مانگ لی۔ وہ لوگ چلے گئے تو امتیاز خان نے کھل کر اشفاق چچا سے بات کی۔ انہوں نے حماد خان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ تو ...... ہمیشہ سے دھنک کو اپنی بہو کے روپ میں دیکھتے تھے لیکن حماد کی طرف سے مایوس تھے۔ مگر پھر بھی انہوں نے جیسے ہی بات آگے بڑھانے کی کوشش کی وہ جھٹ بول پڑا۔

"ڈیڈی آگے تعلیم کے لئے گورنمنٹ نے میرا اسکالرشپ منظور کر لیا ہے۔ میں بس ہفتے میں چلا جاؤں گا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم نے پہلے تو ذکر نہیں کیا۔ تم ہمیں اس قابل بھی نہیں سمجھتے۔" اشفاق چچا سخت غصے سے بولے۔

"معافی چاہتا ہوں۔ ڈیڈی! میں حتمی فیصلے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ میری یہ جرات کہاں۔" وہ ندامت سے بولا۔

"مگر تم جانا کیوں چاہتے ہو؟ کیا یہاں اچھی تعلیم نہیں۔ مجھے تنہا چھوڑ کے جا رہے ہو۔"

"ڈیڈی! یہاں تعلیم کا وہ معیار نہیں جو باہر ملک میں ہے پھر میں پانچ سال بعد آجاؤں گا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ڈیڈی پلیز! آپ اتنے دکھی نہ ہوں۔"

"نہیں بیٹے! تم جاؤ ضرور جاؤ لیکن ایسا کرو کہ شادی ......؟"

"نہیں ڈیڈی ابھی میرا ایسا ارادہ نہیں ہے۔" اس نے درمیان ہی میں ٹوک دیا۔ وہ بالکل خاموش ہوگئے اور امتیاز خان کو توصیف رضا کے لئے رضامندی دے دی۔ امتیاز خان کو بہت صدمہ ہوا۔ اشفاق خان کے اترے ہوئے چہرے سے وہ مایوس سے ہوگئے مگر بہرحال وہ اچھل پڑی اور صاف انکار کر دیا۔ ڈیڈی ممی نے وجہ پوچھی' وہ انہیں کیا وجہ بتاتی۔ جب وہ سنگ دل ہی اس سے لاپرواہ تھا۔ وہ جسے پیار کرتی تھی وہ اجنبی تھا' یا بن رہا تھا۔ اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ اس کے لب جڑ گئے' وہ حماد خان کا نام لینا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی' ہو سکتا تھا۔ وہ انکار کر دے۔

وہ خالی' خالی نظروں سے اجڑے' اجڑے روپ میں اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ آج وہ اس کے دل کی بات معلوم کرنا چاہتی تھی۔ حماد اس کی منزل تھے۔ مگر اب یہ منزل اس سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسی ارادے سے اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ باتھ روم میں تھا۔ دھنک کرسی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ تولئے سے بال خشک کرتا ہوا باہر نکلا اور اسے دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔

"میں نے سنا ہے آپ امریکہ جا رہے ہیں؟" اس نے بمشکل الفاظ اکٹھے کئے۔

"ٹھیک سنا ہے آپ نے۔" اس نے سنجیدگی سے نرم آواز میں کہا۔

"آپ نے بھی کچھ سنا ہے؟" اس نے ہلکے سے طنز سے پوچھا۔

"کس بارے میں؟" وہ بال سنوارتے ہوئے بولا۔

"میرے لئے پروپوزل آیا ہوا ہے۔"

"جی کیا؟" اس نے چونک کر دیکھا۔

"آپ کو اشفاق چچا نے نہیں بتایا۔"

"نہیں تو...... وہ تو مجھے شادی کا مشورہ دے رہے تھے۔"

"پھر' آپ شادی نہیں کر رہے۔" اسے موہوم سی امید ہوئی۔

"نہیں ...... فی الحال میرا شادی کا ارادہ نہیں۔ آپ بے شک شادی کر لیں' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس کے لہجے میں بہت زیادہ ...... ٹوٹ پھوٹ سی تھی۔

"یعنی آنے والے رشتے کے لئے ہاں کر دوں' کوئی برائی نہیں رشتے میں۔" اس نے آخری تیر پھینکا لیکن خطا ہوگیا۔

"مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں۔ میں تو اپنے لئے ہی کچھ نہیں مانگ سکا۔ کوئی راہ نہ نکال سکا تو بھلا آپ کو کیا بتا سکتا ہوں۔"

"کس نے منع کیا ہے آپ کو مانگنے سے 'منزل کی طرف بڑھیے۔" وہ بے اختیار بولی۔

"منزل تو شاید ہی ہے لیکن علم کا گھر مل جائے گا۔" اس نے دکھ سے مسکرا کر کہا۔

"میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ آپ کس مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ آپ اپنا حق نہیں مانگ سکتے' آپ میں اتنی جرات نہیں کہ زبان...... ہلا سکیں۔" وہ غصے سے کھڑی ہو گئی۔

"یہ بجا ہے' میں بزدل ہوں۔ مجھ میں جرات نہیں۔ مگر اس میں میرا کیا قصور یہ میرا ادب ہے۔ سعادت ہے' میں احترام کا قائل ہوں پھر بھلا کیا بولوں؟" اس نے آہستہ آہستہ کہا۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ اپنے کمرے میں نڈھال سی آ کر پڑ گئی۔ اس کے ارد گرد .... تمناؤں کے جال بکھر گئے۔ مگر یہ تو اس نے خود بکھیرے تھے۔ اس نے تو پوچھنے پر بھی دل نہیں کھولا تھا۔ نجانے کیوں؟ وہ چاہتا تھا بلکہ ٹوٹ کر چاہتا تھا لیکن آنکھوں میں جلتی ہوئی پیار کی مشعلوں سے ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ زبان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اظہار کرتی۔ پیار' دل اور نگاہوں تک محدود تھا شاید لیکن جھکی نظروں سے دھنک کیا سمجھے؟ وہ تو صاف' صاف اظہار چاہتی تھی۔ اور یہی وہ کر نہیں سکتا تھا۔

اس نے ساری رات روتے' روتے گزار دی۔ اسے آج اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ کم بخت پتھر کے لئے دل میں پیار پیدا کیا۔ آج اس کی ہر امید دم توڑ گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ مجھے نہیں چاہتا اس کو مجھ سے بالکل پیار نہیں ورنہ وہ مجھے کسی اور کا کیسے بنتا دیکھ لیتا' کبھی تو پیار کا اظہار کرتا لیکن وہ تو بالکل لاتعلق رہتا ہے۔

رات اسی طرح گزر گئی' دن بھر وہ کمرے میں بند سوچوں میں گھری رہتی۔ شام کے چار بجے کے قریب ملازم نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ گھر پر وہ اکیلی ہی تھی یا پھر حماد خان کمرے میں ہو گا۔ وہ بھیگی پلکوں کو صاف کر کے کپڑوں کی شکنیں درست کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

پھر توصیف رضا کو دیکھ کر وہ ٹھٹک سی گئی۔ وہ گہری نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ نروس سی ہونے لگی۔

منگنی کے بعد تو شاید ملاقات نہ ہو سکے۔ اسی لئے سوچا کہ آپ سے ملاقات کر لوں۔" وہ پرشوق نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

"کیا مطلب؟ منگنی....." وہ گڑبڑا کر جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں' اس مبارک جمعے کو ہماری منگنی ہو گی۔" وہ بولا۔

"وہ گم سم سوچوں میں کھو سی گئی تو صیف رضا کی آواز ارد گرد گونجنے لگی۔ کتنی جرات اور بے باکی تھی اس کے اندر۔ مگر میں تو یہ سب کچھ' ایسی ہی باتیں حماد سے سننا چاہتی ہوں لیکن وہ تو بے حس ہے' بزدل' کم ہمت' پیار کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ جبکہ توصیف کو دیکھو ایک دفعہ ملتے ہی کچھ سے کچھ بننے لگا' کیسے چوڑے سینے کو پھلا کر بول رہا تھا۔ بے شک بہت خوبصورت لگ رہا تھا پھر مجھے تو ایسے ہی بہادر انسان پسند ہیں۔ توصیف رضا واقعی ایک آئیڈیل شخصیت ہیں۔ جو اپنا حق لینا تو جانتا ہے۔ کیسے کھلم کھلا پیار کا اظہار کر دیا تھا۔ حماد جیسا پتھر تو مر کر بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ تو خود میں گھٹ گھٹ کر مر جائے گا لیکن کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ پھر...... پھر' میں کیوں ایک پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں۔ یہ بجا سہی کہ حماد خان کو میں بھلائے سے بھی نہیں بھول سکتی لیکن توصیف رضا کا اٹل فیصلہ بھی درست ہے۔ ماں باپ کی عزت بھی پیش نظر تھی وہ بیچ منجدھار میں گھر گئی تھی۔ ایک طرف اس کے بچپن کا پیار تھا تو دوسری طرف اس کا آئیڈیل' خوبرو بہادر توصیف رضا۔ اس کے سامنے دو پلڑے تھے وہ سخت پریشان تھی' توصیف رضا جا چکا تھا۔

ساری رات وہ خیالوں میں گم رہی۔ توصیف رضا کا پلڑا ہر طرح سے بھاری نظر آ رہا تھا۔ وہ مجبور و بے بس ہو کر اسی طرف جھک گئی۔ حماد خان کو اس نے دل کے اندر ایک خانے میں بند کرنے کی کوشش کی اور توصیف رضا کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ وہ اب توصیف رضا کے خیال سے مطمئن سی ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆

آج بہت گہما گہمی تھی۔ اچانک منگنی کی وجہ سے گھر والوں کے علاوہ عزیز و اقارب بھی پریشان تھے۔ ایک دن درمیان میں تھا' سب کچھ آج ہی ہونا تھا۔ سب کو فون پر اطلاع دے دی گئی۔ جن کے فون نہیں تھے وہاں ملازموں کو بھیج دیا تھا۔ بیگم امتیاز خان بے حد مصروف تھیں۔ اکیلی ہی الجھی ہوئی تھیں۔ حماد خان اپنی تیاری میں مصروف تھا اور دھنک بستر پر پڑی نہ جانے کن

سپنوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کا دل ہی نہ چاہ رہا تھا اٹھنے کو۔ وہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے وجود کا ایک حصہ کٹ رہا ہو۔ سب کچھ اس کی رضامندی سے ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی حماد خان کا دکھ اپنی جگہ تھا۔ وہ آج رات جا رہا تھا۔ اس نے منگنی میں شرکت سے بھی انکار کر دیا تھا۔

رات، جب ممی ڈیڈی، چچا اسے رخصت کر کے آئے تو وہ بے اختیار سسک اٹھی۔ آج حقیقت میں اس نے اسے کھو دیا تھا۔ وہ اس سے ہزاروں میل دور ہو گیا تھا۔ وہ خود ایئرپورٹ پر نہیں گئی تھی اور نہ ہی اس سنگدل کو اس کا خیال آیا تھا کہ آ کر مل ہی جاتا۔ وہ اس کے تصور سے گلہ کرتی رہی لیکن کیا حاصل صبح تو اس کی قسمت کا فیصلہ تھا۔

کوئی آئے یا جائے زندگی کا میلہ اسی طرح رواں دواں رہتا ہے۔ حماد خان چلا گیا تھا لیکن سب کام اسی طرح ہو رہے تھے۔ اس کے جانے کا دکھ اشفاق خان کو تھا یا پھر درد چھپا کر ہنستی مسکراتی دھنک کو، ورنہ ہر طرف مسرت ہی مسرت تھی۔ سب مہمان آ گئے تھے اور حسن رضا کی فیملی کے آتے ہی منگنی کی رسم ادا ہو گئی۔ ہیرے کی خوبصورت انگوٹھی، اس کی نازک سی مرمریں انگلی میں مسکرا رہی تھی، اس مسکراہٹ میں صرف ایک چہرہ تھا۔ حماد خان کا۔ اس نے شدت غم سے نچلا ہونٹ بھینچ لیا۔ توصیف رضا بہت خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔

منگنی کے بعد اس نے زیادہ تر توصیف کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنے فیصلے پر پچھتانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے حماد خان کو ایک پڑھی ہوئی کتاب کی طرح بند کر کے رکھ دیا تھا لیکن درد کی کسک تو ہمیشہ رہتی ہے پھر بھی وہ کچھ پرسکون ہو گئی تھی لیکن آج نیرا نے پھر سے بند کتاب کا ایک، ایک ورق کھول ڈالا تھا اور وہ مسلسل اشک بہا رہی تھی۔

راتیں آئیں اور گزر بھی گئیں۔ موسم بدلے، پھول کھلے، پت جھڑے۔ اس عرصہ میں وہ دھنک امتیاز خان سے، دھنک توصیف رضا بن گئی۔ اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو گیا۔ وہ تقریباً حماد خان کو بھول چکی تھی۔ اپنی نئی زندگی سے کافی مطمئن تھی۔ توصیف رضا کا بھرپور پیار اس کی جان تھا۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ حسن رضا، بیگم حسن رضا، اسے بیٹی کی طرح پیار کرتے تھے۔ وہ بھی ہر ممکن طور پر ان کی خدمت کرتی تھی۔ ان کا خیال رکھتی تھی۔

اس کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی۔ وہ اس کی تیاریوں میں بے حد مصروف تھی۔ توصیف رضا بھی بہت مصروف تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے کی سیٹنگ تبدیل کر کے پرانے پردے چادریں، کور، اتار کر نئے خوبصورت ہلکے پنک کلر کی چادریں اور پردے وغیرہ لگا رہی تھی۔

"گڈ، بیوٹی فل ڈیئر۔" توصیف رضا نے اچانک آ کر چاروں طرف پسندیدگی کی نگاہ ڈالتے ہوئے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیئے۔ وہ...... سٹول پر چڑھی ہوئی اپنے کام میں مصروف تھی۔ تیزی سے بل کھا کر اس کی طرف مڑ گئی۔

"شکریہ جناب۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے سارا انتظام کر لیا ہے۔ اس وقت تو میں آپ کو اطلاع دینے آیا تھا۔ دو قسم کی۔" اس نے اسے گود میں اٹھا کر بستر پر بٹھا دیا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"فرمایئے سرکار ہم ہمہ تن گوش ہیں۔" وہ شرارت سے بولی۔

"نمبر ون یہ کہ میں نے اتنا خوبصورت تحفہ تمہارے لئے خریدا ہے کہ تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔

"کیا ہے......؟" وہ تجسس سے بولی۔

"ابھی نہیں کل، ہاں تم نے ہمارے لئے کوئی تحفہ نہیں خریدا۔"

"ہم آپ کو اتنا پیارا انوکھا اور چاہنے والا تحفہ دیں گے کہ آپ کا تحفہ بھی ہیچ ہو گا۔" اس نے آنکھیں بند کر کے جواب دیا۔

"اچھا، دیکھ لیں گے، دوسری اطلاع یہ ہے کہ آپ کے کزن...... حماد خان کل رات بغیر اطلاع دیئے تشریف لے آئے ہیں۔ ممی کا فون آیا تھا۔"

"جی، حماد خان آ گیا ہے۔" وہ گھبرا کر بولی۔ چہرے کا تبسم لرزنے لگا۔ آنکھوں کے کنول مرجھا گئے۔

"کیا سوچنے لگیں؟" توصیف نے بغور جائزہ لیا۔

"کچھ نہیں بس، آپ مجھے کام کرنے دیں۔" وہ اٹھ کر تیزی سے کور بدلنے لگی اور توصیف رضا شوخ سی دھن بجاتا ہوا باہر نکل گیا اور اس کے ہاتھ چلتے، چلتے پھر رک گئے۔ حماد خان کا چہرہ چھپاک سے اس کی نظروں میں آ گیا۔

"تم حماد خان' کیوں آ گئے ہو' میری پر سکون زندگی میں ہل چل مچانے کے لئے۔ میں نے بڑی مشکل سے ضبط کے بند باندھے تھے۔ تم پھر ایک' ایک پرت کھولنے آ گئے۔ کاش تم نہ آتے مجھ سے اب حوصلہ نہیں تمہیں دیکھنے کا....... 'پہلے ہی ریزہ ریزہ ہو چکی ہوں۔ حماد خان میں بچپن سے ہی تمہارے قرب کی تمنا میں جلتی رہی ہوں' اب تو راکھ کا ڈھیر ہوں۔ نہیں میرا گھر توصیف رضا کا دل ہے۔ اب مجھے اس کے بارے میں نہیں سوچنا چاہئے' اس کے دل نے ملامت کی۔ وہاں مجھے کیا حق پہنچتا ہے جو میں اس کے بارے میں سوچوں' یہ توصیف کے حق میں بے انصافی ہوگی۔ مجھے نارمل رہنا چاہئے' جب اس نے ہی میرے متعلق کبھی نہ سوچا تو پھر میں کیوں تڑپوں لیکن کیا کیا جائے' پاگل من مانتا ہی نہیں۔ اس کے نام پر ہی میں اس کے تصور کی طرف کھنچی چلی جاتی ہوں۔ اے اللہ تو مجھے سکون دے' مجھے ہمت دے' میرے اندر صبر کا حوصلہ پیدا کر مجھے سیدھی راہ دیکھا۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

اگلے روز وہ واقعی بڑی جرات' ہمت سے سب کچھ فراموش کر کے سالگرہ کے لئے توصیف رضا کی لائی ہوئی ڈارک گرین کامدار ساڑھی میں سولہ سنگھار کئے' اپنے شریک سفر کی سنگت میں مسکرا مسکرا کر مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی لیکن جیسے ہی 'ممی' ڈیڈی' چچا اشفاق کے درمیان اس سنگ دل کا چہرہ نظر آیا۔ وہ سب کچھ بھول کر اس کے اجڑے' اجڑے' خزاں جیسے سراپے میں کھو گئی۔ آج جو حماد خان اس کے سامنے تھا وہ بالکل مختلف تھا۔ بیمار' بیمار لگ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مزید بکھر گئی تھی۔ آج بھی نظریں اسی طرح جھکی ہوئی تھیں۔ وہ دم بخود تھی کہ توصیف نے چونکایا۔

"دھنک! اندر بھی جانے دینا ہے یا کہ نہیں۔"

وہ خجل سی ہو کر سنبھل گئی۔

"کیا حال ہے آپ کا؟" اس نے رسماً" پوچھا۔

"اپنے دل سے پوچھو۔" وہ آہستہ سے کہہ کر اندر بڑھ گیا۔ توصیف دوسری طرف متوجہ تھا۔ اس کے لہجے کا کرب اور نظروں کا اضطراب صرف اس کے دل پر بجلیاں سی گرا گیا۔ شکستہ قدموں سے وہ مہمانوں میں سمٹ گئی لیکن بھٹکی ہوئی روح کو قرار کہاں؟

وہ بڑی مضطرب سی سارا وقت پھرتی رہی۔ اندر کا غم دبا کر مسکراتی رہی لیکن مایوس اور افسردہ حماد خان اس کے سامنے تھا۔ وہ اس کے دل میں مچلتے درد کو محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اس کے درد کی دوا اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ آج بھی خود میں گم تھا۔ جھکی نظروں والا حماد خان اور پھر اس نے تو خود راہیں جدا کی تھیں۔ ہو سکتا ہے وہ کسی اور وجہ سے پریشان ہو۔ اتنا یقین ہے وہ میرے لئے اداس نہیں' اس نے خود کو تسلی دی۔

تقریب کے اختتام پر وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ ممی' ڈیڈی سے بھی نہیں ملی۔ توصیف ہی ان سے باتوں میں مصروف رہا تھا۔ وہ بستر پر گر کے لمبے' لمبے سانس لینے لگی۔ حالت عجیب تھی' ذہن سخت بوجھل تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

ہیلو' جی ممی۔" اس نے جلدی سے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"دھنک! ٹھیک تو ہو بیٹی؟" ممی دلار سے بولیں۔

"بالکل ممی!"

"کئی روز ہو گئے تمہیں دیکھے ہوئے' حماد کو سخت بخار ہے' میں اسی وجہ سے آ بھی نہیں سکی۔"

ممی نے بتایا تو وہ گھبرا اٹھی۔ دل سے ایک ہوک اٹھی۔

"کب سے ہے بخار؟" وہ بمشکل بولی۔

"تین چار روز ہو گئے۔"

"اچھا میں شام کو توصیف کے ساتھ آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے ہم انتظار کریں گے۔" ممی نے فون بند کر دیا اور وہ شرمندگی سے ریسیور ہاتھ میں پکڑے سوچے جا رہی تھی۔ سالگرہ کے بعد دوسرے دن کھانے کے سوا حماد سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ تو خود جانا نہیں چاہتی تھی۔ ورنہ ممی' ڈیڈی' اشفاق چچا سے ملنے کے لئے تو روز نہیں تو دوسرے روز ضرور جاتی تھی' اور اب ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ وہ منہ چھپائے ہوئے بیٹھی تھی مگر اب حماد کی وجہ سے ضروری جانا تھا۔

تین بجے کے قریب اس نے توصیف رضا کو فون کیا لیکن وہ اس وقت بہت مصروف تھا۔ رات ہوٹل میں ایک پارٹی کے ساتھ ڈنر تھا۔ اس نے یہ کہہ کر اسے اجازت دے دی۔

"ڈیئر! تم امی جان کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں واپسی پر رات کو لیتا آؤں گا۔"

اور پھر وہ امی جان کے ساتھ تقریباً پانچ بجے ممی کی طرف آ گئی' سب سے پہلے اشفاق چچا ملے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ اس نے سلام کر کے حماد کے بارے میں پوچھا۔

"بیٹی! پاگل ہو گیا ہے وہ۔ دوا تو کھاتا نہیں پھر بھلا بخار کیسے اترے گا۔ میری کچھ سنتا ہی نہیں۔ میں تو تباہ ہو گیا ہوں۔" وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولے۔

"آپ فکر نہ کریں' وہ ٹھیک ہو جائیں گے میں انہیں سمجھاتی ہوں۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور سیدھی اس کے کمرے میں آ گئی۔ وہ اکیلا خاموش لیٹا کسی کتاب کو پڑھ رہا تھا۔ الجھے' ...... بے ترتیب بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ ناف تک کمبل اوڑھے وہ کافی کمزور لگ رہا تھا۔ وہ قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے سرخ' سرخ آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کیا حال بنا رکھا ہے آپ نے؟ انکل آپ کی شکایت کر رہے تھے۔"

"وہم ہے ان کا' میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے اس کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ جھانکنے کی کوشش کی۔

"آپ غلط کہتے ہیں۔ اتنا تیز بخار' یہ سب کیا ہے؟"

"کہا نا' وہ باپ ہیں انہیں محسوس ہوتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن حماد بھائی! آپ کو دوا کھانی چاہئے۔" اس کے کہنے پر اس نے بے ساختہ اسے دیکھا۔ وہ جلدی سے نظریں جھکا کر بولی۔ "پہلے ہی آپ کی طرف سے انکل فکرمند رہتے ہیں آپ انہیں مزید..... پریشان نہ کریں۔"

"ہاں! لیکن میری بیماری کی دوا کسی کے پاس نہیں۔" اس نے دکھ سے کہا۔

"بہر حال آپ کو دوا کھانی ہوگی۔" اس نے ذرا تحکم سے کہا۔

"ضروری ہے۔" وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔

"جی' حماد بھائی! آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہئے۔ آپ تو برسوں کے بیمار لگتے ہیں۔"

"دھنک! میری حالت جو بھی ہے وہ میرے بس میں نہیں۔" اس نے شکستگی سے سر مسہری سے ٹکا دیا۔

"آپ کا ایک علاج ہے۔" اس نے شرارت سے کہا۔

"وہ کیا؟" اس نے نظریں اٹھائیں۔

"آپ' آپ حماد بھائی شادی کر لیں۔" وہ بے ساختہ کہہ کر اس کے چہرے کے تاثر جاننے کے لئے اس کی طرف دیکھنے لگی لیکن وہاں' دھند کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک مکمل خاموشی تھی۔ وہ بے چین سی ہو گئی۔

"آپ کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لیں اور بس۔" اس نے غم غلط کرنے کو کہا۔

"شادی! شادی اور میں' متضاد چیزیں ہیں۔ کوئی اور بات کرو۔" اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"آپ کی مرضی' میرا مقصد آپ کو خوش دیکھنا تھا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی......

"میں بہت خوش ہوں' تم فکر نہ کرو۔" اس نے خوشدلی کا مظاہرہ کیا۔

"اچھا یہ دوا پی لیجئے۔" اس نے میز سے دوا اٹھا کر اسے دی اور گلاس میں پانی دے دیا۔

اس نے خاموشی سے کھالی' وہ گلاس رکھ کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

وہ روز فون پر حماد کی خیریت معلوم کر لیتی تھی۔ اب اتنا فرق ہوا تھا کہ ہلکی' ہلکی حرارت تھی لیکن ہر وقت دھنک کے کہنے پر وہ دوا بھی کھا رہا تھا لیکن کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ اسے بیماری اندر سے کھائے جا رہی تھی۔ دن بدن کی کمزوری' اوپر سے اس کی لاپرواہی' سب پریشان تھے۔ اسی طرح دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ دھنک کے ہاں بیٹی نے جنم لیا۔ اسی دوران وہ بغیر ملے ہی لاہور چلا گیا۔ وہ وہیں رہائش اختیار کرنا چاہتا تھا۔ دھنک کو بہت صدمہ ہوا لیکن وہ تو ہمیشہ سے اپنی مرضی کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے باپ تک سے بھی رائے نہیں لیتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ بہت ادب کرتا تھا۔ پیار تھا اسے لیکن دل کی مجبوری کس سے کہتا۔ فوراً ہی فیصلہ کیا اور چل دیا۔ حالانکہ طبیعت اسی طرح تھی۔ اب تو بلکہ کھانسی کا اضافہ اور ہو گیا تھا۔ سب نے روکا لیکن وہ نہ رکا۔

وہ لان میں گھاس پر پاؤں پھیلائے 'ادھیڑ بن میں مصروف تھی۔ ننھی مہک آیا کے پاس تھی۔ وہ اکیلی ہی بیٹھی تھی کہ پوسٹ مین اندر آ کر اس کے پاس رک گیا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا ......اور کھڑی ہوگئی۔

"بیگم صاحبہ' یہ آپ کا پارسل۔"

"پارسل' کہاں سے آیا ہے؟" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"یہ آپ کے نام ہے۔ لاہور سے کسی حماد خان نے پارسل کیا ہے۔" اس نے تفصیل بتاتے ہوئے پارسل اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

وہ نظروں میں حماد خان کا تصور لئے بوجھل سی پارسل کو کھولنے لگی۔ ہاتھ لرز رہے تھے' دل دھڑک رہا تھا۔

پارسل میں مہک کے لئے فراک تھے۔ ایک سونے کی ننھی سی انگوٹھی تھی۔ ایک پرچہ تھا۔ اس نے جلدی سے پرچہ کھولا۔

دھنک! خوش رہو۔

مجھے بہت افسوس ہے کہ میں تم سے اور مہک سے مل کر نہ آ سکا۔ حالانکہ دل تو بہت چاہ رہا تھا لیکن تمہارے شہر نے اتنے غم دیئے ہیں کہ مزید یہاں کا نہ رہا۔ صبر کی سل رکھ کر سب کچھ چھوڑ آیا ہوں۔ ویسے میں یہاں بہت خوش ہوں۔ اگر آنے کو دل چاہے تو آنکھیں فرش راہ ہوں گی۔ ڈیڈی کا خیال رکھنا اور انہیں بھیجنے کی کوشش کرنا۔ مہک کے لئے حقیر سا نذرانہ قبول کر لینا۔

حماد خان!"

اس نے سختی سے پرچہ مٹھی میں بھینچ لیا۔ آہستہ سے چیزیں...... اٹھائیں اور ڈولتے قدموں سے کمرے میں آ گئی۔ خط سے اسے اس کی کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ یقیناً اس کی صحت خراب ہو رہی ہوگی۔ کسی کا اس کے پاس ہونا ضروری ہے۔ میں انکل کو مجبور کر دوں گی' اس نے سوچ کر ایک لمبی سانس لی اور آنکھیں موند کر بیٹھ گئی۔

پھر اس نے بڑے اصرار سے اشفاق چچا کو حماد کے پاس بھیجا۔ ورنہ انہیں شدید غصہ تھا لیکن اس کے کہنے پر وہ تیار ہو گئے۔ وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ اب اسے ان کے فون یا خط کا انتظار تھا۔ گھر سے ممی نے صرف اتنی اطلاع دی تھی کہ انکل خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔

کئی روز بعد اس نے مہک کے سب کام اپنے ہاتھ سے کئے تھے۔ وہ بھی ہمک ہمک کر ماں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے تیار کر کے دادی کو دے کر وہ کچن میں مصروف ہو گئی۔

توصیف آج خاصا لیٹ ہو رہا تھا۔ وہ کافی دیر سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ اسی لمحے توصیف رضا آ گیا۔

"سوری' بیگم جان! آج دیر ہو گئی۔" وہ تیزی سے آ کر اسے بانہوں میں بھرتے ہوئے بولا۔

"اچھا سرکار!" وہ خود کو آزاد کراتے ہوئے بولی۔

"جلدی سے تیار ہو جایئے' باہر کھانا کھائیں گے۔" وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔

"مگر......؟"

"اگر مگر کچھ نہیں۔" اس نے درمیان میں ٹوکا۔ وہ مسکراتے ہوئے پلٹنے ہی کو تھی کہ ملازم آ گیا۔

"بیگم صاحبہ جی' آپ کے گھر سے ڈرائیور آیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ممی' ڈیڈی آج رات لاہور جا رہے ہیں۔ حماد صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ مشینی انداز میں بولتا چلا گیا اور اس کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ چہرہ زرد ہو گیا۔ سر چکرانے لگا۔ توصیف نے پریشانی سے اسے پکڑ کر بستر پر لٹایا۔ اس کا دل زور' زور سے دھڑک رہا تھا۔

"کیا بات ہے دھنک؟"

"حماد کی طبیعت کو کیا ہوا؟" وہ روہانسی ہو کر الٹا سوال کرنے لگی۔

"پتہ نہیں اور کچھ انہوں نے کہلوایا نہیں میں پتہ کر آؤں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" وہ جلدی سے بولی اور وہ چلا گیا۔

ممی' ڈیڈی نے اسے مطمئن کر کے بھیج دیا۔ درحقیقت انہیں خود بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ بس طبیعت کی خرابی کا ہی علم تھا۔ اشفاق چچا نے صرف فون پر یہ ہی بتایا تھا۔ توصیف نے آ کر اسے تسلی دی مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اگلے دو دن اس نے بڑی بے قراری سے گزارے بالآخر ممی' ڈیڈی کے نہ آنے کی وجہ سے وہ توصیف سے بولی۔

"توصیف' پتہ نہیں کیا بات ہے' ہم چلیں' صرف ایک دن کے لئے۔"

"ٹھیک ہے، ویسے تم اتنا پریشان کیوں ہو۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو گا۔" اس کے سرد ہاتھوں کو دبا کر کہا۔

"بس، میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن مہک کو چھوڑ کر جانا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے، اس کی دادی اماں سنبھال لیں گی۔" وہ اٹھ کر کپڑے نکالنے لگی۔

صبح پونے دس بجے وہ گھر پہنچے۔ صرف ممی گھر پر تھیں...... انہیں اچانک دیکھ کر گھبرا سی گئیں۔

"بیٹے بغیر اطلاع دیئے۔"

"ممی آپ کی لاڈلی نے سخت پریشان کر رکھا تھا۔" توصیف نے ہنس کر کہا۔

"اچھا کیا تم لوگ آ گئے۔ حماد بھی تمہیں بہت یاد کر رہا تھا۔" ممی کے لہجے میں بے پناہ کرب تھا۔

"کیسے ہیں وہ؟" وہ بے اختیار بولی۔

"تم خود دیکھ لینا۔" انہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"پھر بھی، ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"ٹی بی، حالت بہت خراب ہے۔"

"ٹی بی۔" وہ لرز اٹھی۔

"ہاں، اس نے شروع میں توجہ نہیں دی، مرض بڑھ گیا۔ بالآخر سینی ٹوریم میں داخل کرنا پڑا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ......" وہ سسک اٹھی۔

"نہیں بیٹے! اللہ کے کاموں میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ زندگی ہو تو تنکے میں جان ڈال دیتا ہے ورنہ۔"

"نہیں، نہیں ممی! ایسا نہ کہیئے۔"

"دعا کرو، اشفاق کی آنکھوں کا نور سلامت رہے۔ ورنہ وہ بھی مرجائے گا۔" ممی کی آنکھیں برسنے لگیں۔

"ڈیڈی اور انکل کہاں ہیں؟"

"حماد کے پاس۔" "تم ہاتھ منہ دھو لو میں ناشتہ تیار کرتی ہوں، پھر چلیں گے۔"

سینی ٹوریم کے باہر گاڑی سے اتر کر اس نے توصیف کو پھل لانے کے لئے بھیج دیا اور خود ممی کے ساتھ اندر چل دی۔ نیچے والی رو میں اس کا کمرہ تھا۔ اشفاق چچا باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے سلام کیا تو وہ...... سسک اٹھے، اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ بھی رونے لگی۔ کمرے سے ڈیڈی باہر آ گئے۔

"اب کیا حال ہے ڈیڈی؟" اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"رات سے بہت زیادہ خون تھوک رہا ہے۔" وہ شکستہ سے بنچ پر گر گئے۔

"اب آپ لوگ گھر چلے جائیں، میں یہاں ہوں، توصیف ہیں۔" اس نے سب کی گری، گری حالت دیکھ کر کہا۔

"نہیں بیٹے! تم سفر سے آئی ہو۔" اشفاق چچا نے کہا۔

"میں بالکل تازہ دم ہوں، آپ لوگ جائیے۔" اس کے مجبور کرنے پر وہ جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ ممی بھی ان کے ساتھ چلی گئیں۔ کیونکہ دوپہر کا کھانا تیار کرنا تھا۔

اس نے کمرے میں قدم رکھا تو کرب کی ایک لہر پورے جسم میں سرایت کر گئی۔ بستر پر لیٹے ہوئے حماد خان کو وہ پہچان بھی نہ سکی۔ بالکل زرد رنگت ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔ پہلے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ اس کی حالت پر وہ سسک اٹھی۔ کاش حماد تم اس حالت کو نہ پہنچتے۔

"حماد بھائی۔" اس نے ہولے سے پکارا تو اس نے بوجھل پلکیں تھوڑی سی اٹھائیں۔

"حماد بھائی میں دھنک ہوں دیکھیئے۔" اس نے دوبارہ کہا۔

"دھنک! تم آ گئیں، میرے پاس آؤ۔" وہ بے قراری سے بولا جیسے وہ اسی کا منتظر ہو۔ وہ اس کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ آپ نے کیا حالت بنالی ہے؟"

"میری حالت تو کچھ بھی نہیں ہے۔ بس میں ہار گیا ہوں۔" وہ دکھ سے بولا۔

"آپ ہارنے والوں میں سے نہیں تھے پھر۔"

"میں پھر بھی ہار گیا ہوں پتہ ہے کیوں؟ تم نہیں جانتیں اور میں نے کونسا تمہیں بتایا تھا۔" وہ ٹوٹے، ٹوٹے لہجے میں بول رہا تھا۔ وہ چپ رہی۔

"دھنک! ایک بات بتاؤ سچ، سچ۔"

"پوچھیے۔" اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

"تم مجھ سے پیار کرتی تھیں نا، بولو۔" اس نے بے ساختہ پوچھ لیا۔ وہ کانپ اٹھی۔

"حماد! کاش خود پر یہ ظلم نہ کرتی۔"

"پگلی، یہ ظلم تو میں نے بھی کیا ہے لیکن تم کیا جانو۔" اس نے گویا اس کے دل کی دھڑکن بند کر دی۔ آج پہلی مرتبہ وہ کیسی باتیں کر رہا تھا۔

"یقین نہیں آ رہا؟ میری یہ حالت دیکھ کر بھی۔" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"پھر، پھر آپ نے میری محبت کا جواب کیوں نہیں دیا۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں بدنصیب تھا لیکن میں محبت کا اظہار صرف نظروں سے پہچانا چاہتا تھا لیکن تم، زبان سے اقرار چاہتی تھیں۔ میرے نزدیک محبت وہ اعلیٰ و ارفع جذبہ ہوتا ہے جس کی اہمیت زبان سے کہنے سے ختم ہو جاتی۔ پیار تو آنکھوں سے چھلکتا ہے۔ تم یہ ہی چاہتی تھیں نا کہ میں تم سے محبت کا اقرار کرتا۔"

"آپ کے ذرا سے کہہ دینے سے کیا فرق پڑ جاتا؟"

"یہ میری غلطی ہے، تب ہی موت کی دہلیز پر کھڑا ہوں۔"

"شادی کی اجازت آپ نے اتنی خوش دلی سے دی تھی۔" اس نے گلہ کیا۔

"دھنک! لوگ کہتے ہیں کہ انسان کو کوشش کرنے سے سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے، میں بھی یہ سمجھتا تھا۔ میری زندگی کے دو مقصد تھے۔ ایک حصول تعلیم اور دوسرا تمہارا ساتھ لیکن ...... مجھے ایک ہی مل سکا۔ میں علم کے بعد محبت کو درجہ دیتا تھا۔ شادی کی اجازت میں نے توصیف کے پیار کی وجہ سے دی تھی۔ میں تو اس وقت علم کی منزل کا راہی تھا۔ تمہارا حصول بہت دور تھا پھر میں توصیف کو محروم کیوں رکھتا۔ میں نے اپنے دل پر پہرے بٹھالئے تھے کہ تمہیں بھلا کر ملک و قوم کی ترقی میں مصروف ہو جاؤں گا لیکن یہ راز آج مجھ پر کھلا ہے کہ پیار دنیا کا سب سے

زیادہ طاقت ور جذبہ ہے۔ محبت کے بغیر انسان مکمل نہیں، محبت لافانی جذبہ ہے۔ میں نے ضبط کے باوجود اس کا اظہار اس لئے کیا ہے کہ موت کے کنارے کھڑا ہوں، مزید یہ بوجھ اٹھا کر جانا نہیں چاہتا۔ دل سے پردے اٹھاتا تھے۔ گر ہو سکے تو میری قبر پر فاتحہ پڑھنے آ جایا کرنا۔" اس کی آواز میں اس قدر حسرت و یاس تھی کہ باہر کھڑے توصیف کی آنکھیں بھی بھر آئیں اور دل اس عظیم انسان کے لئے جھک گیا۔

"آپ کو کچھ نہیں ہو گا، میں آپ کو مرنے نہیں دوں گی۔" وہ زور زور سے ہچکیاں لینے لگی۔

"مجھے اب جینے کی تمنا نہیں، کیونکہ میں مکمل ہو گیا ہوں، علم انسان پر فرض ہے، میں نے اسے حاصل کیا ہے، محبت کی تھی اس کا اظہار کر دیا۔ یہ کافی ہے۔ میری دعا ہے توصیف تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ وہ اور زیادہ رونے لگی۔

"پلیز......! رو نہیں، مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ سسکیاں لیتی ہوئی باہر بھاگ آئی۔ توصیف کو کھڑے دیکھ کر زرد پڑ گئی۔ وہ ان کی باتیں سن رہا تھا۔

"آپ......؟" وہ خوف سے بولی۔

"دھنک کاش میں نے تمہیں نہ چاہا ہوتا۔ آج اتنا عظیم انسان موت کی دہلیز پر نہ ہوتا۔!"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ حماد کی اتنی بڑی قربانی، اف میرے اللہ! مجھے معاف کر دے۔" وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔

"اب وہ مر جائے گا۔"

"دھنک! آؤ اس اچھے انسان کے لئے اللہ سے زندگی کی بھیک مانگیں۔" دھنک تڑپ کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ آج تو، وہ توصیف کی عظمت کی بھی قائل ہو گئی تھی۔ اس نے سب کچھ سن کر تنگ دلی کا نہیں بلکہ وسیع القلبی کا اظہار کیا تھا۔ ان دونوں ...... نے صدق دل سے اللہ کے حضور رو، رو کے دعائیں مانگیں لیکن قبولیت کا وقت تو گزر چکا تھا۔ حماد خان تو لبوں پر مسکان

سجائے مکمل سکون کی نیند سو چکا تھا۔ اسے تو صرف دھنک کا انتظار تھا۔ دل کا بوجھ اتار کے خاموش ہو گیا تھا۔ پوری فضا اس کی موت پر سوگوار تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆

اعتبار کس کا

"گوشہ نشاط" میں آج بھی اتنی اداسی اور تنہائی تھی۔ جتنی روز ہوتی تھی۔ باہر کی ساری ٹھنڈک گویا اس کے اندر سے نکل کر چاروں اطراف پھیل گئی تھی۔ جیسی برف کے وجود پر جمی تھی۔ سخت اور جامد۔ اس کے احساسات و جذبات کے اندر ہی موت واقع ہو چکی تھی۔ نہ دل میں کوئی امنگ رہی تھی اور نہ آنکھوں میں چمک۔ ہر صبح کالج کی رونق میں گم اور ہر شام اسی طرح۔ اسی وقت باہر کی فضا میں اپنے بے وقعت وجود کی تلاش...... کھوج......... یہی سب کچھ کرنے کو تھا۔ لیکچرار ارتقاء سرفراز کے لئے........

"بیٹا' کوئی شاہ جمال میاں آئے ہیں۔" انابی نے گہرے جمود کو توڑا۔ وہ سنبھل کر بالکونی سے اندر آگئی۔

"کون شاہ جمال؟" اس نے پوچھا۔

انابی نے سردی کے پیش نظر تمام کھڑکیاں بند کر کے پردے برابر کئے اور کمرے کی لائٹ آن کر دی۔ ارتقاء نے جواب نہ پا کر پھر کہا۔

"انابی آپ جانتی ہیں کہ مجھے کسی سے ملنا اچھا نہیں لگتا۔"

انابی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر...... پھر کیوں آپ؟" وہ چڑ سی گئی۔

"ارے وہ بضد تھا میں کیا کرتی' پھر ملنے میں حرج کیا ہے' تمہیں کڑھ کڑھ کر مرنے نہیں دے سکتی۔ اس نے بیزاری سے ذہن پر زور دیا۔ بھلا کون ہو سکتا ہے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

آخر کو گرم شال اپنے گرد لپیٹ کر چند لمحوں میں وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔

آنے والی کی پشت اس کی طرف تھی مگر حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی وجیہ نوجوان ہے۔

"جی فرمایئے ؟" اس نے متانت سے پوچھا۔ وہ شخص پلٹا اور ہلکے سے سر کو خم دے کر مسکرایا مگر یہ کیا وہ تو درمیانی عمر کا انسان تھا۔ چالیس سال کے لگ بھگ عمر کا انسان۔ مگر اپنے وجیہ سراپے رنگ روپ کے باعث نوجوانوں سے مقابل ہونے کے لائق۔

"سلام عرض کرتا ہوں۔" وہ دھیمے سے بولا۔

"تشریف رکھیئے۔" ارتقاء نے سنجیدہ انداز میں کہا۔ وہ صوفے پر فوراً بیٹھ گیا۔

"میری بیٹی نے غلط نہیں کہا تھا آپ تو واقعی بے مثال ہیں۔"

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" اسے یہ بات اچھی نہیں لگی۔

"مجھے شاہ جمال کہتے ہیں، میرا اس شہر میں بڑا نام ہے۔" اب کی بار انہوں نے سنجیدہ طرز اختیار کی۔

"پلیز کام بتائیں۔" ان کی یہ تمہید اس کے لئے بیکار تھی۔

"اگر آپ کام سے مطلب میرا پیشہ پوچھ رہی ہیں تو میری ٹیکسٹائل ملز ہیں اور اگر آپ کام ......"

"شاہ جمال صاحب مجھے غیر ضروری باتوں سے نفرت ہے۔" وہ تقریباً چلا اٹھی۔

"مسز ارتقاء آصف علی، مجھے کوئی ضرورت آپ کے پاس لے کر آئی ہے۔" شاہ جمال نے چبا چبا کر کہا۔ وہ چونکی۔ وہ اس کے بارے میں اتنا جانتا ہے۔

"مجھے ارتقاء سرفراز کہتے ہیں۔ آپ اپنا کام بتائیں پلیز۔" قریب تھا کہ وہ غصے سے پاگل ہو جاتی۔

"مجھے یہ سب میری بیٹی تزکیہ نے بتایا تھا۔ وہ آپ کی اسٹوڈنٹ رہی ہے۔" شاہ جمال نے بتایا۔

"میری سٹوڈنٹس آتی جاتی رہتی ہیں آپ اپنا مقصد بتائیں؟" اس نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"آپ سے کوئی چھچھوری اور بے تکی بات کرنے میں نہیں آیا۔ اور میری عمر بھی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ تاہم مقصد بڑا نیک اور ضروری ہے۔"

وہ حیران تھی کہ یہ اجنبی شخص کیوں اس قدر اس سے الجھ رہا ہے؟

"پھر آپ اپنا مدعا بیان کر کیوں نہیں دیتے؟"

"اگلی نشست پر بیان کروں گا اب اجازت دیں۔"

وہ کچھ نہ کہہ سکی اور وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے سے باہر نکل گئے۔

ارتقاء سرفراز پھر بری طرح الجھ گئی کہ یہ کون تھا؟ کیا چاہتا تھا؟ اور اس قدر میرے بارے میں کیوں جانتا ہے؟ بیٹی سٹوڈنٹ تھی یہ تو بجا سہی مگر اس سے زیادہ۔ اف میرے خدا۔ سر میں ایک دم ہی درد محسوس ہونے لگا اور بمشکل تمام اپنے کمرے تک پہنچ پائی اور بستر پر گر گئی۔

☆ ☆ ☆ ☆

اس کی زندگی بھی عجب دھوپ چھاؤں۔ غم و خوشی کا سنگم تھی۔ امیر کبیر باپ کی اکلوتی لاڈلی ولاد۔ خوشیوں کے ہنڈولے میں صبح شام جھولنے والی ارتقاء کو کیا معلوم تھا کہ اس کی دولت اور بائیداد کا لالچ سگے چچا کو سفاک اور ظالم بنا دے گا۔ تعلیم سے فراغت پاتے ہی وہ اپنے اوباش بیٹے ارشتہ لے آئے گا۔ اور پھر انکار پر اس کے شفیق ماں باپ کو مروا ڈالے گا۔

دولت کے نام پر دھوکہ کھا کر ارتقاء سرفراز اتنی تبدیل ہو گئی تھی کہ ہر شخص سے نفرت ہو لی تھی۔ اگر لیکچرر شپ کا سہارا نہ ہوتا تو بے سہارا ہو چکی تھی۔ بے آسرا بھی ہو جاتی۔ صرف ںک کوٹھی ہی تو اس کے پاس بچی تھی۔ آصف علی نے سب کچھ لے کر اسے آزاد کر دیا تھا۔ یہ بھی نی تھا۔ زندگی کے چار کٹھن سال گزار کر بھی وہ اس مکروہ شخص کو بھول نہ سکی تھی۔ نفرت کی آنچ سے دھیمے دھیمے اندر سے سلگاتی رہتی تھی۔ کالج سے واپسی کے بعد سوائے انابی کے کون تھا جو ں کا غمگسار ہوتا۔

باہر کی تبدیلیوں نے اسے پتھر بنا دیا تھا۔ اکتیس سال کی عمر میں وہ پختہ عمر کی بن چکی تھی۔ کومل ے رنگ روپ نے بے رنگ، بے باس موسموں کی چادر اوڑھ لی تھی۔ اس کی شخصیت کے تلخ د سب پر عیاں تھے۔ اسٹوڈنٹس بات کرنے کے لئے حیلے بہانے تراشتی تھیں۔ لیکچر دینے کے وہ کسی سے کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ دراصل اس کے نازک احساسات نے آصف علی جو چوٹ کھائی تھی۔ وہ ناقابل فراموش تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آصف دولت کی ں میں اس کو، اس کی محبت کو پامال کرے گا۔ اس نے تو ہر بات بھول کر ماں باپ کی موت کو لر اسے چاہا۔ شوہر جان کر خدمت کی مگر وہ اس کا نہ بن سکا۔ آصف نے ہر مرد کا چہرہ دھندلا ما۔ یہ پہلا تجربہ تھا۔ جس نے ارتقاء کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔

بہت عرصے بعد وہ کسی مرد کے روبرو ہو کر بولی تھی۔ ورنہ وہ مرد سے ہمکلام ہونے کو تیار نہیں تھی۔

"ہنہ۔ سیٹھ صاحب کو نجانے کیا بیماری ہے' اور انابی ہر ایک کو بلا لیتی ہے۔" غصے میں وہ بڑبڑائی۔ ساتھ ساتھ انابی کو آوازیں دینے لگی۔

"انابی' انابی۔" انابی نے ہانپتے کانپتے کمرے میں پہنچ کر سانس لی۔

"آپ آئندہ کسی کو گھر میں داخل نہیں ہونے دیں گی۔"

"انابی نے اس وقت خاموش رہنے میں عافیت جانی کیونکہ اس وقت وہ خاصی ڈیپریس تھی۔ ایسی کیفیت میں انابی ہمیشہ اسے بھرپور سکون فراہم کرتی تھی۔ انہوں نے ٹھیک سے کمبل اسے اوڑھادیا اور پیار سے بولیں۔

"میں نے کھانے میں قیمہ شملہ مرچ بنائی ہے۔" وہ ان کے بہلاوے پر حسب عادت مسکرا دی۔

انابی ایک ماں کی طرح اسے سمجھتی تھیں۔ ان کی مہربان بانہوں میں چھپ کر وہ پرسکون سی ہو جاتی تھی۔ ایک وہی تو تھیں ہر مصیبت میں ساتھ' ساتھ اس کی تنہائیوں میں شریک۔ ورنہ اکیلی تو کڑھ کڑھ کر وہ کب کی ختم ہو جاتی۔

چائے کے آخری گھونٹ بھر کے اس نے پرس اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ ساتھ میں انابی کو آواز دی۔

انابی آواز پر آگئیں' مگر ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ لئے۔ یہ چوکیدار نے دیئے ہیں۔ کہتا ہے کوئی ڈرائیور دے گیا۔" اس کی پیشانی پر ہزار سلوٹیں نمودار ہوگئیں۔ ذہن میں فوراً کھلبلی مچ گئی۔ "کون دے گیا ہے؟"

"انابی' کوئی نام پتہ' آج کس کا دماغ خراب ہوا ہے۔" وہ چلائی۔

"ارے بیٹا' موا پکڑا کر چلتا بنا اب مجھے کیا معلوم کہ کون تھا؟"

"چوکیدار کو بلائیں۔" وہ گرجی۔ تھوڑی ہی دیر میں چوکیدار آموجود ہوا۔

"چوکیدار بابا یہ کون دے گیا ہے؟"

"کیا معلوم بی بی صاحب' پر چٹی سپید گاڑی پر آیا تھا۔" چوکیدار نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

"آئندہ آپ کسی سے کوئی چیز نہیں لیں اور گیٹ سے اندر نہیں آنے دینا۔"

چوکیدار کے جانے کے بعد اس نے انابی کو مخاطب کیا۔

"یہ باہر پھینک دو' اس سے مکاری کی بو آرہی ہے۔" تیزی سے وہ باہر نکل گئی۔ اس کا پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔ سارے راستے وہ تاؤ کھاتی رہی۔ اس قدر کوفت محسوس کر رہی تھی کہ اگر پھول بھیجنے والا نظروں کے سامنے آجاتا تو وہ سر پھاڑ ڈالتی۔

کالج کے گیٹ پر عین اس کی گاڑی کے سامنے سفید کرولا آگئی۔ اس نے غصے سے دیکھا' گاڑی میں شاہ جمال صاحب مسکرا رہے تھے۔ اسے فوراً سمجھ میں آگیا کہ پھول بھیجنے والا کون ہے؟ بھناکر اس نے گاڑی سے باہر نکل کر شاہ جمال کے قریب جاکر کہا۔

"Are You Mad"

"No"

"شاہ جمال صاحب' اپنی عمر' مرتبے کا پاس کیجئے' آپ کی یہ بے ہودہ حرکت میں کیا سمجھوں؟"

"میڈم! میں یہ سب باتیں اچھی طرح جانتا ہوں' مگر آپ سے ملنا' میری مجبوری ہے۔" شاہ مال نے مکمل سنجیدگی سے کہا۔

"شاہ جمال صاحب آپ کی کسی مجبوری سے میرا کیا واسطہ؟" میرا پیریڈ مس ہو رہا ہے۔"

ں نے غصہ ضبط کر کے کہا۔ ارد گرد کھڑے لوگ ان دونوں کو دلچسپ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"آج آپ چھٹی پر ہیں میں نے آپ کی چھٹی منظور کرا لی ہے۔ آپ پلیز تھوڑا سا وقت ے دیں۔ میں اس کے بعد آپ کی مرضی کے بغیر نہیں ملوں گا۔ پلیز تماشا نہ بنائیں۔" انہوں نے یت عاجزی سے کہا۔

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔" اس نے غصے سے کہا۔

"ارتقاء پلیز۔ تھوڑی دیر کے لئے۔" انہوں نے اس انداز میں منت کی کہ وہ جھنجلا کر ی میں جا بیٹھی۔ پہلے شاہ جمال نے اپنی گاڑی آگے نکالی اور پھر پیچھے اسے آنے کا اشارہ کیا۔

سیاہ چمکیلی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے شاہ جمال کی کار سفید دودھیا پتھر سے بنی عمارت کے ت سے اندر داخل ہوگئی۔ پھولوں اور سبزے میں گھری خوبصورت عمارت' جس میں گیٹ

سے پورچ تک کا فاصلہ تقریباً پانچ سات منٹ پر مشتمل تھا۔ وسیع و عریض، دیوہیکل عمارت میں داخل ہو کر وہ حیران سی چاروں طرف دیکھنے لگی۔ کوئی چھوٹی سی، ریاست معلوم ہوتی تھی۔ باوردی بھاگتے دوڑتے نوکروں کی فوج۔ ارتقاء کی گاڑی کا گیٹ خود شاہ جمال نے بڑھ کر کھولا اور باہر آنے کے لئے کہا۔ وہ فکر مند سی باہر آگئی۔

"قصر جمال آپ جیسے دلکش مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہے۔"

"مسٹر جمال، مہربانی کے ساتھ صرف مطلب کی بات کیجئے۔" اس نے رعونت سے کہا۔

"ضرور مگر مہمان نوازی کے بعد۔ چلئے اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" وہ ان کے ہمراہ چلتی ہوئی خوبصورت اور جدید آسائشات سے مزین ڈرائنگ روم میں آگئی۔ ڈرائنگ روم کیا تھا خوش رنگ چیزوں سے آراستہ عجائب گھر تھا۔ کوئی ملک ایسا نہ ہوگا جس کی بنی چیز "قصر جمال" کے ڈرائنگ روم کی زینت نہ ہو۔ ورنہ ہر خطے اور ہر ملک کی دیدہ زیب اشیاء سجاوٹ کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ اس کی حیران اور متجسس نظریں ڈرائنگ روم کی سجاوٹ پر جمی تھیں۔ شاہ جمال نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تشریف رکھیں میں کافی کا کہہ آؤں۔"

"مجھے طلب نہیں ہے۔" اس نے منع کیا۔ مگر وہ پھر بھی تیزی سے گئے اور تیزی سے واپس آگئے۔

"ارتقاء کیسا لگا ہمارا گھر؟"

"جی اچھا ہے..... مگر آپ؟"

"اسی طرف آرہا ہوں۔" انہوں نے اس کا مطلب بھانپ لیا۔

"میں آپ کو پرپوز کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ "کیا آپ کا دماغ درست ہے؟؟"

"بالکل....... مگر یہ میری مجبوری اور ضرورت ہے، مجھے آپ سے اچھا اور آپ کو مجھ سے بہتر ساتھی نہیں مل سکتا، مجھے بے جا قسم کی بناوٹ اور ریاکاری سے نفرت ہے، جو میرے دل میں آیا میں نے آپ کو بتادیا۔"

"کیسی بے تکی بات ہے آپ کی، آپ اس قدر بے تکلفی پر اتر آئے ہیں۔" اسے شدید حیرت اور غصہ تھا جبکہ شاہ جمال اتنے ہی مطمئن اور پر سکون........

"پلیز ارتقاء، میرے جیون کا سکھ بن کر یہاں چلی آؤ، آپ کی تنہائیاں بٹ جائیں گی۔" محبت سے بھاری ہاتھ اس کے شانے پر رکھا تو وہ واقعی خود کو محفوظ سمجھنے لگی۔ اس کی باتوں کا سحر تھا یا اس کی تنہائیوں کا خوف جو وہ بغیر کچھ کہے۔ تیز تیز قدموں سے باہر نکل آئی۔ وہ آوازیں دیتے پیچھے لپکے۔

"ارتقاء، ارتقاء پلیز میرے سوال پر ضرور سوچنا، ٹھیک تین دن بعد میں جواب کے لئے آؤں گا........ اور جواب مجھے مثبت ملنا چاہئے۔" گاڑی نکالنے سے پہلے، کھڑکی پر جھکتے ہوئے انہوں نے ٹھوس لہجے میں کہا اور وہ زن سے گاڑی نکال لائی۔

"انابی، انابی" اس کی آوازوں پر انابی کچن سے دوڑتی ہوئیں اس کے قریب پہنچ گئیں۔

"خیریت آج جلدی آگئیں بیٹا۔"

"انابی، میرے سر میں درد ہو رہا ہے، کوئی آئے، کسی کا ٹیلی فون ہو، میرا مت بتانا۔" اس نے ایک ہی سانس میں بات مکمل کی۔

"چائے بنادوں۔"

"نہیں، بس میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔" وہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

بستر پر گر کر وہ اور زیادہ بے چین ہوگئی۔ "یہ کیسا مقام آگیا ہے ارتقاء سرفراز۔ مرد کا یہ کون سا روپ ہے۔ اتنا شفیق اور ہمدرد۔ دو ملاقاتوں کے بعد اتنا انتہائی فیصلہ۔ زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ۔ پر نہیں ارتقاء سرفراز تمہیں کسی مرد کی ضرورت نہیں، تمہیں یہ فوب جان کر جھٹک دینا چاہئے۔ یہ سب دھوکہ ہے۔ تم بلا کی حسین ہو، معاشی پوزیشن بھی مستحکم ہے۔ ایک کروڑ پتی شخص کو تمہاری ضرورت کیوں پڑ گئی؟ پھر غیر شادی شدہ ہو کر بیٹی کا جھوٹ کیوں بولا؟" وہ زہر خند انداز میں بڑبڑائی۔

اس کے منع کرنے کے باوجود انابی چائے کا کپ لے آئیں۔ "کیا پریشانی ہے؟؟"

اس نے اٹھ کر کپ پکڑ لیا۔

"کچھ نہیں انابی۔"

"جھوٹ نہ بولو، سچ سچ بتاؤ۔"

"کوئی جھوٹ نہیں ہے۔"

"ارتقاء مجھ سے تمہاری کوئی بات پوشیدہ نہیں پھر۔" اور پھر وہ فوراً ہی کتاب کی مانند کھل گئی۔

"تمہاری کیا مرضی ہے؟" انابی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

"ناممکن، مردذات سے نفرت ہے مجھے۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"نہیں بیٹا، عورت اور مرد کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے، ضروری ہوتا ہے۔"

"جھوٹ، غلط، مضبوط اتنا کہ ایک لمحے میں، چند روپوں کے لئے ٹوٹ جائے۔" وہ چڑ کر بولی۔

"ارے وہ تو کم ذات تھا، ورنہ اتنی اچھی لڑکی کو کون چھوڑتا ہے۔" انابی نے کہا۔

"کچھ بھی کہو، میں اب شاہ جمال صاحب سے ملنا بھی نہیں چاہتی۔"

"خود ہی سوچو کہ اتنے امیر آدمی کو بھلا کیا لالچ۔ مجھے تو معقول آدمی لگتے ہیں اور یہ پہاڑ سی زندگی، میرے دکھ کو سمجھو بیٹی۔ ایسا مر مٹنے والا آدمی اچھا شریک سفر ثابت ہوتا ہے۔"

"ہنہ، تم بھولی ہو انابی، لالچ کئی قسم کے ہوتے ہیں اور لالچ کی آنکھ آپ یا میں نہیں دیکھ سکتے، کیوں کہ وہ تو اندھا ہوتا ہے کیا معلوم...... شاہ جمال کے من میں کیا ہو۔"

"سوچ لو، مجھے کوئی برائی نظر نہیں آتی، تمہاری تنہائی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی، بس اس دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہہ رہی ہوں۔" انابی کی آنکھیں بھر آئیں..... اور وہ ایک مرتبہ پھر نئے سرے سے سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

وہ ماں جیسی انابی کے دکھ کو اچھی طرح سمجھتی تھی...... ان کے اس احساس کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ بچپن سے ان کی آغوش میں اسے پناہ ملی تھی۔ وہ کہتی تو درست تھیں، ذات کی تنہائی کا زہر اتنا جان لیوا ہوتا تھا کہ غصے میں مردذات سے نفرت جاگ اٹھتی تھی۔ مردذات کا اعتبار ایک بار کھو چکی تھی۔ کسی دوسرے پر اعتبار کیسے کر سکتی تھی۔ مگر بقول انابی کے۔ ایسی عمر کا آدمی زیادہ اچھا شریک سفر ثابت ہوتا ہے۔ "تو ارتقاء سرفراز تمہیں شک نہیں کرنا چاہئے۔ تم جوان ہو، خوبصورت ہو

ور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ لڑکی ہو۔ تمہیں پناہ چاہئے، تمہیں تحفظ چاہئے۔ تمہیں شاہ جمال کی ات مان لینی چاہئے۔ اسی میں تمہاری باقی ماندہ خوشیوں کی زندگی ہے۔"

"نہیں میرا ذہن نہیں مانتا، میں پرسکون ہوں، اپنی مرضی سے اٹھتی ہوں، کھاتی ہوں، پیتی وں۔" اس نے خود کو جھٹلایا۔

"نہیں ارتقاء، تم ذرا اپنے فارغ لمحوں میں جھانک کر دیکھو، تم تنہا، اداس اور اکیلی کیوں ہو اتی ہو؟ بالکنی سے آسمان کی وسعتوں میں کیسے کھو جاتی ہو؟ یہ مان لو کہ تمہیں سہارے کی تلاش ہے، م اپنے ساتھ کسی کے قہقہوں کی متلاشی رہتی ہو۔ تمہاری بے بس سی زندگی کو کسی شجر سایہ دار کی لاش ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں۔" وہ بری طرح جھلا اٹھی۔

"تم ارتقاء سرفراز، شاہ جمال کو اپنا لو، دنیا میں شامل ہو جاؤ۔ یہ روکھی زندگی تمہیں چاٹ اۓ گی۔ کھا جائے گی۔ شاہ جمال کے ساتھ زندگی کے سب خوبصورت لمحات اپنے لئے مقید کر لو ....ہاں ارتقاء یہی عورت کی خوشی ہوتی ہے اور یہی پناہ....."

"انابی، انابی کھانا تیار ہے۔" ایک دم ہی اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور زوروں کی بھوک جاگ ی۔ وہ پھول کی طرح کھل اٹھی۔ یہ عورت بھی عجیب چیز ہے، کہ ایک ہی مرکز سے جی اٹھتی ہے ر ایک ہی سے مرجاتی ہے۔ مرد سے دھوکہ کھاتی ہے اور پھر بھی اس کے احساس سے گلرنگ ہو تی ہے۔ مرد کے تصور سے بیر بہوٹی بن جاتی ہے اور اس کی اذیت سے خزاں کا اداس رنگ تیار کر لیتی ہے۔ کتنی بھولی اور احمق ہوتی ہے۔ یہ تجربہ بار بار کرتی ہے۔ شاید قدرت نے اس ے دل میں مرد کی محبت اتنی زیادہ بھر دی ہے.......

انابی نے حیرت سے اس کے چہرے پر کچھ کھوجا اور پھر مسکرا دیں۔ "میں نے اپنی گڑیا کے ئے بہت اچھی چیز تیار کی ہے۔"

کھانا سامنے آیا تو ذہن کہیں اور تانے بانے میں الجھا تھا۔ نوالے منہ میں جا رہے تھے۔ پتہ ہی ں چلا اور وہ اچھا خاصا کھا گئی۔ انابی خوشی سے دیکھتی رہیں۔

شاہ جمال بڑی دیر سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انابی نے چائے پیش کی اور وہ گھونٹ نٹ بھر کر کپ ختم کر چکے تھے ارتقاء بالوں کو برش کرتے ہوئے وہ سب لفظ اکٹھے کر رہی تھی جو

ادا کرتے تھے۔ جب انتظار حد سے بڑھا تو وہ اس کے کمرے میں آگئے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے وہ صرف بیٹھنے کا اشارہ کر سکی۔

"لیکن وہ میں۔" لفظ بکھر گئے۔

"مجھے ہاں یا نہیں چاہئے ارتقاء سرفراز' میں جذباتی آدمی ہوں۔" انہوں نے مطلب کی بات کی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا کہ بغیر جان پہچان کے ایک غیر متوقع سی ملاقات کے بعد ایسا فیصلہ کیا معنی رکھتا ہے۔"

"ہم بزنس مین لوگ بالکل کھلے اور بے باک ہوتے ہیں۔ ادبی لوگوں کی طرح اپنے فیصلوں پر کڑھنے کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ایک دفعہ دیکھا' ملا اور فیصلہ کر لیا۔ آپ کو منظور ہو تو میری خوشی ہوگی۔" وہ تیزی سے بولتے چلے گئے۔

"میرا انتخاب ہی کیوں۔"

"اس بات کو چھوڑیں اور صرف آئینہ ہی دیکھ لیں' جواب مل جائے گا۔" وہ شوخی سے بولے اور وہ پہلی بار آہستہ سے مسکرا دی۔ یہ مسکراہٹ ہی رضامندی تھی۔ شاہ جمال لمحے میں سمجھ گئے۔

"ارتقاء جمال کالج اپنا استعفیٰ بھیج دو۔" انہوں نے فوراً اس کا نام اپنے نام سے جوڑ لیا۔ وہ خاموش ہی رہی۔

"آنے والا جمعہ اس نیک کام کے لئے مناسب رہے گا۔ یہ کوٹھی کرائے پر دے دی جائے گی۔ انابی ہمارے ساتھ رہیں گی۔" اور وہ ایسے چپ تھی جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ اتنی بولڈ اور تیز طرار ہونے کے باوجود وہ بالکل خاموش اور نرمی سے ان کی ہر بات مانتی جا رہی تھی۔

ہالیڈے ان میں سب ہی نے دیکھا کہ شاہ جمال کے پہلو میں بے مثال' حسین ترین دلہن کے روپ میں ارتقاء مسکرا رہی تھی۔ ہر مہمان کی رشک بھری نظریں ان دونوں پر جمی تھیں۔ پہلے شاہ جمال کی طرف دیکھا جاتا۔ ان کی عمر کی بات ہوتی۔ ساتھ ہی میں وجاہت اور بینک بیلنس کی بات پر بات ختم ہو جاتی۔ پھر ان کی قسمت پر رشک ہونے لگتا۔ "اتنی حسین اور کم عمر بیوی کتنے خوش نصیب ہو جمال۔" ہر طرف سے یہ ہی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاہ جمال سینہ فخر سے تانے مہمانوں

میں ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ ارتقاء کے کانوں میں یہ لفظ ٹپک رہے تھے۔ وہ خود کو دنیا کی خوش نصیب ترین ہستی سمجھ رہی تھی۔ تحفظ اور پناہ کے بھاری احساس تلے اس کی پژمردگی اور اداسی دب گئی تھی۔ آج وہ اتنی خوش اور مسرور تھی کہ خود بخود انگ انگ مسکرا رہا تھا۔

رات گئے' تقریب اختتام پذیر ہوئی اور گاڑی میں بیٹھ کر اس نے مطمئن انداز میں سر سیٹ کی پشت پر ٹکا دیا۔ شاہ جمال نے مسکرا کر اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ وہ لجا گئی۔

"کیسا لگ رہا ہے؟" انہوں نے ہاتھ دبایا۔

"بہت اچھا۔" اس نے جواب دیا۔

"میں تو اتنا خوش ہوں' میں ہر زبان سے تعریفی کلمات سننا چاہتا تھا۔" وہ مخمور سے بولے۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"تم نے دیکھا نہیں میرے سارے دوستوں کی آنکھیں تم پر جمی ہوئی تھیں۔" انہوں نے فخریہ انداز میں کہا۔

"آپ اپنی بات کریں' ہمیں تو آپ کی نظروں سے مطلب ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔

"جناب ہماری نگاہ انتخاب تھی تو سب تعریف کر رہے تھے۔" انہوں نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا...... وہ نظریں چرا گئی ------- شاہ جمال نے آہستہ سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

گاڑی گیٹ سے داخل ہو کر پورچ میں پہنچی تو انابی کے ہمراہ اور دوسرے ملازمین نے بڑے پرتپاک سے استقبال کیا۔

"اللہ جوڑی سلامت رکھے۔" انابی نے اسے بانہوں میں بھر کے دعا دی۔

"نیا باورچی آ گیا۔" شاہ جمال نے ادھیڑ عمر کے پرانے ملازم عبدل سے پوچھا۔

"جی شاہ صاحب' آج ہی آیا' میں نے کام سمجھا دیا ہے۔" عبدل نے جواب دیا۔

"انابی آپ ارتقاء کو ہمارے کمرے تک پہنچائیں' ہم ابھی آتے ہیں۔" انابی کی بانہوں کے سہارے قدم اٹھاتی ہوئی وہ شاہ جمال کے کمرے یعنی حجلہ عروسی تک پہنچی۔

حجلہ عروسی میں قدم رکھتے ہی اس کے من میں اتھل پتھل ہونے لگی۔ بے شمار امنگیں وٹیں لے کر بیدار ہو گئیں۔ خواب ناک' مہکی مہکی کمرے کی فضا میں اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کمرہ بہت نفاست سے سجایا گیا تھا۔ انابی کے جاتے ہی اس نے قد آدم آئینے کے سامنے

اپنا جائزہ لیا۔ شوخ سرخ اور سنہری کامدار لہنگے سیٹ بھاری بھرکم زیورات سے لدی وہ کوئی اور تھی۔ خود پر ہی اسے پیار آنے لگا۔ ہلکا ہلکا میک اپ درست کر کے نئے سرے سے فریش ہو کر اس نے بیڈ پر تکیوں کے سہارے دلفریب و دلکش خواب بننے شروع کر دیئے۔ زندگی کے ڈھیر سارے خیالات اکٹھے کرتے کرتے...... وہ تھک بھی گئی اور نیند بھی پریشان کرنے لگی۔ کافی دیر ہو گئی تھی شاہ جمال ابھی تک نہیں آئے تھے اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے ساڑھے بارہ ہو چکے تھے۔ وہ خاصی پریشان ہو گئی۔ پریشانی زیادہ بڑھتی مگر اسی دوران وہ آ گئے۔

"خیریت تھی بڑی دیر لگائی آپ نے۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں ضروری کام تھا میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" وہ کوٹ اتار کر باتھ روم میں گھس گئے۔ وہ پھر دھڑکتے دل سے بستر پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔

مدھم خواب ناک روشنی میں شاہ جمال نے اس کے حسن بے مثال کو پیار کے ڈھیر سارے نذرانے دیئے۔ ان کی بانہوں کے حصار میں اسے اتنی طمانیت اور سکون ملا کہ وہ بے خود ہوئی جا رہی تھی۔

"جان شاہ' آج سے سب کچھ تمہارا ہے لیکن۔"

"لیکن......" ایک دم ہی وہ چونکی

"پیار کا محبت کا ہر لمس ملے گا لیکن اتنے خوبصورت جسم کو خراب نہیں کیا جائے گا۔" انہوں نے مخمور ہو کر اس کی مہکتی زلفیں چوم لیں۔ وہ حیران سی انہیں دیکھنے لگی۔

"نہیں سمجھیں شاید' میں سمجھاتا ہوں۔ میں روایتی مردوں کی طرح بیوی سے بچے پیدا کرانے کے حق میں نہیں۔" اتنا سنگ مرمر سے بنا جسم اس طرح ضائع کرنے کے لئے تھوڑا ہوتا ہے۔ انہوں نے بات مکمل کی اور وہ پرے ہو گئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ چھن سے کوئی چیز اندر ہی ٹوٹ گئی۔ ایک لمحے میں بغیر فاصلے کے بھی دونوں کے درمیان بھاری دیوار آ گئی۔

"یہ سب کس لئے' کس کے لئے۔" اس کی آواز تھرا گئی۔

"ہماری اولاد کے لئے ہے۔" انہوں نے ہنس کر کہا۔

"اولاد مگر آپ تو۔"

"اوہو۔ ارتقاء بیگم سب پتہ چل جائے گا۔ آج کی رات تو ضائع مت کرو' اتنی خوبصورت رات کو بیکار باتوں میں کھونا چاہتی ہو۔" انہوں نے بانہوں کا گھیرا تنگ کر لیا۔ اسے ذرا نہیں اچھا لگا۔ پتہ نہیں کیوں ڈھیر سارا خوف اس کے اندر سمٹ آیا تھا۔

"مجھے ابھی بتائیں۔"

"بھئی' صبح تم ہنی مون پر جا رہی ہو۔ میں نے پیرس کے لئے سارا انتظام کر دیا ہے۔" وہ یکسر بات بدل گئے۔

"شاہ صاحب' میں صرف میں۔" وہ پھر چونکی۔

"ہاں' میں ساتھ جاؤں گا لیکن دو روز میں واپس آ جاؤں گا۔"

"کیا ہنی مون اسے کہتے ہیں؟"

"بھئی مجبوری ہے اکیلا آدمی ہوں فیکٹری کے کام کس کو کرنے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"مجھے اولاد والی بات سمجھ نہیں آئی۔"

"آ جائے گی اولاد ہماری۔ شاہ جمال کی اولاد' شاہ جمال کی نسل اور کون؟"

انہوں نے سینہ ٹھونکتے ہوئے جتلایا۔ اور ہاتھ سے کھینچ کر پھر اسے قریب کر لیا۔ ارتقاء کے لئے یہ بات کافی نہیں تھی۔ اس کا دل و دماغ الجھن کا شکار ہو گیا۔ جسم شاہ جمال کے حوالے کر دینے کے باوجود وہ ذہنی طور پر کہیں خوف کی وادیوں میں کھو گئی تھی۔ مگر شاہ جمال کو بھلا اس سے کیا مطلب!

صبح کسلمندی سے دیر تک وہ بستر پر پڑی رہی۔ پورا جسم درد کر رہا تھا۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ رات کو جاگنے اور رونے سے آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ شاہ جمال نے اسے بھی حسن کی ایک ادا سمجھا۔

"بغیر سنورے بھی ہمارے دل پر چھریاں چلا رہی ہو جانم۔" اس نے کرب سے ہونٹ چبا ڈالا۔

"شام کے چھ بجے ہماری فلائیٹ ہے' ساری پیکنگ کرا لیجئے گا۔" شاہ جمال نے ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے کہا۔

شاہ جمال چلے بھی گئے۔ وہ ساکت بوجھل آنکھوں سے چھت کو گھورنے لگی۔

انابی خوشی خوشی آگئیں۔ "ارتقاء اچھی ہو بیٹا' یہ کیا ابھی تک بستر پر؟" انہوں نے پوچھا۔
وہ دکھ سے مسکرا دی۔

"بالکل ٹھیک ہوں' آپ ایک کپ چائے اور سر درد کی گولی دے دیجئے۔"

"نہار منہ' یہ تمہیں ہوا کیا ہے' آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔" انابی اب کی بار غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"آنکھیں پاگل ہوتی ہیں انابی' رونا ان کی سزا ہے' کیونکہ یہی دھوکہ کھاتی ہیں۔" وہ بمشکل تمام اٹھ کر باتھ روم میں گھس گئی۔

انابی الجھن میں پھنس گئیں۔ پہلا دن' نہ ساتھ ناشتہ کیا اور نہ ارتقاء خوش ہے' یہ سب کیا ہے میرے مولا کرم کرنا۔" انابی بڑبڑاتی ہوئیں ناشتہ لینے کے لئے چلی گئیں۔

جلتی آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے سے کافی سکون ملا تھا۔ ذہن بھی کافی ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ فیروزی ساڑھی میں بغیر زیورات کے بغیر میک اپ کے۔ بالوں میں برش کرتے ہوئے دل و دماغ پھر بھٹک گیا۔ "ارتقاء یہ سب کیا ہے کیسی شادی ہے؟ شاہ جمال کیسی پراسرار شخصیت کے مالک ہیں؟ تم نے شادی کی ہے یا پھر کاروبار۔ تم تو پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہو گئی ہو۔ یہ شیش محل جتنے دروازوں اور کھڑکیوں والا ہے' اتنا ہی تمہارا دم اس میں کیوں گھٹ رہا ہے؟"

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ "یس۔" وہ چونکی

"گڈ مارننگ بیگم صاحبہ۔" باوردی ملازم نے با ادب سلام پیش کیا۔ ہلکے سے سر کے خم سے اس نے جواب دیا۔

"تنویر بٹ تشریف لائے ہیں۔"

"صاحب تو فیکٹری جا چکے ہیں۔" اپنی دانست میں اطلاع دی۔

"وہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔" ملازم نے آپ پر زور دیا۔

"مجھ سے کیوں' میں انہیں نہیں جانتی۔" وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ کیونکہ وہ صاحب پھولوں کے ہمراہ بیڈ روم میں آ چکے تھے۔

"آپ یہاں' آپ کو یہاں تو نہیں آنا چاہئے تھا۔" ارتقاء کو یک لخت غصہ آگیا۔

"معافی چاہتا ہوں' لیکن شاہ کے اور میرے درمیان بے تکلفی ہے۔" بٹ صاحب نے دانتوں کی نمائش کی۔

"لیکن یہ بے تکلفی آپ کے اور میرے درمیان نہیں۔ عنایت انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور چائے پیش کرو۔" اس نے اپنے غصے پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی۔

"مسز شاہ' ہم تو آپ کی کمپنی کے لئے آئے تھے' اگر آپ مصروف ہیں تو میں پھر کسی وقت آجاؤں گا۔" بٹ صاحب خفت سے سر کھجاتے ہوئے چلے گئے۔

"عنایت' آئندہ صاحب کے دوستوں کو صرف صاحب کی موجودگی میں بلایا کرو۔" عنایت سرہلا کر چلا گیا۔ اسی وقت ٹیلی فون چیخنے لگا۔

"ہیلو۔"

"مسز جمال بول رہی ہیں۔" دوسری طرف مردانہ آواز تھی۔

"جی۔"

"کیسی ہیں آپ' رات کیسی رہی۔" آواز شوخ ہوگئی.......وہ سناٹے میں آگئی۔

"واٹ' کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ تقریباً چیخ اٹھی۔

"او' آئم سوری' دراصل جب سے آپ کو دیکھا ہے کروٹیں بدل رہے ہیں اور شاہ کی قسمت پر رشک کر رہے ہیں۔"

"دیکھئے' تمیز کے دائرہ میں رہئے کون صاحب ہیں آپ؟"

"معافی چاہتا ہوں' تعارف تو بھول ہی گیا' مجھے سلطان کہتے ہیں سیٹھ سلطان۔"

"شاہ صاحب فیکٹری جا چکے ہیں' اگر آپ کو ان سے بات کرنا ہے تو فیکٹری فون کر لیں۔" اس نے بغیر کوئی بات سنے فون بند کر دیا۔

"او مائی گارڈ" یہ کیسا گورکھ دھندا ہے؟ یہ کیسی دنیا ہے؟" وہ چکراتے سر کو تھام کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"لو بیٹا ناشتہ کر لو' پھر گولی کھانا۔" انابی نے پیچھے آتے ملازم سے ٹرالی اس کے سامنے کرائی۔ ملازم کے جاتے ہی وہ بولی۔

"شاید ایک بار پھر ہم غلطی کر بیٹھے ہیں' غلط قسم کے لوگوں میں آگئے ہیں۔"

"کیابات ہے؟" انابی پریشان ہوگئیں۔

"ابھی تو شاید کچھ نہیں لیکن آنے والا کل کیا ہو گا۔ اس کی فکر ہے۔" وہ طویل سانس بھر کے بولی۔

"اے گڑیا' کچھ نہیں ہوتا' تم اللہ کا شکر ادا کرو' اللہ سب ٹھیک ٹھاک رکھے۔" انابی نے دلاسہ دیا۔

"آپ میری مدد کریں سامان پیک کرا دیں۔" وہ انابی کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ بھئی۔" انابی نے کہا۔

"جی میں خانساماں ہوں۔ ستار' کھانے کے بارے میں ہدایت دے دیجئے۔"

"بس ہدایت کیا جو صاحب پسند کرتے ہیں وہ بنالو۔" ارتقاء نے بالوں کو ربڑ بینڈ میں جکڑا۔

"جی مجھے صاحب کی پسند کا علم نہیں' کیونکہ میں نیا آیا ہوں' پرانے خانساماں کو نکال دیا ہے۔" ستار نے جواب دیا۔

"کیوں نکال دیا؟" بے دھیانی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں' پر شاہ صاحب نے ناراض ہو کر نکالا ہے۔" ستار نے کہا۔

"ارے بیٹا نوکروں کا کیا بھروسہ' اللہ جانے چور ہو یا پھر کام میں کوتاہی کرتا ہو۔" انابی نے اٹیچی کیس کھولتے ہوئے کہا۔

"بہرحال اس سلسلے میں تم عبدل سے مشورہ کرو۔" ارتقاء نے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن آپ بھی اپنی پسند کی ڈشنز بتادیں۔"

"بس کچھ بھی تیار کرلو۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"بیس آدمیوں کا کھانا تیار کرنا ہے' میں تو چلوں۔" ستار آہستہ سے بڑبڑا کر چلنے لگا۔ ارتقاء چونکی۔

"بیس آدمی' کس نے کہا۔"

"جی صاحب کہہ گئے تھے کہ ان کے دوست آرہے ہیں۔" ستار کہتا ہوا چلا گیا۔

"مجھے تو شاہ جمال نے بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ اپنے بیکار سے دوستوں کو بلانے کی کیا ضرورت تھی۔؟" خیر وہ سر جھٹک کر سامان کی پیکنگ میں مصروف ہوگئی۔

ٹھیک ایک بجے شاہ جمال گھر آگئے۔ وہ پیکنگ سے فارغ ہوئی تھی۔ سادہ سادہ بکھرے بالوں میں۔ تھکی تھکی سی' شاہ جمال نے بانہوں کے گھیرے میں جکڑ کر اس کے رخسار چوم ڈالے۔

"جان شاہ' مہمان آنے والے ہیں اور تم تیار نہیں ہوئیں۔"

"رات ہی تو شادی کے کھانے پر سب انوائٹ تھے پھر اب کیا ضرورت تھی؟"

"ارتقاء بیگم' کاروباری باتیں تمہیں آہستہ آہستہ سمجھ میں آئیں گی۔ سب اہم ترین لوگ ہیں۔" شاہ جمال نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شاہ جمال' کاروبار اور گھر میں فاصلہ ہونا ضروری ہے۔" ارتقاء نے ڈریس منتخب کرنے کے لیئے وارڈ روب کھولی۔

"جو سب سے قیمتی ساڑھی ہے وہی پہن لو اور ایسی تیاری ہونی چاہئے کہ سب ہونق بن جائیں۔" شاہ جمال نے اس انداز میں خوشی کا اظہار کیا۔

"شاہ جمال' میری تیاری' لوگوں کی ہونق کرنے کے لئے ہونی چاہئے' یہ آپ کی خوشی ہے یا ضرورت۔" ارتقاء نے تیکھے انداز میں کہا۔ شاہ جمال سمجھ تو گئے کہ وہ ناراض ہوگئی ہے۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"

"ہنہ۔ پتہ نہیں شاہ جمال تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ بیزار سی کرسی پر ٹک گئی۔

"او جلدی کرو ڈیئر' وقت دیکھو۔" شاہ جمال نے بات بدل دی اور پھر وہ وارڈ روب کھول کر کھڑی ہوگئی۔

کافی غور کرنے کے بعد اس نے یلو گولڈن کنٹراس بارڈر والی ساڑھی منتخب کی۔ اس کے ہم رنگ نگینے والے زیورات غسل کرنے کے لئے باتھ روم میں گئی۔

مہمانوں کے حساب سے تمام انتظامات کا جائزہ لینے شاہ جمال باہر چلے گئے۔ غسل کرنے کے بعد ساڑھی پہن کر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آگئی۔ ابھی میک اپ ہی کر رہی تھی کہ عنایت نے مہمانوں کے آنے کی اطلاع دی۔

"کہوابھی آتی ہوں۔" وہ تیزی سے تیاری میں لگ گئی۔

مکمل تیاری کے بعد اس نے تنقیدی نظروں سے اپنا جائزہ لیا۔ وہ بلاشبہ اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ اپنی نظریں بھی حیران تھیں۔ وہ شرما رہی تھی۔ بھلا اتنے سارے مردوں میں کس طرح جائے۔ شاہ جمال نے یہ مشکل حل کر دی۔ ان کے ساتھ چلتی ہوئی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو...... واقعی سب پتھر کے ہو گئے۔ سب کی نظریں اس کے تراشیدہ جسم پر رینگنے لگیں۔ واہ ...... واہ بہت خوب...... اف قیامت...... وغیرہ وغیرہ کے جملے چاروں طرف سے گونج اٹھے۔ ساتھ کے ساتھ سب شہد کی مکھیوں کی طرح اٹھ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ سب نے ہاتھ ملانے کے لئے ہاتھ بڑھائے مگر اس نے ناگواری چھپاتے ہوئے مسکرا کر سب کو دور سے ہی سلام کیا۔ تمام شرمندہ سے رہ گئے۔ شاہ جمال نے سب کا تعارف کرا دیا۔

"یہ احمد علی ہیں۔ اسسٹنٹ کمشنر' یہ ایس ایس پی وجاہت مرزا' آپ توقیر بیگ' کسٹم کلکٹر' آپ ہمدانی صاحب پبلک ریلیشن آفیسر' آپ انوار علی ڈائریکٹر تعلیمات' آپ اکبر بھٹی ڈائریکٹر ٹیلی گراف اینڈ فونز' آپ تنویر بٹ' بٹ شوز والے' آپ سیٹھ سلطان بہت بڑے بزنس مین۔ آپ جے ایم سید کمشنر انکم ٹیکس۔ ہارون ربانی ڈپٹی ڈائریکٹر انسپکشن اینڈ آڈٹ......"

"پلیز' پلیز بس مجھے سمجھ آ گئی کہ مجھ سے تعارف ہو گیا۔" وہ بری طرح گھبرا گئی۔ اس کی دبی دبی آواز پر سب ہی خاموش ہو گئے۔ شاہ جمال خفت سے ہنس دیئے۔

"آئم سوری صاحبان' ہماری بیگم کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔"

"یار ان سے مل کر ہماری طبیعت خراب ہو گئی ہے۔" اکبر بھٹی صاحب کے جملے پر قہقہے ابل پڑے۔

"شاہ جمال میں کھانا لگوا کر اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔" اس نے سخت بیزاری سے کہا۔

"لیکن ڈیئر۔"

"پلیز فار گاڈ سیک جمال' میرا دم گھٹ رہا ہے۔" وہ آہستہ مگر پرزور انداز میں کہہ کر تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ شاہ جمال نے چہرے کے تاثرات بدلنے سے پہلے خود کو نارمل کیا اور مہمانوں کو کھانے کی میز پر چلنے کو کہا۔

ارتقاء کا دم واقعی گھٹ رہا تھا۔ تمام زیورات اتار کر' بھی بوجھ کم نہیں ہوا۔ باہر سے ملے جلے قہقہوں کی آوازوں سے اسے سخت الجھن ہو رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہے...... ارتقاء؟ یہ کیسے لوگوں کی دنیا ہے؟ ہوس زدہ بھوکی نظروں والے رشتوں کے تقدس سے عاری' ہوس زر اور بزنس کی دنیا کے لوگ۔ کیا شاہ جمال اس سوچ کے ہیں؟ کیا وہ مجھے حصول زر کے لئے لائے ہیں؟ مجھے شاید مقناطیس کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ تبھی تو انہیں کچھ برا نہیں لگتا۔ کاروباری فائدے کے لئے میری عزت' تقدس سب داؤ پر لگا سکتے ہیں۔ ایسے تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ شاہ جمال ہم کیسے چلیں گے۔ میری سوچ تو ایسی نہیں' تم مجھے اپنے فیصلے پر پچھتانے کا موقع مت دو۔ پہلے پچھتاوے کے عذاب سے میں اب تک نہیں نکلی۔ کیا میں نے تمہارے لئے فیصلہ کر کے غلطی کی ہے۔ نہیں' نہیں شاہ جمال ایسا مت کرو' اپنے اور میرے درمیان محبت کا...... اعتبار کا رشتہ رہنے دو۔ کاروبار کے تو بہت ذرائع ہیں۔ محبت صرف اعتبار پر قائم ہے۔ یہ دوبارہ نہیں ہو سکتی۔ عورت کو اس تجربے سے گزارنا چھوڑ دو...... چھوڑ دو...... سر دونوں ہاتھوں سے دبا کر وہ بستر پر گر سی گئی۔ اسی دوران آنکھ لگ گئی۔

"ارتقاء' جان ارتقاء۔" شاہ جمال نے اس کے چہرے کو تھپتھپایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

"یہ سب کیا ہے ارتقاء تم پڑھی لکھی لڑکی ہو' پھر ایسا رویہ۔" شاہ جمال کے لہجے میں بڑی نرم سی شکایت تھی۔

"پڑھنے لکھنے سے عورت کی نسوانیت' عزت و حرمت ختم نہیں ہو جاتی بلکہ کم بھی نہیں ہوتی۔" اس نے تند سے لہجے میں جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں لیکن تم وہ فرسودہ خیالات والی عورت بھی نہیں ہو سکتیں۔"

"عزت' شرم و حیا' یہ ایسے موضوعات ہیں جو کسی دور میں بھی فرسودہ نہیں ہوتے۔"

"دیکھو' ارتقاء' یہ مادہ پرست دنیا ہے اس میں اس طرح کے میل جول ضرورت ہیں۔" شاہ جمال نے اس کے بگڑے تیور بھانپ کر محبت سے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"مادہ پرست اتنے مت بنو کہ رشتوں کا احترام باقی نہ رہے' کیا ہوس زر نے آپ لوگوں کو اخلاقی طور پر قلاش کر دیا ہے۔"

"تمہیں کیا معلوم یہ کاروباری رابطے کتنے اہم ہیں' اگر اہم نہ ہوتے تو......؟"

"تو آپ ایک جوان خوبصورت لڑکی کا انتخاب نہ کرتے۔" اس نے طنز سے ان کا فقرہ اچک لیا۔ شاہ جمال غصے سے گھور کر رہ گئے۔

"شاید۔"

"شاید نہیں یقیناً لیکن شاہ جمال' تم اب ایسا مت کرو' میری محبت اور اپنے اعتبار کو قائم رہنے دو' سب کچھ ہے ہمارے پاس' محبت کی وفا کی یہ چھت رہنے دو۔ مجھے تمہارے اس کاروباری گورکھ دھندے سے خوف آتا ہے۔ وہ کیسے خوفناک انداز میں گھورتے ہیں' کیسے عامیانہ جملے کہتے ہیں۔ کیا مرد کی غیرت بھی مادہ پرست ہوگئی ہے؟"

"اوکم آن' ارتقاء ڈیئر کچھ نہیں ہوتا ایسی باتوں سے۔ یہ تو کھلے دل لوگوں کا مذاق ہوتا ہے۔ مل بیٹھنے کا بہانہ ہوتا ہے۔ یہ محفلیں ہمیں تھکن سے نجات دلاتی ہیں اور ایسی گپ شپ میں بڑے بڑے مسائل حل ہو جاتے ہیں تم خود کو نارمل رکھا کرو۔ ڈرنے اور خوف کھانے کی کیا ضرورت ہے۔" شاہ جمال نے چمکارتے ہوئے کہا۔ وہ جان گئی کہ شاہ جمال کو سمجھایا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ وہ بھی شاید ان سب میں سے ایک تھے۔ خاموشی سے وہ ان سے علیحدہ ہوئی۔ بھوک شدت سے جاگی تھی۔ وہ انابی کے کمرے میں آگئی اور ہمیشہ کی طرح ان سے کھانا مانگا۔

☆ ☆ ☆ ☆

"انابی اپنا خیال رکھنا۔" چلتے وقت انابی کے گلے لگ کر وہ سسک اٹھی۔

"ارے نہیں میری جان' یہ تو خوشی کی بات ہے' خوب گھومنا پھرنا۔" انابی نے دلار سے کہا۔

"انابی میرے اندر خوشی نہیں' ایک خوف ہے مجھے اس نے جکڑ رکھا ہے۔"

"پگلی ہو تم' ایسی زندگی کی تمنا ہر لڑکی کرتی ہے' شاہ جمال کتنا چاہتے ہیں تمہیں۔ اب کوئی اور بات ہے تو مجھے بتاؤ۔" انابی نے اس کی بھیگی پلکیں صاف کیں۔

"نہیں' نہیں سب ٹھیک ہے' اب میں چلتی ہوں' جمال منتظر ہیں۔" وہ یکسر بات چھپا گئی مگر دل اندر ہی اندر رو رہا تھا۔ "آپ کو دکھی نہیں کرنا چاہتی۔" زیر لب بڑبڑائی۔

"کیا بات ہے جان۔" گاڑی میں اس کے برابر بیٹھتے ہوئے شاہ جمال بولے۔

"کوئی بات نہیں۔"

"نہیں کوئی بات ہے' کیا میرے ساتھ جانے پر خوش نہیں ہو۔"

"آپ ہی کے ساتھ تو میری ساری خوشیاں وابستہ ہیں' اگر آپ سمجھیں تو۔" اس نے بھولی سی آنکھوں سے انہیں سحرزدہ کر دیا۔

"قسم ان آنکھوں کی ہم آپ کے دیوانے ہیں' آپ خوش رہا کریں۔" شاہ جمال نے اتنے مخمور انداز میں کہا کہ وہ ہلکے سے مسکرا دی۔

"شاہ جمال! میری وفاؤں' تمناؤں کا مرکز آپ کی ذات ہے' آپ مجھے ٹکڑوں میں نہ بانٹا کریں۔" وہ کسی معصوم بچے کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"کم آن ڈارلنگ' چھوٹی چھوٹی باتیں محسوس نہیں کرتے' لائف انجوائے کرتے ہیں۔

انہوں نے اس کا نرم ہاتھ تھپتھپایا۔ گاڑی ایئرپورٹ کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

وی آئی پی لاؤنج میں بڑی بڑی شخصیات براجمان تھیں۔ ان کے درمیان وہ خود کو بہت اہم محسوس کر رہی تھی۔ فلائیٹ بالکل تیار تھی۔ مخصوص فارمیلٹیز کے بعد جہاز کی طرف جانے سے پہلے شاہ جمال پھر اپنے انہیں دوستوں میں گھر گئے۔ سب کے سب مختلف تحفے تحائف لئے حریص نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔ وہ پھر سخت کوفت محسوس کرنے لگی۔ شاہ جمال اس کی کیفیت بھانپ گئے اور سب کو خدا حافظ کہہ کر جہاز کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

فضاؤں میں سبک روی سے اڑتے جہاز میں اس نے طمانیت سے بھرپور سانس لی۔ شاہ جمال نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہلکے سے مسکرا دی اور سر ان کے شانے پر رکھ دیا۔ اسے اطمینان تھا کہ کچھ عرصہ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے تو ملا۔ شاید اس عرصے میں شاہ جمال سے سمجھ جائیں۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" انہوں نے شانے پر رکھے سر پر اپنا سر رکھ دیا۔

"کچھ اچھا بہت اچھا۔" اس نے مسرور انداز میں کہا۔

"تھینک گاڈ' آپ خوش تو ہوئیں۔"

"شاہ جمال عورت کی کل کائنات اس کا شوہر اور بچے ہوتے ہیں۔"

"ہاں درست' میں جانتا ہوں تمہیں ہمیشہ مجھ سے اور میرے بچے سے محبت رہے گی۔" شاہ جمال نے اس کے کان میں سرگوشی کی...... وہ لجا سی گئی۔ پھر فوراً ہی اسے ان کے وہ الفاظ یاد آ گئے۔

"اور وہ جو آپ نے کہا تھا۔"

"اوہ' چھوڑو' یہ سوچو کہ پیرس کی زمین پر قدم رکھنے میں بس تھوڑا ہی وقت ہے۔"

"شاہ جمال' اپنے منہ سے آپ تو بچے کا ذکر کرتے ہیں' مگر جب میں کہتی ہوں تو۔"

"ڈونٹ بی سلی ارتقاء' بچہ بھی آ جائے گا مگر میں نے تمہارے خوبصورت سراپے کو اس لئے نہیں اپنایا کہ ستر فیصد عورتوں کی طرح تمہیں بے ڈھنگا کر دوں اور جو لوگ تمہیں دیکھ کر رشک کرتے ہیں وہ دیکھنا بھی گوارا نہ کریں۔"

شاہ جمال نے ترخ کر کہا۔ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ کیا وہ لوگوں کے لئے لائی گئی تھی۔ اس کی خوبصورتی دلکشی کی قدر و قیمت صرف یہ تھی کہ وہ شاہ جمال کے بزنس لنکس مضبوط کرائے۔ اس کے ہوس زدہ احباب کو تسکین فراہم کرے۔

"شاہ جمال' تم اس قدر کمرشل لائز ہو یہ میں نہیں جانتی تھی تم نے مجھے کاروبار کے لئے استعمال کرنا چاہا ہے بس' اس لئے تم میرے قریب آئے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"اوہ' ارتقاء ڈارلنگ یہ تو ایک بات تھی ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔" شاہ جمال بری طرح بوکھلا گئے۔

"شاہ جمال خدا کے واسطے مجھے ذات کے اعتبار سے عاری مت کرو۔" وہ سسک اٹھی۔

ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے جوڑے نے ان کی طرف دیکھا۔ شاہ جمال نادم سے مسکرا دیئے اور آہستہ سے بولے۔

"پلیز ارتقاء خاموش ہو جاؤ' دیکھو سب ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔" ارتقاء نے پلکیں صاف کیں اور نشست سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اتنا تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ بندھن کچا دھاگہ ہے۔ دو مختلف نظریئے اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ صرف خود کو متاثر سمجھوتہ کرنا ہے۔ شاہ جمال ہوس پرست دنیا کے مرد ہیں۔ ان کے ساتھ رہنا تیری مجبوری ہو گئی ہے۔ انابی کو یہ صدمہ تو دے نہیں سکتی۔ تیری زندگی کا مقصد ہے ہی کیا۔ صبر کر زہر کے گھونٹ پی جا۔ شاید شاہ جمال کے دل میں وہ احساس بیدار ہو جائے جس سے وہ عاری ہیں۔ ان کی محبت' چاہت سب کاروباری ہے۔"

ارتقاء' یہ دوسرا مرد بھی پہلے کی طرح دھوکہ ہی نکلا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے نے تمہیں پیسے کی خاطر دھوکہ دیا اور دوسرا تمہارے حسن سے دھوکہ دے رہا ہے۔ مرد کے اس دوسرے تجربے کے بعد تمہیں صرف سمجھوتہ کرنا چاہئے۔ ہونٹ سی لینے چاہئیں۔"

بہت سارے خیالات اس کے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے۔ جس طرح جہاز ہواؤں میں محو واز تھا اسی طرح اس کا ذہن خلاؤں میں بھٹک رہا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆

دو ماہ اسے خوب سیر و تفریح کرانے کے بعد شاہ جمال پاکستان آ گئے اور اسے مزید سال بھر اں رہنے کے لئے انتظام کر آئے...... ارتقاء...... نہیں چاہتی تھی۔ اسے انابی بہت یاد آ رہی یں مگر شاہ جمال نے دو ماہ اس طرح اس کا اعتماد بحال کیا تھا۔ اتنی محبتیں دی تھیں کہ وہ خاموشی سے ان کی بات مان گئی۔ انہوں نے اس کی صحت کے لئے یہ ضروری قرار دیا تھا۔ واپسی پر صبح شام اہ جمال اس سے فون پر بات کر لیتے' انابی کی بات کرا دیتے...... انابی بہت خاموش اور اداس یں..... وہ بھی ارتقاء کی طرح کچھ خوفزدہ رہنے لگی تھیں پھر طبیعت بھی ان کی خراب رہنے لگی تھی ..... بخار اور کھانسی مستقل ان کے سر لگ گئی تھی...... شاہ جمال نے ڈاکٹر بلا کر چیک اپ کرایا ی۔ دوائیاں بھی منگوا دی تھیں مگر کچھ ایسی بات تھی کہ دن میں بخار اتر جاتا اور رات بھر چڑھا ہتا۔ شاہ جمال بھی بہت مصروف رہتے تھے جب وہ گھر آتے تو انابی کو چیک کر لیتے۔

مگر آج صبح سے رات گئے تک ان کی مصروفیت ختم نہیں ہوئی جاپانی وفد آیا تھا' ان کے اتھ مصروفیت میں پتہ ہی نہ چلا کہ رات کا ایک بج گیا اور جب گھر پہنچے تو تھکن نے اس بات کی جازت ہی نہیں دی کہ وہ کوئی بات کرتے۔ کپڑے تبدیل کر کے بستر پر دراز ہو گئے...... صبح بھی یر سے وہ اٹھے تو ستار گھبرا کر کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا بات ہے۔" انہوں نے موندی موندی آنکھوں سے دیکھا۔

"صاحب جی' انابی تو فوت ہو گئیں۔"

"کیا..... ؟" وہ جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر باہر دوڑے۔ "او مائی گاڈ' یہ بہت برا ہوا۔" شاہ مال افسوس سے سر تھام کر بیٹھ گئے۔

سارے کام ملتوی کر کے انہوں نے انابی کی تدفین کے فرائض انجام دیئے۔ شام سے پہلے ہلے وہ اس کام سے بالکل کسی چھوٹے سے کام کی طرح فارغ ہو گئے۔ چند ملازمین اور چند کالونی ے مکین جنازہ لے گئے۔ کچھ روپوں کے پھل خرید کر تقسیم کر دیا گیا۔ کچھ روپے یتیم خانے کو ے دیئے گئے اور بس...... وہ کون سی اتنی اہمیت کی حامل تھیں اگر ہوتیں تب بھی امیر لوگوں کے

لئے اس سے زیادہ اہمیت نہیں ہوتی .... اس کے نزدیک پالتو پسندیدہ کتا اہم ہوتا ہے۔ بہ نسبت انسان کے.... انسان تو یہ جب چاہیں پیسوں سے خرید لیتے ہیں۔

پانچ بجے کے قریب انہوں نے ارتقاء سے بات کرنے کے لئے فون ملایا

"ہیلو۔"

"ہیلو کون ؟"

"جی احمد بول رہا ہوں۔" وہ ارتقاء کے لئے ملازم رکھا تھا۔

"بیگم صاحبہ سے بات کراؤ....." انہوں نے کہا۔

"ہیلو' شاہ جمال....." ارتقاء کی آواز آئی۔

"کیسی ہو ڈارلنگ .....؟" انہوں نے پیار سے پوچھا۔

"فائن۔ آپ کیسے ہیں ؟"

"ایک دم فائن' لیکن تمہارے بغیر اداس ہوں۔"

"میں بھی اب اداس ہو گئی ہوں۔ وہیں آنا چاہتی ہوں۔" ارتقاء نے کہا۔

"او کے ڈیئر۔ بس ایک ماہ بعد میں آؤں گا۔"

"یہ کہتے' کہتے تو نو ماہ گزر گئے ہیں۔" ارتقاء نے شکایت کی۔

"آئم سوری' اس مرتبہ پکا وعدہ۔ پہلے خوب شاپنگ کریں گے اور پھر واپس وطن۔" انہوں نے نہایت تسلیم آمیز انداز میں کہا۔

"آپ کو نہ جانے مجھے اپنے سے الگ کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟" ارتقاء کے اندر جو سوال بار بار پریشان کر رہا تھا آخر کو اس کی زبان پر آ گیا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں' البتہ تمہاری صحت کی بحالی کے لئے یہ سب ضروری تھا۔" وہ بڑی مہارت سے بولے۔

"آل رائٹ' مگر اب میں زیادہ دن یہاں نہیں رک سکتی۔" وہ ہراساں سی بولی۔

"بہتر حضور......"

"انابی سے بات کرائیں....." وہ بولی۔

"او۔ ڈیئر آئم سوری۔ انابی کا انتقال ہو گیا ہے۔ آج......" شاہ جمال کو ایک دم جیسے یاد آ گیا۔

"کیا؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ شاہ جمال ؟" اسے شدید شاک لگا۔ کئی لمحے تو وہ سوائے رونے کے کچھ کہہ بھی نہ سکی۔

"کم آن ارتقاء ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے' تم اپنی طبیعت مت خراب کرو۔" انہوں نے جونہی کہا تو وہ غصے سے چلا اٹھی۔

"واہ' شاہ جمال' واہ۔ تم کس قدر خودغرض انسان ہو۔ ایک انسان تمہارے قریب' تمہارے گھر میں مر گیا۔ آج اور تم مجھے بالکل غیر ضروری بات کی طرح بتا رہے ہو۔ اپنی باتوں کے اختتام پر ..... میری ماں جیسی انابی چلی گئیں ...... اور تم ...... اور تم شاہ جمال ایسے مطمئن اور مسرور لہجے میں ریلیکس کے لئے کہہ رہے ہو۔" وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ "تم۔ تم کیسے انسان ہو ؟ انسان ہو ہی نہیں۔ تم مادہ پرست حیوان ہو۔ نجانے تم لوگوں کے نزدیک کیا ضروری ہے اور کیا نہیں......؟" وہ غصے میں چلائی۔

"ارتقاء۔ ارتقاء پلیز' اس میں ہمارا کیا قصور ہے' میں نے علاج کرایا' خیال رکھا اور تم کہتی ہو کہ میں نے مارا ہے......" شاہ جمال بڑی نرمی سے بولے۔

"او' میرے خدا' میں نے تمہیں سمجھنے میں کتنی غلطی کی ہے' تم کتنے سفاک اور بے حس ہو ...... تم اور تمہارے معاشرے میں بے ضرر اور معصوم لوگ اس طرح مرتے ہیں۔" سسکیوں کے درمیان وہ مسلسل غصے سے چلا رہی تھی۔ شاہ جمال کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت وہ کیا طرزِعمل اختیار کریں۔

"ارتقاء' ارتقاء' ٹیک اٹ ایزی پلیز۔"

"چپ رہو' میں آج ہی آنا چاہتی ہوں ابھی اور اسی وقت' میں آتی ہوں انابی ...... وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"خدارا ارتقاء' اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں اس ماہ کے اندر آ رہا ہوں' میرا انتظار کرو۔" شاہ جمال بولے۔

"شاہ جمال! تم نے میرا سرمایہ چھین لیا ہے' میرا سب کچھ لے لیا ہے...." وہ بری طرح سسکی۔

"اوکے 'ڈارلنگ اب قسم ہے میری' خود کو سنبھالو' چپ ہو جاؤ' مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" شاہ جمال سخت پریشان ہو رہے تھے۔

"ہنہ' تمہیں تکلیف بھی ہوتی ہے۔ ناممکن۔" غصے میں کہہ کر اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

شاہ جمال سخت شش و پنج میں پھنس گئے.... ایک طرف ارتقا کو پاکستان آنے کی جلدی تھی اور دوسری طرف انہیں جس بات کا انتظار تھا۔ وہ لمبا ہی ہوتا جا رہا تھا.... ان کی سمجھ جواب دے چکی تھی.... ارتقاء کو فی الحال پاکستان نہیں لا سکتے تھے بلکہ لانا نہیں چاہتے تھے.... وہ سر تھامے بیڈ پر لیٹے چھت کو گھور رہے تھے...... دروازے کی دستک پر وہ چونکے۔

"یس....."

"سلام صاحب جی......" رحمٰن بابا نے سلام کیا۔

"تم کہو کیسے آئے؟ منع کیا ہے یہاں مت آیا کرو......؟" وہ ایک ہی دفعہ میں کئی سوال کر گئے......

"بہت بیمار ہے۔ شدید تکلیف میں ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے ہسپتال داخل کراؤ۔" رحمٰن بابا نے ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھا۔

"اوہو' تو کراؤ بابا' جتنے پیسے چاہئیں لے لو' اگر تم نے پہلے میری بات مان لی ہوتی تو......" شاہ جمال نے جیب سے کئی ہزار' ہزار کے نوٹ رحمٰن بابا کو تھما دیئے۔

"اگر آپ چل کر دیکھ لیتے تو......"

"دیکھو خانساماں' ہم ایسا روز' روز نہیں کر سکتے' ہمیں جس بات کا انتظار ہے وہ خبر جلدی سناؤ۔ رقم جتنی چاہو لے سکتے ہو۔"

"صاحب بات رقم کی نہیں انسان کی ہے' خیر ہم آپ کی دنیا سے دور چلے جائیں گے۔"

"رحمٰن بابا۔ جہاں اور جس مقام پر آدمی ہو اسی حیثیت سے بات کرنی چاہیئے۔" شاہ جمال نے غصیلے لہجے میں کہا...... رحمٰن بابا شکستہ قدم اٹھا کر چلے گئے..... اور شاہ جمال نے پیشانی پر آئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے ایک طویل سانس بھری۔

☆ ☆ ☆ ☆

دسمبر کی سردی اپنے شباب پر تھی۔ سخت برفیلی ہوائیں جسموں کو چیرے دے رہی تھیں۔ آج صبح سے کالے بادلوں نے آسمان گھیر رکھا تھا۔ سورج کو ایک لمحے بھی آزادی نصیب نہیں ہوئی تھی...... موسلا دھار بارش کا سلسلہ دوپہر سے یوں شروع ہوا تھا کہ ایک منٹ بھی اس میں نہ کمی واقع ہوئی اور نہ زیادتی...... بس آسمان سے زمین تک پانی کی چادر سی تنی تھی...... ٹھٹرتی سردی میں سرشام خاموشی اور سناٹا چھا جاتا تھا۔ سڑک پر کبھی کبھار کسی گاڑی کے گزرنے سے شڑاپ' شڑاپ کی آوازیں آتیں....اور پھر مکمل خاموشی صرف پانی برسنے کا شور.......

کمرے میں ہیٹر آن کئے شاہ جمال بستر پر لیٹے کسی گہری سوچ میں غرق تھے کہ گیٹ پر رکشہ رکنے اور بیل کی مسلسل آواز سے ان کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا...... تھوڑی دیر بعد ہلکی سی آواز آئی گیٹ کھلنے کی...... وہ منتظر تھے کہ کون آیا ہے..... ؟ کچھ ہی دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی انہوں نے تیزی سے اٹھ کر دروازہ کھولا.......

"ارتقاء' تم اس وقت......؟" اسے دروازے پر دیکھ کر وہ بری طرح بوکھلا گئے۔

"کیوں' پریشان ہو گئے ہو۔" اس نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"نہ' نہ' نہیں' پھر تم بغیر اطلاع دیئے۔" وہ حد درجہ حیرت زدہ سے تھے یا پھر اس کی آمد خلاف توقع تو تھی اس لئے وہ پریشان بھی تھے۔

"میں پڑھی لکھی ہوں اکیلی آ سکتی ہوں۔" وارڈ روب سے سلیپنگ سوٹ نکالا۔ کپڑے بری طرح بھیگے ہوئے تھے۔ وہ باتھ روم میں گھس گئی...... اور شاہ جمال کچھ حیران' کچھ پریشان ہونٹ چبانے لگے.....

تھوڑی دیر بعد وہ باتھ روم سے باہر نکلی....... شاہ جمال نے مسکرا کر کہا۔

"آج تو میں بڑی شدت سے تمہیں یاد کر رہا تھا' دوری نے بے بس کر دیا تھا۔" شاہ جمال کی کھلی بانہیں مسکرا کر دیکھتے ہوئے اس نے شال شانوں پر پھیلائی اور آہستہ سے بولی۔

"میں اتابی کے کمرے میں جارہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے ان کی روح مجھ سے باتیں کرنے کو ترس گئی ہوگی۔" بغیر ان کی بات سنے وہ کمرے سے باہر نکل گئی..... اس وقت سوائے خاموشی کے وہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے...... کیونکہ ارتقاء کی آمد...... اس کا تیکھا انداز سب اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ وہ ڈسٹرب ہے...... سخت بدگمان ہے۔

عین اسی وقت دوسرا رکشہ رکنے کی آواز پر وہ تیزی سے گاؤن پہن کر باہر نکل آئے ...... انہیں خدشہ تھا کہ دوسرا رکشہ کس کا ہو سکتا ہے اور وہی بات نکلی...... رحمٰن بابا نے ان کی طرف دیکھا۔

"او' اسے ہمراہ لئے کیوں آگئے ہو...... ؟"

"صاحب جی' یہ ایک بار آپ سے ملنا چاہتی تھی' اور یہ دیکھیں آپ کا چاند سا بیٹا ہوا ہے۔"

رحمٰن بابا نے گود میں دبائے گرم کمبل سمیت بچہ ان کی طرف بڑھایا۔

"اندر آجاؤ......" وہ غصے میں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے۔

"رحمٰن بابا' ہمارا بیٹا دینے صرف تمہیں آنا چاہئے تھا' اور واپسی پر ہم تمہیں رقم اور تمہاری بیٹی کے طلاق کے کاغذات دے دیتے۔" انہوں نے پشت کر کے دبے دبے غصے میں چلا کر کہا۔

"صاحب جی' آپ کی امانت آپ کو مبارک' مجھے رقم نہیں چاہئے' پر ایک عرض ہے۔" چادر میں لپٹی...... کمزور لاغر سی سکینہ ان کے سامنے گڑگڑانے لگی۔

"دیکھو سکینہ' ہم تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتے۔" وہ رعونت سے بولے۔

"خدا کے واسطے صاحب جی۔ ہم دور چلے جائیں گے۔ پر مجھے اپنے نام سے الگ مت کریں۔" سکینہ ان کے قدموں پر جھک گئی۔

"کیا بکواس ہے۔ ہم ایک چھوٹی سی بھول کی بہت بڑی قیمت چکا رہے ہیں۔ تم پوری زندگی عیش و عشرت سے گزار سکتی ہو۔" شاہ جمال نے قدم جھٹک کر خود کو دور کر لیا۔

"واہ' واہ شاہ جمال صاحب' بہت خوب......" ارتقاء نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے زوردار انداز میں قہقہہ لگایا۔ شاہ جمال ہونق رہ گئے۔

"ارتقاء' تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" وہ غصے سے پاگل ہو گئے۔

"نہیں' ایسے نہیں۔ میں بھی تو سنوں کہ امیر کبیر' بدچلن شرفا کیسے اپنی ہوس اور شیطانیت کو بھول کہتے ہیں اور اس کی بڑی قیمت چکاتے ہیں۔ طلاق کا داغ دے کر...... ارے واہ سیٹھ صاحب...... بہت قیمت لگائی آپ نے۔ خوبصورت آنکھوں سے حسین خواب نوچ کر زندگی کے پتھریلے کنکر بھر دیئے......" ارتقاء' سخت غصے اور نفرت سے تن کر ان کے مقابل آگئی۔

"اچھا ہوا تم نے جان لیا۔ بخدا میرا ایسا کوئی خیال نہیں تھا' ایسے ہی ایک روز بھول ہو گئی اور اس بھول کی قیمت میں ہم نے اس سے شادی کی' ہم اپنا خون ایسے بے آسرا نہیں چھوڑ سکتے تھے' ہم نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ بچہ دے کر کہیں دور چلی جائے گی کیونکہ ہم بطور بیوی کے کسی پنچ خاندان کی لڑکی تو نہیں اپنا سکتے۔ یہ ہمارے برابر' ہمارے سٹیٹس پر پوری نہیں اترتی تھی۔" شاہ جمال غصے میں چلائے۔

"یہ بھی اچھی رہی شاہ صاحب' اپنے خون کی اتنی فکر اور ایک انسان کو اتنا حقیر جان لیا۔ یہی اصلیت ہے تم بڑے لوگوں کی...... یہ نہیں سوچا کہ تمہارا خون ایک پنچ کی کوکھ میں کیسے پلے گا یہ گالی نہیں۔" ارتقاء نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"رحمٰن بابا' یہ کاغذ لے لو اور یہ چیک بک' اپنی بیٹی کو لے کر چلے جاؤ...... شاہ جمال نے دراز سے خاکی لفافہ نکالا اور رحمٰن بابا کے منہ پر مارا...... خود بچہ اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

"رکئے۔ مجھے میرا بچہ ایک بار دکھادیں۔" سکینہ تڑپ کر پیچھے دوڑی۔ ارتقاء نے بڑھ کر اسے تھاما اور گلے سے لگالیا۔

"بیکار ہے تمہاری فریاد سکینہ' جاؤ اسے ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔" اس کی پلکوں سے بے شمار ستارے ٹوٹ کر سکینہ کے بالوں میں گر گئے......

"بیگم صاحبہ' ابھی تو میں نے اپنے بیٹے کو دیکھا بھی نہیں۔ مجھے ایک دفعہ دیکھنے دو۔" وہ کسی جل بن مچھلی کی طرح اس کی باہنوں میں تڑپنے لگی۔

"اچھا ہی ہے سکینہ' ورنہ زیادہ مشکل ہو جاتی' پھر کون سا سیٹھ شاہ جمال نے تمہیں یہ حق دیا ہے' تم تو ان کی بھول ہو۔ غریب ہو' پنچ ہو۔ میری بہن جاؤ زندگی کی یہ کہانی یہیں دفن کر جاؤ۔" ارتقاء نے ایسے پیار سے اس کے بالوں پر چہرا رکھا کہ اسے کافی سکون ملا......

"بیگم صاحبہ ٹھیک کہتی ہیں بیٹا آؤ چلیں۔" رحمٰن بابا نے کاندھے پر پڑے رومال سے پلکیں صاف کیں اور اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹا۔

"تو پھر بیگم صاحبہ وعدہ کریں' میرے بیٹے کا جی جان سے خیال رکھیں گی۔" سکینہ نے کہا ......ارتقاء جیسے زلزلوں کی زد میں آگئی.......

"نہ' نہ' نہیں سکینہ' ایسا وعدہ مت لو کیونکہ' میں تو خود تمہارے قدموں کے نشانوں پر چل کر اس زنداں سے نکل جاؤں گی۔ میں بھلا کیسے تمہارے بچے کا خیال رکھ سکتی ہوں......" ارتقاء نے سسکتے ہوئے کہا۔

"نہ بیگم صاحبہ' ایسا مت کریں' میں سمجھوں گی کہ ایک ہمدرد ماں میرے بیٹے کے پاس ہے۔" سکینہ نے فریاد کی۔

"پر تمہیں کیسے سمجھاؤں' میرے اور شاہ جمال کے درمیان اتنا فاصلہ پیدا ہو چکا ہے' کہ ہم ایک چھت تلے نہیں رہ سکتے....... میری روح تک گھائل ہو چکی ہے' ذہن باغی ہو گیا ہے۔ میری دنیا اور ہے...... شاہ جمال کی اور ...... ان کی زہر آلود دنیا میں....... میں...... گردن تک نیلی ہوگئی ہوں۔ تم چاہتی ہو کہ بالکل مرجاؤں۔" ارتقاء نے رحم طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ سکینہ چند لمحے اس کی آنکھوں میں چھلکتی سچائی محسوس کر کے خاموش رہی مگر پھر اس کی برستی آنکھوں میں امید کی ایک کرن اسی طرح چمکی۔

"بیگم صاحبہ۔ یہ سمجھ لیں کہ یہ فریاد' میں نہیں' ایک معصوم بچہ کر رہا ہے' اس لئے شفیق ماں بن جائیں۔ اسے ماں کی آغوش چاہئے اور مائیں زہر بھی امرت سمجھ کر پی جاتی ہیں..... آپ کے سہارے میں سکھ سے جی سکوں گی..... ورنہ' پل۔ پل مروں گی اور ہر لمحے اذیت سہوں گی...... ایک دوسرا سفاک بننے سے آپ ہی اسے بچا سکتی ہیں۔"

"سکینہ' سکینہ' خدارا مجھے کانٹوں پر مت گھسیٹو' تم نہیں جانتیں کہ میرے پیروں سے کیسے خون ٹپک رہا ہے۔ میں اس آزمائش پر کیسے اتروں گی؟؟"

"بیگم صاحبہ جی' احسان مند رہوں گی۔" سکینہ کی بھیگی نظروں سے وہ عجیب الجھن کا شکار ہوگئی۔ کافی دیر وہ گہری سوچ میں پڑی رہی پھر اس نے گویا سینے پر صبر کی بھاری سل رکھ لی۔

"ٹھیک ہے سکینہ' آج سے میں اس تپتی دھوپ میں جھلسے دوزخ میں تمہارے بیٹے کے لئے ہر دکھ سکھ قبول کروں گی۔ میری کوکھ تو ویسے بھی خالی ہی ہے' لیکن تمہاری امانت اپنی اولاد سمجھ کر پروان چڑھاؤں گی۔"

"اللہ آپ کو خوش رکھے' آپ ہزار برس زندہ رہیں' ہم جاتے ہیں......" سکینہ کی سسکتی آواز اس کی دل ہلا دینے والی فریاد ہمیشہ کیلئے ارتقاء کے دل و دماغ میں محفوظ ہوئی۔

رحمٰن بابا اس طوفانی...... برفیلی' برستی رات میں سکینہ کو لے کر چلے گئے۔ اس کا کانپتا' لرزتا وجود وہیں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ ایک ہی رات میں دو طوفان گزر گئے۔ دو گہرے' نہ بھرنے والے گھاؤ شاہ جمال نے اس پر لگائے..... اس کی حالت بالکل اس مسافر کی سی تھی جس کا مال اسباب سب لٹ گیا ہو۔ اعتبار بچا تھا وہ بھی لٹ گیا۔ صرف دھوکہ ہی دھوکہ رہ گیا تھا۔ "شاہ جمال تم اس قدر بھیانک ہو گئے یہ میں نے کبھی سوچا تھا۔ تم کسی مجبور کی زندگی سے کھیلو گے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا...... میری کوکھ اس لئے خالی رکھو گے.... میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ تم سا مکار' فریبی کہاں دوسرا ہو گا۔ اس خوبصورتی سے تم نے یہ جال بنا مگر تم اس جال سے کیسے نکل پاؤ گے..... ؟ کیسے ؟ مجھے تمہارے وجود سے تعفن اٹھتا محسوس ہو رہا ہے' شدید بساند اٹھ رہی ہے۔ تم نے اتنے بدبودار لبادے میں خود کو لپیٹ رکھا تھا۔ یہ میں نہیں جانتی تھی۔ میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی' نہیں چاہتی۔ نہیں ارتقاء تم کو وعدہ وفا کرنا ہے۔ بھول گئیں..... او میرے رب کس آزمائش میں ڈال کر مجھے جینے پر مجبور کر رہا ہے۔"

"ارتقاء' ارتقاء۔ اٹھو کمرے میں چلو۔" شاہ جمال کی بھاری آواز پر اس نے ہونٹ دانتوں تلے داب لیا۔

"ارتقاء ڈیئر اٹھو...." شاہ جمال نے اس کے شانے پر دونوں ہاتھ رکھے۔ تو اسے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"مت چھوؤ مجھے' مت ہاتھ لگاؤ' آئی ہیٹ یو' آئی ہیٹ یو شاہ جمال...." وہ ہذیانی انداز میں ٹھ کر چلاتی چلی گئی۔

"خاموش ہو جاؤ' پلیز آہستہ بات کرو....." شاہ جمال نے پہلی مرتبہ ڈپٹ کر کہا۔

"واٹ' مسٹر شاہ' اب بھی خاموشی کی توقع رکھتے ہو' اتنی گھٹیا' گھناؤنی حرکت کے بعد بھی۔ تم

دھوکے باز ہو' مکار ہو......" وہ اس سے بھی زیادہ زور سے چلائی۔

"دیکھو' ارتقاء' میں آج کل میں تمہیں اپنی یہ کوتاہی خود بتانے والا تھا' مگر سب خلاف توقع ہوا۔ تم اچانک چلی آئیں' اتنے دن سے بچے کا انتظار تھا وہ بھی آج...... خیر...... وہ چلی گئی ہے...... تم بھول جاؤ......" شاہ جمال نے اتنے آرام دہ موڈ میں کہا کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"بہت خوب' کتنے آسان لفظ اکٹھے کئے ہیں آپ نے' وہ چلی گئی...... ہاں سیٹھ صاحب' میری اتابی بھی چلی گئیں۔ سکینہ بھی چلی گئی...... تم ایسے پتھر پر کیا اثر......؟ بے حس' انسان کے لئے بیکار لوگ تھے' چلے گئے۔ کاش مجھے تمہاری شیطانی فطرت کا اندازہ ہو سکتا۔ تو تم میرے پہلے تلخ تجربے سے بھی زیادہ تلخ اور مکروہ پہلو والے ہو...... تم بھول سکتے ہو شاہ جمال' صرف تم' میں نہیں میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔"

"تو کیا چاہتی ہو' جانا چاہتی ہو' تو جاؤ تم بھی جاؤ......" وہ قہقہہ لگا کر ہنسے اور بالکل اجنبی انداز میں بولے......

"ہنہ' تم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہو' تو سن لو' میں خود یہ کبھی پسند نہیں کر سکتی' تم نے جس طرح میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے اس کے بعد ایک لمحہ۔ ایک پل بھی تمہارے سنگ رہ اذیت ناک ہے۔ مجھے گھن آ رہی ہے۔ تم سے...... تم نے اپنے طبقے کی بہت خوب نمائندگی ک ہے۔" اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"پلیز ارتقاء' نرمی سے غور کرو' میں نے کوئی دھوکہ نہیں دیا۔ تم میری بیوی ہو' اور شاہ رخ میرا بیٹا ہے۔ ہم صرف تین ہیں۔" شاہ جمال نہایت نرمی سے بولے۔

"آپ تو شرمسار بھی نہیں ہو سکتے' ان رشتوں کا احترام رہنے دو۔ بیوی تو سکینہ بھی تھی۔"

"وہ مجبوری سے بنی' ہمارا اس کا کوئی میل نہیں تھا۔" انہوں نے سینہ اکڑایا۔

"تم میل میرے ساتھ بھی نہیں کھاتے۔"

"ارتقاء اپنی زندگی میں آگ مت لگاؤ' میری بات مان لو' شاہ رخ جمال کو سینے سے لگا سب کو بتاؤ کہ یہ ہمارا بیٹا ہے۔ پیرس میں پیدا ہوا ہے۔" شاہ جمال مسرور ہی مسرور تھے۔

"اچھا یہ پلان بھی اس طرح سوچا ہوا تھا' دور ہو جاؤ شاہ جمال میری نظروں سے' مجھے نفر ہے شدید نفرت تم سے جو ہر رشتے کو کاروبار بنائیں' اور میری زندگی میں تو تم نے شعلے بھ

نہیں۔ کس آگ کی بات کرتے ہو' چلے جاؤ' مجھے تنہا چھوڑ دو...... چھوڑ دو......" وہ فرش پر دو زانو بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

یہ کیسی رات تھی...... برسات ہی برسات۔ طوفان ہی طوفان...... اس کے اعتماد کا خون۔ آسمان بھی اس کی حالت زار پر اشک بہا رہا تھا۔ "ارتقاء بیگم' یہاں رہنا تمہارا مقدر ہے۔ تمہیں سمجھوتے کی یہ چادر اوڑھنی پڑے گی۔ ننھے شاہ رخ کے لئے۔ سکینہ سے کئے وعدے کے لئے۔ یہ کانٹوں بھرا راستہ تمہاری مجبوری ہے۔ خود کو تم مٹا چکی ہو۔ اب صرف شاہ رخ کے لئے جئیو ورنہ یہ خود غرض اس کا بھی کہیں سودا نہ کر دے...... اسے ماں کی ممتا چاہئے مگر' میں جسے ذہن تسلیم نہ کرے اس کے ساتھ کیسے رہوں......؟"

"رہنا پڑے گا' ارتقاء...... یہ بہروپ بھرنا پڑے گا۔ اب تیرے پاس بچا ہی کیا ہے' جو بچا ہے اسے کار خیر جان کر لگا دے۔" اس نے پر زور دلیل دی۔

"اف میرے خدا' کس مشکل میں ڈال دیا......؟" بالوں میں انگلیاں پھنسا کر اس نے طویل سانس بھری۔ اس سمے دور مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ رات ڈھل گئی تھی۔ قیامت خیز رات۔ ایک ہلکا سا سکون اسے محسوس ہوا۔

آج کی صبح سے اس کی زندگی کا نیا سفر شروع ہو رہا تھا۔

"بیگم صاحبہ' صاحب ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں۔" ستار نے آ کر اطلاع دی۔

"ننھا شاہ رخ کہاں ہے......؟" اس نے پوچھا۔

"جی عبدل کے پاس' بہت رو رہا ہے' مبارک ہو جی آپ کو۔" ستار نے کہا۔

"شکریہ' اسے لے آؤ۔" اس نے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے کہا...... ستار گیا اور فوراً آ گیا۔ زرد نرم کمبل میں لپٹا روئی کا گالہ سا اس نے اپنی گود میں بھر لیا۔ اپنے جلتے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیئے بچہ روتے روتے خاموش ہو گیا۔ اس نے بھی شاید آغوش محسوس کر لی تھی۔

"فوراً فیڈر بنا کر لاؤ......"

"جی بہتر......" ستار چلا گیا...... شاہ جمال داخل ہوئے...... اس کی گود میں شاہ رخ کو دیکھ کر وہ فخریہ سی مسکان لئے بولے۔

"تھینک یو ارتقاء جمال' اس کی اصل جگہ یہی ہے۔"

"نہیں۔ تم نے اسے اصل جگہ سے محروم کر دیا ہے۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"پلیز یہ بے تکی بات مت کیا کرو، تم نے مجھے معاف کر دیا۔" شاہ جمال اس کے قریب آ گئے۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا، شاہ جمال صاحب۔ یہ بچہ میرے اور تمہارے درمیان صرف ایک تعلق ہے اور کچھ نہیں جس دن یہ بڑا ہو جائے گا۔ تم مجھے یہاں نہیں دیکھو گے۔"

"او کم آن۔ ایسی بات نہیں کرتے۔ میں نے بہت بڑے فنکشن کا اہتمام کا سوچا ہے۔ کارڈز آج چھپنے جائیں گے۔ جو شاپنگ کرنی ہو، آج کر لو۔" شاہ جمال لاپروائی سے فیکٹری چلے گئے ....اور وہ غور سے شاہ رخ کو دیکھنے لگی، اس کے معصوم چہرے پر اسے بے اختیار پیار آنے لگا۔ ماں بنی تھی تو اس کی چیزوں کی فکر بھی لاحق ہو گئی۔

کبھی کبھی آدمی کتنا بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے کہ کچھ بھی اس کے اختیار میں نہیں رہتا۔ جس سمت حالات رخ موڑ دیتے ہیں، اسی سمت وہ مڑتا چلا جاتا ہے۔ زندگی شاید اسی فلسفے کا نام ہے۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ سوچ کی ایسی ہی بھول بھلیوں میں گم تھی۔ جب بھی ذہن بغاوت پر آمادہ ہوتا وہ پلٹ کر ستار کی گود میں ہمکتے شاہ رخ کو دیکھ لیتی۔ پھر طمانیت سے اس کا چہرہ تمتمانے لگتا۔

بے شمار شاہ رخ کی ضرورت کی اشیاء خرید کر جب لوٹی تو۔ شدید بھوک بھی لگی ہوئی تھی اور رات کی بے خوابی اور مضمحل ہی سی طبیعت سے سخت کوفت کا سامنا کر رہی تھی...... مگر شاہ رخ کی ذمہ داری بھی تو اس پر تھی اس کے کپڑے تبدیل کئے، فیڈر دیا اور تھپک تھپک کر سلایا۔ اسی اثنا میں شاہ جمال بھی آ گئے۔

"ہیلو ڈارلنگ......" وہ بالکل خاموش رہی۔

"ستار، سامان اندر لے آؤ اور لیزا کو بھی اندر لاؤ۔" شاہ جمال نے انٹر کام پر باہر پیغام دیا ......ارتقاء نے اٹھ کر جانا چاہا تو وہ بولے۔

"رکئے حضور ہم اتنے برے بھی نہیں۔" ارتقاء کے جواب سے پہلے، ستار کچھ سامان اٹھا کر اندر آ گیا۔ اس کے ہمراہ درمیانی عمر کی ایک عورت بھی تھی۔ جس نے سلام کیا۔

"ارتقاء، یہ لیزا ہے ہمارے بیٹے کی گورنس اور اس میں کچھ تمہاری چیزیں، کچھ شاہ رخ کی یہ بنڈل کارڈز کا ہے، میں نے سیکرٹری کی ڈیوٹی لگائی ہے وہ تھوڑی دیر میں آکر سب تقسیم ے گا۔" شاہ جمال نے مکمل تفصیل دی...... اس نے پھر بھی لب نہیں کھولے۔

"ستار تم جاؤ، لیزا آپ ادھر شاہ رخ کے پاس آ جائیں۔" شاہ جمال نے کہا۔ ارتقاء کمرے ہر آ گئی...... عبدل کو کھانا لگانے کے لئے کہا۔

کھانے کی میز پر دونوں ہی چپ تھے۔ انواع واقسام کے کھانے موجود تھے مگر کھا کوئی نہیں ۔ ارتقاء شدید بھوک کے باوجود چمچ سے کھیل رہی تھی۔

"آپ ٹھیک سے کھانا نہیں کھا رہیں۔" شاہ جمال نے پوچھا۔

"آپ کو اس بات سے پریشان نہیں ہونا چاہئے۔" وہ نیپکن سے ہاتھ پونچھ کر اٹھ گئی۔

شاہ جمال بخوبی سمجھ رہے تھے کہ ارتقاء کھنچی کھنچی سی ہے بات ارتقاء کی حد تک جائز تھی مگر ے شخص کے لئے ایسی باتیں اہم نہیں ہوتیں۔ ان کے لئے نہ انا ہی اہم تھیں، نہ سکینہ اور نہ ل جس کا ارتقاء کو رنج تھا۔ وہ ایسی باتیں سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے...... کچھ دیر وہ سوچتے ر یہ خیال کر کے کہ آہستہ آہستہ ارتقاء ٹھیک ہو جائے گی۔ اپنے دوسرے کاموں میں ہو گئے..... مگر شام جب علی اکبر صاحب کے گھر ڈنر تھا۔ انہوں نے لان میں ٹہلتا دیکھ کر ی کی طرف اٹھائے اور اسے بتایا۔

"شاہ صاحب۔ ایسا میں نہیں کر سکوں گی۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا اور ٹہلنا بند رسی پر بیٹھ گئی۔

"وجہ۔" وہ بھی سامنے بیٹھ گئے۔

"بخوبی جانتے ہیں آپ۔"

"یہ مت بھولیں کہ آپ بیوی ہیں میری۔" شاہ جمال نے کچھ اس انداز میں کہا کہ اس کی سلوٹیں پڑ گئیں۔

"اس کے باوجود آپ میرے دل کے شیشے کو صاف نہیں کر سکتے۔"

"پھر ہم اکٹھا کس لئے۔" انہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"بس ایک زنجیر ہے پیروں سے لپٹی ہے۔"

"توڑ ڈالو اس زنجیر کو کیونکہ میں اس اذیت سے تنگ آچکا ہوں۔" وہ چلا اٹھے......

"بس اذیت سے گھبرا گئے' زنجیر کو توڑ سکتی تو کب کی جاچکی ہوتی۔" اس نے تڑپ کر جواب

یا۔

"اگر ایسا نہیں کر سکتیں تو پھر بیوی ہونے کے ناطے تم پر جو فرض ہے وہی کرو۔"

"دھمکی ہے۔" اس نے گھورا۔

"نو' میں یہی تو تمہارے ساتھ کر نہیں سکتا' پلیز ارتقاء' میرا خیال کرو۔"

"آپ' ڈنر' پارٹیز کے لئے مجبور نہ کیا کریں۔"

"یہ سب ہمارے معاشرتی تقاضے ہیں۔ ہم اس سے علیحدہ نہیں ہو سکتے' تیاری کرو۔"

"شاہ رخ کو اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا۔" بہت کچھ سوچ کر اس نے نرمی سے بہانہ بنایا۔

"لیزا کس لئے ہیں' پلیز ایک دم بہترین سی تیاری کرو۔" شاہ جمال نے پیار سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا

اور اندر چلے گئے۔

ڈھلتے سورج کی شنگرفی کرنیں...... ہلکی ہلکی مہک دار فضا۔ اس کو ذہنی طور پر بہت سکون

مل رہا تھا۔ آنکھیں موند کر وہ مہک سانسوں میں اتارنے لگی۔ آہستہ آہستہ ٹھنڈک بڑھ رہی تھی۔

وہ شال سنبھالتے ہوئے اندر آگئی...... "ارتقاء' ڈرامہ ہی کرنا ہے' تیار ہو جاؤ۔" اس نے سوچا

اور ساڑھی کا انتخاب کرنے لگی۔

"لیزا شاہ رخ کا ٹھیک سے خیال رکھنا ہے۔" کانوں میں آویزہ پہنتے ہوئے اس نے کہا۔

"بیگم صاحبہ' بابا ابھی ہم سے مانوس نہیں آہستہ آہستہ ہو جائے گا۔" لیزا نے سوئے ہوئے

شاہ رخ کو دیکھا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

اس سمے شاہ جمال نہا کر باتھ روم سے نکلے۔ اسے دیکھ کر پلک جھپکنا بھول گئے۔ بلیک

فیروزی بارڈر والی ساڑھی' جھلملاتے ستارے۔ اس کے حسین متناسب جسم کو مزید دل کش بنا رہے

تھے۔ مناسب میک اپ اور کندن کا سیٹ۔

"لیزا' تم باہر جاؤ......" انہوں نے لیزا سے کہا..... ارتقاء تیار ہو کر' اخبار اٹھا کر پڑھنے

گئی۔

"کرتے ہیں قتل اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔" لیزا کے جاتے ہی وہ اس پر جھکتے ہوئے

ہوش لہجے میں بولے۔

"پلیز شاہ جمال صاحب' فاصلہ رکھئے۔" وہ بری طرح جھٹک کر پرے ہو گئی۔

"میاں بیوی کے درمیان فاصلہ کیسا؟"

"فاصلوں کا تعلق سوچ سے ہوتا ہے' جب سوچ بدل جائے تو پاس رہنے کے باوجود ایک

دسرے کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"مگر........."

"اگر مگر چھوڑیں۔ دیر ہو رہی ہے تیار ہو جائیں۔" اس نے یکسر بات بدل ڈالی۔ شاہ جمال

بز سے تیار ہونے لگے۔

رات علی اکبر صاحب کے ہاں سے بڑی دیر میں فراغت ہوئی۔ ڈریس تبدیل کرتے' شاہ

خ کو سنبھالتے مزید دیر ہو گئی...... صبح وہ دیر تک سوئی رہی' ویسے بھی جس طرح کی پارٹیز' اور

ن میں ہونے والی گفتگو سے وہ چڑتی تھی' اسی طرح کی باتیں اسے سننا پڑیں۔ وہی بزنس رابطے'

ی کاروباری لالچ' وہ سارا وقت اکتائی' اکتائی سی رہی مگر ایک بات صرف نئی تھی وہ بیٹے کی

ار کباد تھی' جو اس سے بڑھ کر شاہ جمال وصول کر رہے تھے۔ ساتھ میں وہ سب کو فنکشن پر

نے کی بھرپور دعوت بھی دے رہے تھے...... ارتقاء کی تھکان اپنی جگہ درست تھی۔ انسان کی

ت ہے اگر من پسند ماحول یا بات سننے کو نہ ملے تو وہ سب سے زیادہ بور اور تھکن کا شکار ہو جاتا

شاہ جمال فیکٹری جاچکے تھے۔ وہ پھر بھی سوئی رہی اور ابھی شاید کچھ دیر اور سوتی کہ دروازہ

سل دستک نے اسے جگا دیا۔

"یس۔" بوجھل آنکھیں کھولنے کی کوشش میں ٹھیک سے اندر داخل ہونے والے کو نہ

کی۔

"گڈ مارننگ۔" آنے والے نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"آپ' کون اور ......" جھٹ سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ خوبصورت کم عمر حسین

ے کا مالک نوجوان بازو باندھے مسکرا رہا تھا.... سنہری مونچھوں کے زیر سایہ گلابی ہونٹوں پر

دلفریب سی مسکان تھی۔ بھوری آنکھوں میں خوشی کا تاثر تھا.....وہ حیران تھی۔

"مجھے شارب کہتے ہیں، شارب علی۔"

"لیکن آپ......"

"میں آپ کے شوہر نامدار کا بھتیجا، لیکن ذرا دور کا ہوں۔" اس نے نہایت شرارت سے کہا۔

"اچھا۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟" وہ اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"سب کچھ بتاتا ہوں، مگر آپ نے بیٹھنے کو نہیں کہا۔" اس نے بغور اس کے بکھرے بکھرے سراپے کو دیکھا۔

"او۔ آئم سوری۔ بیٹھو۔" وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں آزاد کشمیر سے آیا ہوں، اور اب مستقل یہاں رہوں گا، میرا مطلب ہے علیحدہ گھر میں۔"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

مجھے تو بہت زیادہ ہوئی۔" اس نے پوری آنکھیں کھولیں۔

"کیا.....؟" اس نے پریشانی سے پوچھا۔

"حیرت۔" وہ ہنسا۔

"کس بات پر......"

"کہ آپ اتنی حسین اور اتنی اچھی ہیں۔" اس نے اس کی گلابی گلابی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا کرتے ہو تم؟" وہ مسکرا دی۔

"ابھی گریجویشن کی ہے۔"

"بہت خوب۔"

"اب یہی باتیں ناشتے میں ملیں گی یا؟"

"او۔ میں ابھی تیار کرواتی ہوں۔" وہ تیزی سے اٹھ کر باہر جانا چاہتی تھی کہ وہ بولا۔

"میرا خیال ہے ناشتہ تو آپ نے بھی نہیں کیا۔"

"ہاں، میں تمہارے ساتھ کرتی ہوں۔" اس نے کہا اور باہر چلی گئی۔

ناشتے کی میز پر جب وہ پہنچا تو بالکل فریش، گرے گرم شلوار سوٹ میں، وائٹ گرم شال کاندھے پر ڈالے کسی پختون جوان کی طرح........"

"شاہ جمال نے کبھی تمہارا ذکر نہیں کیا۔" اس نے سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ بڑے آدمی ہیں، ویسے بھی میں کون سا انہیں یاد کرتا تھا، وہ تو بابا کے بعد میں اکیلا رہ گیا۔

'وہ کافی رنجیدہ ہو گیا۔

"بابا، یو مین تمہارے والد صاحب۔"

"جی ہاں، ان کا انتقال کچھ دن پہلے ہوا ہے، اور ان کے سوا میرا کوئی نہیں۔ بابا، شا انکل کا ذکر کرتے تھے سو میں یہاں آ گیا کہ کسی اپنے کے شہر میں باقی زندگی گزار لی جائے۔"

"بہت اچھا کیا تم نے، میں تمہارے انکل کو فون کرتی ہوں۔"

"ارے نہیں۔ سرپرائز، ابھی آپ رہنے دیں۔" وہ پھر سے خوشگوار موڈ میں بولا۔

"پھر تو تم ہمارے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے ہو گے۔" ارتقاء نے اس کے لئے چائے بنائی۔

"جی ہاں، کچھ بھی نہیں۔"

"اچھا ہی ہے۔ جان کر آدمی کبھی کبھار مایوس ہوتا ہے۔"

"ایسی خوفناک صورتحال ہے یہاں۔" اس نے متجسس ہو کر پوچھا۔

"رہ کر دیکھ لو۔" وہ چائے ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

شاہ رخ کے رونے کی آواز پر وہ کمرے میں آ گئی۔ وہ بھی پیچھے ہی آ گیا اور بیڈ سے اوپر ارتقاء اور شاہ جمال کی شادی کے موقع پر بڑی سی تصویر دیکھنے لگا۔

"واہ، لگتا ہے کہ آپ کے والد کی قوب کی نظر خراب ہے۔"

"کیا........؟" وہ چونکی۔

"کیا آپ کے جوڑ کا شہر میں رشتہ نہیں تھا، یا پھر آپ کو عشق ہو گیا تھا ہمارے انکل سے۔"

وہ بڑی معصوم سی شکل بنا کر بولا۔

"پلیز شارب....." ارتقاء کو اس کی بات اچھی نہ لگی..... یہ وجہ نہیں تھی کہ شاہ جمال کی برائی اسے پسند نہیں تھی بلکہ وہ اپنے فیصلے پر نادم ہو جاتی تھی۔

"سچ کہہ رہا ہوں بیگم صاحبہ' آپ میرا ہی انتظار کر لیتیں۔" وہ شرارت سے بولا۔

"شارب۔" اس نے تنبیہہ کی۔

"آئم سوری' خیر آپ نام تو بتائیں۔"

"ارتقاء سرفراز۔" اس نے نرمی سے جواب دیا۔

"ارتقاء سرفراز یا ارتقاء شاہ جمال۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ارتقاء سرفراز۔" اس نے زور دار انداز میں مگر آہستگی سے کہا۔

"چلیں' مگر میں تو آپ کو ارتقاء ہی کہوں گا۔" اس نے گہری آنکھوں سے دیکھا۔ ارتقاء نے شاہ رخ کے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے رک کر اسے دیکھا۔

"وہ کس لئے؟ میں عمر میں اور رشتے میں تم سے بڑی ہوں۔"

"مجھے پہلے آنا تھا۔ آپ آگئیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ مسکرایا۔

"تم مجھے آنٹی کہہ سکتے ہو۔"

"جی نہیں۔ میرا ٹیسٹ اتنا خراب نہیں کہ اتنی خوبصورت دوشیزہ کو آنٹی کہوں۔"

"بہت شریر ہو۔" ارتقاء کو ہنسی آگئی۔

"رشتہ ناطہ اپنی جگہ سہی مگر دل نادان اپنی جگہ درست۔"

اس سے پہلے کہ ارتقاء اس کی بات کا جواب دیتی۔ شاہ جمال آگئے۔

"ارے شارب علی تم یہاں اس طرح اچانک۔" انہوں نے اسے گلے سے لگالیا۔

"دیکھ لیجئے۔ ہم آپ کے شہر میں مستقل آگئے۔" وہ مسکرایا۔

"ویلکم مائی ڈیئر۔" شاہ جمال خوش دلی سے بولے۔

"لیکن رہوں گا علیحدہ۔"

"ناٹ' ناٹ ایٹ آل۔ یہ سوچا بھی کیوں' یہ اتنا بڑا محل نما گھر کس لئے ہے.....؟" شاہ جمال نے سرزنش کی.....

"شادی مبارک ہو' بیٹا مبارک ہو اور اتنی خوبصورت بیوی مبارک ہو۔" شارب نے کن انکھیوں سے ارتقاء کو دیکھا..... مگر یہ کیا وہ تو بالکل ان سے لاتعلق اور خاموش بیٹھی تھی۔ جیسے کہ شاہ جمال کو جانتی ہی نہ ہو۔

"شکریہ۔ یہ بتاؤ بابا کا کیا حال ہے......؟"

"وہ تو مجھے آپ کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔" شارب نے سنجیدگی سے کہا۔

"او' بہت دکھ ہوا' خیر تم خود کو اکیلا مت سمجھو۔" شاہ جمال نے محبت سے کہا۔

"لیزا' لیزا....." ارتقاء نے آواز دی۔

"یس......."

"بابا کی نیپی تبدیل کرو اور اسے فیڈر دو۔ ارتقاء نے شاہ رخ کو لیزا کے حوالے کیا اور خود باہر آگئی۔

☆ ☆ ☆ ☆

چند ہی روز میں شارب سب کچھ جان گیا۔ اسے ارتقاء کی خاموشی اور شاہ جمال کی شرمندگی سب کا علم ہو گیا۔ شاہ رخ سے شارب بہت مانوس ہو گیا تھا..... ارتقاء سے بھی وہ کسی نہ کسی بات پر الجھتا رہتا۔ کبھی وہ ٹال جاتی اور کبھی غصے میں جواب دیتی۔ وہ اسے چھوٹا جان کر ایسا کرتی تھی جبکہ وہ مزید الجھ کر بیٹھ جاتا..... ارتقاء کبھی کبھی اس کی گہری نظروں سے خوف سا محسوس کرنے لگتی۔ وہ ہنگامے پسند کرتا تھا اور ارتقاء بالکل خاموش رہنا چاہتی تھی۔

ابھی رات ہی کو شاہ جمال نے بیٹے کی خوشی میں ہوٹل میں ڈنر دیا تو وہ ارتقاء سے لباس کے مسئلے پر الجھ گیا..... ارتقاء نے آسمانی پلین ساڑھی کا انتخاب کیا جبکہ اس کی خواہش تھی کہ کامدار ساڑھی پہنی جائے۔

"دیکھو شارب' خواہ مخواہ اس بات پر مت الجھا کرو۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"آپ بھی بے مقصد یہ خوفناک زندگی مت گزاریں۔" وہ برسا۔

"میرا دل زندگی سے ہی بیزار ہے اور تم۔"

"مان لیا کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے' مگر جو بھی زندگی ہے اسے بھرپور انداز میں جینا

چاہئے آپ ہنسی خوشی زندگی کے سب رنگ اپنے لباس میں بھریں۔" اس نے ناصح بن کر نصیحت کی۔

"کس لئے۔"

"اپنے لئے اور میرے لئے.....؟" وہ بے خودی میں بول گیا۔

"کیا......؟" ایک دم ہی اس کی پلکیں اٹھیں۔

"میرا مطلب ہے مجھے پھیکے چہرے پسند نہیں مجبوری ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا اور اسے مجبوراً اس کی پسند کی ساڑھی پہننی پڑی۔

جب وہ تیار ہوگئی تو اس نے اتنا سراہا کہ اسے پھر ڈانٹنا پڑا۔

"شارب! اپنے اور میرے رشتے کا خیال رکھا کرو۔"

"کونسا رشتہ' چانس کی بات ہے جس کو مل جائے' میں دل کے رشتے مانتا ہوں۔"

"اچھا اچھا' بکو مت۔" وہ چڑ گئی۔

"آپ شاہ انکل کی بیوی ہوں گی مگر میں ان کے حوالے سے آپ کو نہیں جانتا' بس آپ یہاں مجھے مل گئیں۔" وہ بے باکی سے بولا۔

"مگر......"

"مگر کچھ نہیں' جائیے مہمان آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

زندگی بھی عجیب معمہ ہے .... ایک ہمدرد ملا بھی تو وہ مزید الجھن کا شکار ہوگئی .... شارب کے آنے سے جو تنہائی اور بوریت ختم ہوئی تھی اس سے وہ کافی مطمئن ہوئی تھی لیکن کبھی اس کے حد سے بڑھے بے باک جملوں سے وہ سخت پریشان ہو جاتی تھی......... اس کی ضد ہوتی تھی کہ وہ اس کے ہمراہ سیر کرے' گھومے پھرے......... جبکہ شاہ جمال تو خود اسے ایک شطرنج کے مہرے کی طرح استعمال کرتے تھے' آئے دن ان کی پارٹیز ان کے ڈنر......... وہ جب کسی بزنس الجھن کا شکار ہوتے تو .... پارٹیز وجود میں آجاتیں۔ ارتقاء بری طرح چڑتی تھی .... کئی روز تک یہ سلسلہ برابر جاری رہتا......... ارتقاء کو شاہ رخ کے لئے بھی وقت نہیں مل رہا تھا۔

شارب نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا' صبح وہ چلا جاتا......... اور شام کو وہ لوگ نکل جاتے......... وہ سخت بور ہو رہا تھا' دل بہلانے کو صرف گھر میں شاہ رخ رہ جاتا۔

مگر آج جمعہ تھا......... وہ گھر پر تھا......... شاہ جمال کی تو معمول کے مطابق لنچ کی کمٹمنٹ تھی......... وہ چلے گئے۔ ارتقاء کو کافی دنوں بعد ریلیکس ملا تھا......... وہ چھوٹے موٹے کام دیکھنے لگی کہ وہ جھلاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

"اگر آپ لوگ مجھ سے بیزار ہوگئے ہیں تو کہہ دیں میں چلا جاتا ہوں۔"

"کیوں' کیا ہوا.........؟"

"میں بھی گھر میں ہوں مجھے اس طرح نظرانداز کیا ہوا ہے۔"

"میں شاہ جمال سے اسی بات پر بیزار ہوں مگر۔"

"مگر میرے ساتھ تو جانے کا وقت نہیں ہوتا۔"

"شارب! میں نے ہر دکھ تمہیں بتایا ہے ہمدرد جان کر' شاہ رخ میرے اور شاہ جمال کے درمیان پل ہے ایک کمزور پل اس کی پرورش تک میں مجبوراً سب کچھ کرتی رہوں گی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"ایک طرف کہتی ہو کہ ان پارٹیز میں دم گھٹتا ہے اور دوسری طرف؟"

"مجبوری' لیکن شارب میں تم سے بڑی ہوں کم سے کم.........؟"

"میں نہیں سمجھتا........." اس نے فقرہ کاٹا۔

"مگر یہ حقیقت ہے تم اس بات کا خیال رکھا کرو' اور ضروری نہیں کہ ہر بات تمہاری ہی درست ہو۔" ارتقاء نے ذرا سختی سے کہا اور اٹھ کر وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکالنے لگی۔

"آپ نے تو زندگی حرام کر رکھی ہے۔" وہ چلایا۔

"نصیب نصیب کی بات ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"یہ میرے نصیب ہیں کہ میں یہاں آگیا اور اپنا جینا حرام کر لیا۔" اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی کہ کیسے' میرے اور تمہارے رشتے میں کہیں ایسا تعلق نہیں کہ

.........؟"

"انکل سے جو آپ کا برائے نام تعلق ہے وہ کوئی مضبوط شکل نہیں رکھتا اور میں کوئی ان کا بھتیجا نہیں۔" وہ تیزی سے بولا......... اس نے زچ آکر اسے دیکھا۔

"شارب! تم کیسی باتیں کرتے ہو' مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی۔"

"کاش آپ مجھے پہلے ملی ہوتیں........." وہ سرگوشیانہ انداز میں کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ ذہن جھٹک کر پھر کام میں مصروف ہوگئی۔

پھر ایسی ہی نوک جھونک میں دن اڑتے چلے گئے......... اس نے ایم اے پولیٹیکل سائنس کیا۔ شاہ جمال نے سرزنش کرکے اپنے ساتھ بزنس میں لگالیا.........شاہ رخ بھی اب سوا دو سال کا ہو چکا تھا۔ تتلا کر وہ سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالیتا.........رنگ روپ بھی اس نے خوب نکالا تھا.........ارتقاء بس ہر وقت اس کاموں میں مصروف رہتی تھی' لیزا کو تو اس نے فارغ کردیا تھا۔ وہ ہر طرح کی تربیت اور دیکھ بھال خود کرنا چاہتی تھی......... جب بھی شاہ جمال اسے کہیں چلنے کو کہتے تو وہ شاہ رخ کا بہانہ بنانے لگتی اسی وجہ سے کافی بحث و تکرار شروع ہوجاتی۔ شاہ جمال کے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھا تھا' گھٹا نہیں......... اب شاہ جمال کینیڈا بزنس ٹور پر جارہے تھے' ہمراہ ارتقاء کو لے جانا چاہتے تھے مگر وہ بضد تھی کہ نہیں جاسکتی۔

"ارتقاء' تم نے میری زندگی عذاب سے گزاری ہے۔"

"تمہارے دیئے ہوئے عذاب سے سب عذاب کم ہوں گے۔" اس نے چڑ کر کہا۔

"تم نے دل میں کینہ پال کر اب تک مجھے عزت نہیں دی۔" شاہ جمال نے غصے سے کہا۔

"خود فیصلہ کرو کہ کس رویئے کے مستحق ہو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا' شاہ رخ بڑا ہو رہا ہے اس پر ہمارے جھگڑوں کا برا اثر پڑے گا۔"

"افسوس کی بات ہے کہ اپنے رویئے پر نادم بھی نہیں۔"

"ارتقاء بیگم' اگر ہمارے درمیان حائل خلیج اسی طرح قائم رہی تو ہمیں ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔"

"ہاں' لیکن میری بدنصیبی ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہنے پر مجبور ہوں۔" اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"دیکھو ارتقاء' سب بھول جاؤ' میری خطا معاف کردو اور تیاری کرو۔" شاہ جمال پھر صلح پر آمادہ ہوئے۔

"مجھے نہیں جانا۔" وہ اڑی رہی۔

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔" شاہ جمال بھنا کر باہر نکل گئے اور وہ کلائیوں میں پڑی چوڑیوں سے کھیلنے لگی۔

☆ ☆ ☆ ☆

موسم بہار کے نہایت خوبصورت دن تھے......... پھولوں اور کلیوں پر جوانی چھائی تھی......... شاہ جمال کو کینیڈا گئے پورا مہینہ ہو چلا تھا......... شارب نے ساری ذمہ داری بزنس کی سنبھال رکھی تھی......... صبح کا گیا رات گئے وہ لوٹتا تھا......... ارتقاء کے اندر باہر ہی خزاں کا موسم تھا۔

آج بھی وہ شاہ رخ کے پاس بیڈ پر بیٹھی خلاؤں میں کچھ کھوج رہی تھیں اس کے من کا سکھ کہیں کھو گیا تھا......... زرد لباس میں' پریشان پریشان سی.........

"کیا کھو گیا ہے آپ کا.........؟" شارب دیر تک دیکھنے کے بعد بولا۔

"سکھ' چین۔" اس نے لمبی آہ بھری۔

"تو پاس ہی کھڑا ہے تلاش کرلیں۔" اس نے ذومعنی نظروں سے دیکھا وہ یکسر ٹال گئی۔

"اب تو آرزو ہی نہیں رہی۔" اس نے شاہ رخ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"بہت قنوطی ہیں آپ' موسم بہار میں خزاں کی علامت ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" وہ ہلکے سے مسکائی۔

"لیکن بالکل غلط ہے' اٹھیں باہر بہت اچھا موسم ہے' لانگ ڈرائیونگ پر چلتے ہیں' واپسی پر ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔"

ہرگز نہیں' میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔" وہ مضطرب سی بولی۔

"آج ایک نہیں چلے گی' شاہ رخ بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔" وہ ڈٹ گیا۔

"شارب' ضد کیوں کرنے لگتے ہو۔" وہ زچ گئی۔

"اس لئے کہ آپ کو خود سے احساس نہیں ہوتا۔"

"جب ہر احساس ہی ختم ہو جائے پھر' تم گھومو پھرو' بلکہ کسی اچھی سی لڑکی سے دوستی کر لو۔"

"مشورے کا شکریہ' آپ کی دوستی بری نہیں۔"

وہ غور سے اسے دیکھتی رہی پھر ہتھیار ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی اثناء میں ٹیلی فون کی بیل چلانے لگی۔

"آپ تیار ہوں' میں دیکھتا ہوں۔" شارب نے ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو جی' جی ہیں۔"

"آپ کا فون ہے۔" اس نے ارتقاء کو ریسیور پکڑا دیا۔

"ہیلو' جی بول رہی ہوں۔" وہ بولی۔

"بیگم شاہ جمال کینیڈا میں کار کے حادثے میں جمال صاحب ہلاک ہو گئے ہیں ان کی ڈیڈ باڈی اس قابل نہیں۔"

"اوہ" اس نے باقی بات سننے سے پہلے فون بند کر دیا...... اور شکست خوردہ انسان کی طرح بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ شارب حیرت زدہ سا بولا۔

"کیا بات ہے' کون تھا.........؟"

"شارب! لو آج ہمارے ڈرامے کا اینڈ ہو گیا۔" اس نے آہستہ آہستہ اسے بتایا........

وہ بھونچکا سا کبھی اسے دیکھتا اور کبھی فون کو........ اسی لمحے دوبارہ ٹیلی فون بجنے لگا........ شارب نے لپک کر فون اٹھایا۔

"ہیلو' جی........"

"مسز جمال شاید غم کی حالت میں فون بند کر گئی تھیں۔" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"یقیناً' آپ مجھے بتائیں۔"

"افسوس ناک خبر ہے مگر قدرت کی باتوں میں کس کا دخل' اب مسئلہ یہ ہے کہ ان کو وہیں دفن کر دیا جائے یا پھر آپ یہاں لانا چاہیں گے۔"

"ہولڈ آن پلیز۔" شارب نے ارتقاء سے رجوع کیا۔

"ارتقاء بولو' میت یہاں لانی ہے یا وہیں دفن کر دی جائے۔" شارب نے جھنجوڑ کر پوچھا۔

"وہ زندہ ہوتے تو یہی کہتے کہ وہیں دفن کر دو لیکن میں ایسا نہیں کروں گی' میں رشتے اور

اعتماد کی چادر میں لپیٹ کر یہیں تدفین کراؤں گی' کہہ دو کہ تم میت پاکستان لاؤ گے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا' شارب نے لفظ بہ لفظ فون پر کہہ دیا۔

"تم شام کی فلائیٹ سے جاؤ اور طریقے سے لے آؤ۔" اس کا لہجہ اتنا ٹوٹا پھوٹا تھا کہ شارب کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ صابر اور مضبوط عورت کیسے بیٹھی ہے.......... وہ جلدی سے چلا گیا اور بہت سے آنسو پلکوں سے ٹوٹ کر اس کا دامن بھگو گئے۔

اعتبار اور اعتماد کا برائے نام تعلق بھی آج ٹوٹ گیا.......... ارتقاء' تم کیسے نصیب لے کر آئی ہو کہ مرد کی محبت' اس کا تحفظ اس کا قرب تمہارے نصیب میں نہیں دوسری ٹھوکر کھا کر بھی تم زندہ رہنے پر مجبور ہو۔" اس کے اندر سے سسکتی عورت نے فریاد کی مگر رشتوں کی حقیقت سے وہ آشنا تھی' شاہ جمال سے رشتہ تو صرف کاروباری اور غرض کا تھا۔ جس دن سے یہ جانا تھا اس دن سے ہی وہ اس سے ذہنی اور دلی طور پر علیحدہ نہیں ہوئی تھی بلکہ جسمانی طور پر بھی صدیوں کا فاصلہ ہو چکا تھا۔ صرف چھت ایک تھی' مسافر دو تھے ان دو مسافروں کے درمیان ایک معصوم فرشتہ آ گیا تھا۔ جس نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

یکلخت وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر شکست کھائی تھی.......... ایسے میں شارب کا سہارا ہی تھا کہ وہ بکھری نہیں.......... وہ اسے ڈھیروں دلاسے دے کر چلا گیا .... اور وہ پیچھے کبھی ہنسنے لگتی اور کبھی رونے لگتی.......... شاہ رخ کو گود میں بھرتی تو قلعے کی طرح مضبوط ہو جاتی' شاہ رخ سے دور ہوتی تو بھر بھری مٹی کی طرح بکھرنے لگتی۔ ایسے میں اسے طنزیہ سرگوشی سنائی دیتی۔

"ارتقاء بیگم' تمہاری زندگی کا کیا ارتقاء سفر ہے کہ تم مات پہ مات کھاتی چلی آ رہی ہو' مختلف زاویوں سے' کیوں آخر کیوں..........؟"

"اب ایسا نہیں ہو گا' کہانی ختم ہو گئی' ارتقاء اب کسی مرد سے مات نہیں کھائے گی۔" اس نے آنسو صاف کر کے جواب دیا۔

"ہنہ آئینہ دیکھو کیا تمہیں مرد کی ضرورت نہیں اور کیا تمہارے حسن میں مرد کی بے قراری نہیں۔" دل نے چٹکی بھری۔

"نہیں ارتقاء اب صرف ماں ہے اور کچھ نہیں.........." مصمم ارادے سے اٹھی اور شاہ

رخ کو اپنے آغوش میں جکڑ لیا۔ سوئے ہوئے شاہ رخ کو کیا معلوم کہ اس کی ماں منافقت کی دنیا سے چھپ کر در حقیقت اس کی چھوٹی سی آغوش میں پناہ ڈھونڈ رہی ہے.......... خود کو کسی نئے فریب اور دھوکے سے محفوظ سمجھ رہی ہے پتہ نہیں غلط کر رہی ہے یا درست مگر کوشش تھی.......... صرف کوشش..........

☆ ☆ ☆ ☆

وہ ایک اداس اور مغموم سی شام تھی۔ جب دن ڈھل رہا تھا شاہ جمال کی زندگی کا سورج ڈھل چکا تھا.......... مٹی کا وجود مٹی کے حوالے کر کے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ شاہ جمال جیسے بڑے عالی شان آدمی کے سب کاروباری دوست اپنی اپنی لمبی گاڑیوں میں بیٹھ کر جا چکے تھے.......... ان میں سے کچھ کو تو شاید آنے کی بھی فرصت نہیں تھی.......... اچھا ہی تھا کیونکہ دکھ کے اس مقام پر بھی ان کی خوفناک ہوس زدہ نظروں میں ارتقاء کے لئے وحشیانہ چمک تھی.......... سب کے جانے کے بعد تھکی ہاری افسردہ سی بیڈ روم میں آ گئی.......... یہ بڑے لوگوں کی دنیا ہے یہاں نہ سوگ میں کوئی ساتھ دینے والا ہوتا ہے اور نہ خوشی میں' واہ شاہ جمال آج تمہارا غرور اور تکبر بھی خاک میں مل گیا.......... اختتام ہو گیا تمہاری بادشاہت کا.......... دیکھ سکو تو دیکھو' کوئی تمہارے گھر افسوس کی حالت میں نہیں ماسوائے میرے' تم میں جو انفرادیت تھی وہ ختم ہو گئی۔

"اس طرح تاریک کمرے میں کیوں بیٹھی ہو۔" شارب نے لائٹ آن کی۔

"میرے مقدر کی تاریکی اس سے زیادہ گہری ہے۔ شارب۔" اس نے بھیگی پلکیں صاف کیں۔

"کچھ نہیں ہوا آپ کے مقدر کو' بس تقدیر کا فیصلہ تھا۔" وہ قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ہاں' مگر تقدیر میرے ساتھ بچپن سے اب تک ایسا کھیل کھیل رہی ہے۔"

"پلیز ارتقاء' اب خود کو سنبھالو' شاہ رخ کو تمہاری ضرورت ہے۔" اس نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور تھپتھپایا۔

"اگر تم بھی نہ ہوتے تو میں کتنی اکیلی ہو جاتی۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

"لیکن ایسا ہوا نہیں' میں بھی اب اکیلا نہیں۔" وفورِ مسرت سے بولا۔

"شارب' میرے ماں باپ نے میرا نام ہی غلط رکھا' میری ذات کا ارتقا جاری ہی ہے' ختم ہی نہیں ہوتا۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"انسان کی زندگی ارتقائی عمل جاری رکھتی ہے' ختم تو اختتام ہے انسان کا۔"

"مگر میرا سفر زیادہ بھیانک اور خوفناک رہا۔"

"کل گزر گیا' آج اور آنے والے کل پر نظر رکھو۔"

"شارب! بس اسی طرح مخلص رہنا۔" اس نے بھیگی پلکوں سے پوچھا۔

"یہ عہد ہے میرا.........." وہ جھک کر بولا۔ تو وہ معصومیت سے مسکرا دی۔

"اچھا چلو اب کچھ کھا لو۔" وہ بولا۔

"تم کھاؤ' مجھے بھوک نہیں۔"

"نہیں ایسا نہیں چلے گا' تھوڑا سا کھانا پڑے گا' اپنی حالت دیکھو۔" شارب نے ہاتھ پکڑ کر ٹھایا۔

"اچھا بابا تم چلو' میں آتی ہوں.........." اس نے کہا۔

"نہیں ساتھ' اب یہ ساتھ قائم رہے گا.........." وہ جذب کے عالم میں بولا تو وہ **ٹھٹھک** کر پرے ہو گئی۔ غور کرنے پر اس کی نظروں اور چہرے سے کچھ اور ہی عندیہ ا..........

"شارب! تم کہیں میرے احساس کو غلط تو نہیں سمجھ رہے۔"

"اگر ایسا ہے بھی تو حرج کیا ہے.........." چلتے ہوئے آہستہ سے اس نے جواب دیا۔

"حرج ہے' اپنے قدم یہیں روک لو' غلطی درست کر لو۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"نہ غلط ہے اور نہ ہی قدم رکنے کے لئے اٹھتا ہے' تاہم آپ اس کی ٹینشن نہ لیں فی الحال۔

اس نے ہر لفظ پر چبا چبا کر زور دیا.......... اور ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گیا..........

"شارب! اپنے اور میرے فرق اور رتبے کا خیال رکھنا۔" اس نے سخت تیکھے انداز میں کہا ر چاول پلیٹ میں ڈالنے لگی۔

"یہ آپ ہر وقت رتبے اور بڑے ہونے کا سبق پڑھاتی رہتی ہیں' مجھے یہ سبق نہیں ھنا۔" وہ چڑ کر بولا۔

"پلیز........." اس نے سرزنش کی۔

"او خدا کا نام لیں کیوں میرے پیچھے پڑگئیں ہیں۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

شارب بروقت کسی بات سے روکنا ضروری ہوتا ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں سمجھانا چاہا۔

"اور آپ کم از کم مجھے نہیں روک سکتیں۔" اس نے مکہ میز پر مارا اور اٹھ کر چلا گیا ....اس کے تیز قدموں کی دھمک سے ارتقاء کا دل دھک دھک کرنے لگا.........اس کی باتوں سے اسے خوف آنے لگا........."ارتقاء کوشش کرو کہ تم زیادہ بے تکلف نہ رہو' اسے باز رکھنا ضروری ہے۔" اس نے عہد کیا اور ہاتھ صاف کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر رات بھر وہ کروٹیں بدلتی رہی......... درد کی رات ویسے بھی لمبی اور اکتا دینے والی ہوتی ہے' انسان تھک جاتا ہے مگر رات ختم نہیں ہوتی ارتقاء بھی اسی کیفیت سے دو چار تھی ....کچھ بھی تو سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ چاروں طرف گھور اندھیرا تھا۔ "اے کاش کہیں سے سکینہ کا پتہ لگ جائے' میری تنہائی کم ہو جائے' وہ میرے پاس رہے۔" اس کے دل سے دعا نکلی ....اسی طرح کی باتیں سوچتے' بالآخر رات کٹ گئی.........شاہ رخ کو نہلا کر' فیڈر دے کر وہ اسے لئے لان میں آگئی......... صبح بہت خوبصورت اور دلفریب تھی......... پھولوں کی مہک باد صبا کے جھونکے......... نرم ٹھنڈی گھاس۔ آج آسمان پر بھی بادل تھے......... ہر طرف دودھیا اجالا......... ننگے پاؤں' ننھے شاہ رخ کی انگلی تھامے وہ چہل قدمی کرتی رہی.........

عبدل نے ناشتے کی اطلاع دی تو اس نے ناشتہ وہیں لان میں لانے کو کہا.........اور شارب کو بلانے کے لئے بھی کہا۔

"گڈ مارننگ۔" شارب بڑا فریش فریش خود بخود پہنچ گیا۔

"بیٹھو۔" اس نے اشارہ کیا۔

"ہیلو کڈ" شاہ رخ کے گال پر چپت لگائی۔ اسی اثنا میں عبدل ناشتہ لے آیا۔

"شارب فیکٹری کے تمام کام اب تم ہی کو سنبھالنے ہیں۔" ارتقاء نے اس کے لئے سلائس پر جام لگایا۔

"اوکے' لیکن ہمیں آپ کو سنبھالنا ہے۔" اس نے ذو معنی بات کی۔ اس کے ہاتھ رک گئے

ر نظریں اس پر جم گئیں۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کسی اچھی سی لڑکی سے تمہاری شادی کر دی جائے۔" اپنے طور پر بڑے خوشگوار موڈ میں بولی۔

"تم سے اچھی لڑکی کہاں ملے گی۔" اس نے برجستہ جواب دیا۔

"شارب' بدتمیزی مجھے پسند نہیں۔" اسے شدید غصہ آگیا۔

"یہ بدتمیزی نہیں ہے' میرے دل کا فیصلہ ہے۔" وہ بھی گھن گرج کر بولا۔

"اتنے بے حیا اور بے شرم ہو کہ تمہاری نظر سے رشتوں کا احترام اٹھ گیا۔" وہ بری طرح تھی۔

"بیکار ہیں یہ رشتوں ناطوں کے قصے' محبت اور دل سے جڑے رشتے ہوتے ہیں' آپ اس ے سے باہر نکل کر سوچیں۔"

"بکواس ہے یہ بات' تم گویا شاہ جمال کے مرنے کے منتظر تھے۔" اس نے طنز کیا۔

"نہیں' مگر میرا دل تمہیں دیکھ کر دھڑکتا تھا' نظریں ساکت ہو جاتی تھیں' یہ سچ ہے۔ اس نے ی آواز میں کہا۔

"مگر کان کھول کر سن لو' ہمارے درمیان نہ ایسا ہے نہ ہو گا۔" وہ سنجیدگی سے بولی اور جھٹکے اٹھی کہ وہ بھی اس کے مدمقابل کھڑا ہو کر تیزی سے بولا۔

"تمہیں میرے بارے میں سوچنا ہو گا۔" وہ گردن جھٹک کر تیز قدموں سے اپنے کمرے ئی اور وہ ننھے شاہ رخ سے باتیں کرنے لگا جو معصوم نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے ی کوشش کر رہا ہوں۔

☆ ☆ ☆ ☆

کئی ہفتے گزر گئے۔ شارب فیکٹری کے کام میں مکمل طور پر مصروف ہو گیا۔ وہ اس سے ویسے زاتی تھی۔ دونوں کے درمیان اس دن کے بعد کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ دونوں اپنے اپنے ڈٹے ہوئے تھے۔ ارتقاء یہ بے جوڑ دھوکہ پھر نہیں کھانا چاہتی تھی۔ وہ اسے پاکر زمانے ھوں سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ ارتقاء کے مقابلے میں اس کا انداز زیادہ جارحانہ تھا......... کھانا پینا سب اس نے چھوڑ رکھا تھا بس برائے نام گھر میں اس کی آمد ہوتی تھی۔ اس طرح

ذہنی طور پر وہ اسے پریشان کر رہا تھا۔ وہ خود سے لڑتے لڑتے تھک گئی تھی.......... "یا اللہ میں کیا کروں؟ کیسے اس ضدی لڑکے کو سمجھاؤں.......... ؟" وہ سر تھام کر رہ جاتی.......... اس کے اس طرح روٹھے روٹھے انداز پر اسے کبھی ڈھیروں پیار آتا اور کبھی غصہ.......... دراصل مرد ذات کے دو دھوکے کھانے کے بعد وہ کسی بھی مرد کو آزمانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ "پھر شارب کیوں چلا آیا؟ میرے مقفل دل کے دروازے پر کیوں سر ٹکرا رہا ہے؟ میں کسی لحاظ سے بھی اس کے برابر نہیں' وہ جوان ہے مجھ سے چھوٹا ہے' خوبصورت ہے' کنوارا ہے.......... اسے ایک سے ایک لڑکی مل سکتی ہے.......... پھر کیوں.......... ؟" بے اختیار ہی اس نے بڑے سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا.......... وہ کسی سے کم تو نہیں' تھوڑا سا عمر کا فرق تھا ورنہ بے پناہ دلکش اور خوبصورت حسین سراپے کی مالک.......... "ارتقاء بیگم' شاید یہی وجہ ہے کہ شارب تمہارے لئے مچلتے دل کو قابو میں نہیں کر سکتا۔ تم مان لو اس کی بات' شادی تمہاری تقدیر بدل جائے .... قدرت کو تم پر رحم آ گیا ہے۔ اتنی طویل زندگی کیسے گزارو گی؟ نہیں' اگر پھر ویسا ہی ہو گیا تو' میں یہ جوا نہیں کھیل سکتی.......... نہیں.......... پگلی مرد لاکھ دھوکہ دے مگر عورت نامکمل ہے۔ مرد کے بغیر' دھوکہ کھانے کے بعد بھی اس کی ذات کسی مرد کو ہی کھوجتی رہتی ہے' کیوں کسی عورت کی تلاش نہیں کرتی' یہ اصول فطرت ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ہیں' ہاتھ بڑھاؤ اور تھام لو اس کا ہاتھ۔ "مگر .... کیسے؟"

"پیار سے پکارو' منالو اسے' وہ جو محبت میں روٹھا ہوا ہے۔" دل نے چلا کر کہا.......... تو گویا اس کے جذبوں کو پہیے لگ گئے.......... چپل گھسیٹ کر تیز قدموں سے اس کے کمرے تک دوڑی..........

"شارب' شارب' تم جیت گئے۔" مگر وہ تو کمرے میں نہیں تھا۔

"عبدل' ستار' ستار۔" اس نے آوازیں لگائیں۔

"جی بیگم صاحبہ۔" ستار بھاگتا ہوا آیا۔

"شارب صاحب نہیں آئے۔"

"وہ تو جی رات گئے آتے ہیں۔" ستار نے جواب دیا۔

"شام کے سات بج رہے ہیں۔"

"پتہ نہیں جی۔"

"گاڑی نکلواؤ۔" اس نے شاہ رخ کو اٹھایا اور گاڑی کی طرف آ گئی.......... راستے بھر وہ گاڑی تیز چلانے کا کہتی رہی.......... دل کی بات مان کر کتنی بے چین اور بے قرار ہو گئی تھی.......... بس نہیں چلتا تھا کہ اڑ کر اس کے قریب پہنچ جائے اور چلا چلا کر کہے "شارب میں آ گئی ہوں' مجھے معاف کر دو" اس کا دل عجیب بے ہنگم انداز میں دھڑک رہا تھا.......... جونہی گاڑی فیکٹری گیٹ میں داخل ہوئی تو وہ بالکل گل رنگ ہو گئی۔ اس نے ڈرائیور کے پاس شاہ رخ کو چھوڑا اور تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے آفس تک پہنچی۔

فیکٹری میں چھٹی ہو چکی تھی صرف اس کا آفس ہی کھلا تھا.......... باہر رک کر اپنی سانس ہموار کرنا چاہی تو اندر سے آتی خاصی بلند آواز نے جیسے اس کے قدم جکڑ لئے..........

"میں کس طرح پہلے پہلے تمہاری محبت کا یقین کر لیتی۔" لڑکی کی آواز تھی۔

"مونا ڈیئر' میرے جسم و جاں سے تمہارے لئے محبت ٹپکتی تھی اور تم یقین نہیں کرتی تھیں۔" شارب کی رس بھری آواز ابھری۔

"دراصل' میڈم! میرا مطلب ہے مسز جمال میں آپ کی بہت زیادہ دلچسپی اور ویسے بھی تین چار روز میں بھلا محبت کیسے ہو سکتی ہے؟" لڑکی کی آواز میں تجسس تھا۔

"یہ سچ ہے کہ میں ارتقاء جمال میں دلچسپی لیتا تھا مگر تمہیں ملنے سے پہلے' جونہی تم تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح آئیں تو میں نے تمہارا اور ان کا موازنہ کیا.......... تم ہر طرح سے بے مثال لگیں۔ شارب کی مدہوش آواز اس کے کانوں کے پردے چیر گئی۔

"بھلا کیسے..........؟"

"میں نے سوچا کہ ارتقاء عمر میں بڑی' شادی شدہ' بے تکے رشتے کے بارے میں' میں نے سوچا کیسے' شاید میری عقل گھاس کھا گئی تھی.........." شارب نے کہا ساتھ ہی دونوں کا بلند بانگ قہقہہ گونجا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا.......... قدم ڈگمگانے لگے.......... بڑی مشکل سے تڑپتے دل کو ہاتھ سے دبایا' دیکھ لیا دل نادان' مرد کا تیسرا دھوکہ عمر کے نام۔" پلکوں

سے بے حساب موتی ٹوٹے۔ دامن سے صاف کرتے ہوئے شکست خوردہ قدموں سے گاڑی تک پہنچی۔

آج ایک مرتبہ پھر ارتقاء سرفراز.......... ایک عورت نے کم عمر مرد سے دھوکہ کھایا تھا.......... اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سڑک پر چلتے پھرتے تمام مردوں کو دیکھا اور سوچا۔ ”یہ مرد کبھی کیسے.......... کبھی کیسے ٹھکراتے ہیں، دھوکہ دیتے ہیں، محبت کا اعتبار کا رشتہ پامال کرتے ہیں.......... ہفتوں میں جذبوں کی آنچ سرد پڑ جاتی ہے۔“ درد سے بھری سوچ نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔

یہاں یہ اپنا کہیں تو کس کو عجیب دکھ ہے
شمار اب تو تمام رشتے تجارتی ہیں

گیت کا زخم

”بھابی، یہ کیا لاپرواہی ہے۔“ نیا کو جھاڑ پونچھ کرتے دیکھ کر شکیب حسن بے قرار ہو گیا۔ غم و غصے سے پاگل ہو گیا۔ ہمیشہ کی طرح نیا کے ہاتھ سے بیڈ شیٹ لے کر دور پھینک دی اور اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

”شکیب، پلیز میں بور ہو گئی ہوں فارغ رہ رہ کے۔“ نیا نے منت کی۔

”بور ہوں یا کچھ اور، میں آپ کو کوئی کام کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“ وہ ضدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”مجھے بہت احساس ہوتا ہے کہ گھر کے سارے کام تم کرتے ہو اور مجھے تو ہلنے بھی نہیں دیتے۔“ نیا بے بسی سے بولی۔

”بھابی۔ میں غیروں کے لئے تو نہیں کرتا۔ میرا سب کچھ تو آپ، بھیا اور آنے والا ننھا منا تحفہ ہیں۔ میری یہی چار دیواری تو جنت ہے۔ یہیں تک تو میری زندگی مقید ہے۔“ ایک دم ہی اس کا گلہ رندھ گیا اور نیا نے تڑپ کر اس کے ہاتھ تھام لئے۔

”پلیز شکیب تم میرے دیور نہیں بلکہ بھائی ہو۔ تم بن ہمارا جیون بھی ادھورا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، آئندہ مجھے کسی کام سے منع مت کیجئے گا اور آپ کے لئے تاکید ہے کہ مکمل آرام کریں۔ ڈاکٹر نے آرام کا مشورہ دیا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا اور نیا دکھ سے مسکرائی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنے فرشتہ صفت، بھائی جیسے دیور کی زندگی سے تاریک سائے نوچ کر پھینک دیتی۔ مگر کتنی مجبور تھی وہ۔

”اچھا اب آپ آرام کریں، میں کچن میں چلتا ہوں، بھیا آنے والے ہیں، اور ابھی سبزی بنانی ہے۔“ وہ بولا۔

"میں تمہارے ساتھ کچن میں چلتی ہوں' زیادہ نہیں سبزی۔"

"جی ہرگز نہیں' بس آپ آرام کریں۔ آپ کے پاس اس گھر کی امانت ہے' خوشی ہے میری۔ وہ ہم تک پہنچادیں پھر دیکھی جائے گی۔" وہ شوخی سے بولا تو نیا لجا کر رہ گئی۔

"اٹھیئے گا نہیں۔" وہ ہدایت کرتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا اور نیا وہیں اس کی محبت اور ہمدردی کے ہنڈولے میں جھولنے لگی۔

"کتنا احساس کرتے ہو تم ہمارا' ہرپل' ہر لمحہ' کیسی بے لوث محبت ہے تمہاری جس نے مجھ سے میرے میکے کی ہریاد چھین لی۔ کتنی اپنائیت ہے تمہارے اندر کہ سسرال میں اکیلے پن کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ کتنی خوش نصیب ہوں میں کہ بہاریں میری چوکھٹ پر صبح و شام دستک دیتی ہیں۔ چاہنے والا شوہر۔ قدم چومنے والا دیور' پھر بھلا مجھے اور کیا چاہئے؟ لیکن میں اندر سے اتنی خوفزدہ کیوں ہوں۔ تمہاری محبت دیکھ کر میری پلکیں بھیگ کیوں جاتی ہیں۔ مجھے تمہارے خلوص' تمہاری محبت' تمہارا وجود سراب کیوں لگنے لگتا ہے؟ خدا کرے تم اور تمہاری محبت اس گھر میں قائم و دائم رہے۔ اس نے نمکین پلکیں صاف کرتے ہوئے دعا مانگی اور بستر پر دراز ہوگئی

☆ ☆ ☆ ☆

پہاڑوں کے درمیان گھری وادی میں خوبصورت منفرد انداز میں بنا چھوٹا سا کاٹیج ہر آنے جانے والے کی توجہ کا مرکز تھا۔ کاٹیج جتنا خوبصورت باہر سے تھا اتنا ہی اندر سے خوبصورت تھا۔ وادی کا سارا حسن کاٹیج کی ہر کھڑکی سے نظر آتا تھا۔ اس وقت ہلکی ہلکی دھوپ پوری وادی پر پھیلی ہوئی تھی۔ کئی روز بعد دھوپ نکلی تھی اس لئے زندگی میں جیسے برقی رو دوڑ گئی تھی۔ نیا نہا کر بال پشت پر پھیلائے کھڑکی میں کھڑی ہو کر نظارہ کر رہی تھی۔ اس کے خوبصورت ہونٹوں پر دلفریب سی مسکراہٹ تھی۔ زوہیب حسن بڑی دیر سے اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھے مگر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر کھڑی تھی۔ بالآخر انہوں نے مضبوط بازوؤں کا وزن شانوں پر ڈالا تو وہ بری طرح چونکی۔

"آپ' آپ کب آئے؟"

"حضور بڑی دیر سے آئے ہوئے ہیں' جب آپ نے توجہ نہیں دی تو یہ گستاخی کرنی پڑی۔" وہ شوخی سے مسکرائے اور وہ جھینپ گئی۔

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ آج رات تک لوٹیں گے۔"

"ہاں۔ لیکن' ڈاکٹر احمد آگئے تھے لہٰذا وہ اپنی ڈیوٹی اب خود دیں گے۔ سو میں آگیا۔" وہ بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگے۔

"چلو اچھا کیا۔" وہ ان کے قریب قالین پر بیٹھتے ہوئے بے خیالی میں کہہ گئی۔

"کیوں خطرہ ہے کوئی؟" انہوں نے ذو معنی فقرہ اچھالا۔ تو وہ سرخ پڑ گئی۔

"جی نہیں۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا۔"

"تو پھر کیا مطلب تھا؟" وہ شوخی پر اترے ہوئے تھے۔

"کچھ نہیں بابا' آپ آرام کریں' میں چائے کا بندوبست کرتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"جی نہیں' چائے حاضر ہے' آپ تشریف رکھیں۔" اسی لمحے شکیب چائے ٹرے میں رکھے آگیا اور نیا گھور کے رہ گئیں

"یار شکیب' اس گھر میں کس چیز کی کمی ہے تو اپنی بھابی کے نخرے اٹھاتا ہے۔" زوہیب نے شکیب سے کہا۔

ایک چیز کی کمی ہے جو عنقریب پوری ہو جائے گی۔ پھر کون خدمت کرے گا بھابی کی' پھر تو میں اس پھول کی حفاظت کروں گا۔" شکیب شرارت سے بولا۔

"اچھا بابا منظور ہے۔" نیا نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"اچھا آپ چائے پئیں میں چلا۔" شکیب باہر نکل گیا اور زوہیب حسن کسی گہری سوچ میں کھو گئے۔ ایک دم ہی ڈھیر ساری زردی ان کے چہرے پر پھیل گئی اور وہ حد درجہ افسردہ دکھائی دینے لگے۔ نیا بھی ملول سی چائے کے گھونٹ لینے لگی۔

"نیا' مجھے اندر ہی اندر یہ غم کھائے جارہا ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں لیکن کتنی بے سکون رہتی ہے زندگی۔" وہ کھوئے کھوئے سے بولے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں بھی خوف کے حصار میں رہتی ہوں۔" وہ سراسیمگی کی سی کیفیت میں بولی۔

"میں بہت متفکر ہوں۔ شکیب کے لئے۔" وہ مغموم سے بولے۔

"میں نے تو بار بار آپ سے کہا ہے کہ اسے کسی نہ کسی طرح باہر بھیج دیں' لیکن۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے' وہ مانتا ہی نہیں۔" زوہیب حسن دل گرفتگی سے بولے۔ نیا خاموش ہوگئی۔

"خیر اللہ مالک ہے' اللہ اس کا نگہبان ہے' وہی قادر مطلق اس کی خطا معاف کر سکتا ہے۔" وہ حوصلے یکجا کر کے بولے اور نیا نے پرخلوص انداز میں آمین کہا۔

"بھابی' بھیا۔ آجائیں کھانا تیار ہے۔" اس کی آواز آئی تو نیا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اٹھئے کھانا کھالیں۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا تم جاؤ۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ شکیب پریشان ہو جائے گا۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔ چلو پھر تھوڑا بہت کھالیتا ہوں۔" وہ شکیب کی پریشانی کے خیال میں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ میز پر کھانا چنے محبت پاش نظروں سے ان کا استقبال کر رہا تھا۔ زوہیب نے وفور محبت سے اسے کھینچ کر سینے سے لگالیا اور پھر وہ دن آگیا جس دن کا شکیب کو شدت سے انتظار تھا۔ اس کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ زوہیب' نیا کو ہسپتال لے جانے لگے تو وہ مچل اٹھا۔

"بھیا' میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

"نہ' نہ' نہیں شکیب۔" زوہیب کی بجائے نیا پکار اٹھی۔

"پلیز بھابی۔ میں سب سے پہلے اس معصوم فرشتے کی آواز سننا چاہتا ہوں۔" وہ التجا کرنے لگا۔ پھر زوہیب اور نیا کے سمجھانے بجھانے سے وہ مجبور ہو گیا اور ان کے ساتھ ہسپتال جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

جونہی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوئی شکیب نے سجدے میں سر رکھ دیا۔ رو رو کر خدا تعالیٰ سے اپنی بھابی اور بچے کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگا۔

تیسرے دن نیا ایک پیاری سی گول مٹول بچی کو سنبھالے واپس گھر آئی تو شکیب نے بڑھ کر اس کو آغوش میں لے لیا۔ وہ بے اندازہ خوش تھا۔ اس نے جھک کر اپنے ہونٹ بچی کی پیشانی پر رکھ دیئے اور نیا کو مخاطب کر کے بولا۔

"بھابی بس آج سے یہ میرے پاس رہے گی۔" نیا کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"بچے پالنا مردوں کے بس کا نہیں۔ یہ کام صرف عورتوں کو سجتا ہے اور وہی کر سکتی ہیں۔"

"خیر آپ دیکھئے گا۔ ہر کام جذبے سے ہوتا ہے اور میں اس گلاب کی کلی کے لئے اپنی جان تک قربان کر دوں گا۔ شکیب نے ایک بار پھر بچی کو بھینچ کر اسے چوم لیا۔

رات کو کافی دیر میں زوہیب حسن واپس آئے تو سیدھے اس کے کمرے میں آگئے وہ اور بچی دونوں بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ انہیں تعجب ہونے لگا کہ بچی نے ماں کی کمی بالکل محسوس نہیں کی۔ کتنی شدت ہے تمہارے جذبوں میں! انہوں نے دھیرے سے سوچا اور اپنے کمرے میں آگئے۔

اگلی صبح نیا بیدار ہوئی تو شکیب نے پوری توجہ کے ساتھ اس کی خدمت کے لئے خود کو مصروف کر دیا۔ اسے بستر پر جیسے پابند کر دیا۔ اس وقت بھی وہ ذرا دیر کو اٹھ کر کچھ چیزیں سمیٹنا چاہتی تھی کہ وہ آدھمکا۔ زوہیب اخبار پڑھ رہے تھے۔

"کمال ہے بھیا۔ آپ کو احساس ہی نہیں کہ بھابی بستر سے اٹھ گئی ہیں۔" وہ بھائی پر برس پڑا۔

"او' یار میں دراصل اخبار میں گم تھا۔" زوہیب بوکھلاتے ہوئے بولے۔

"تو کیا تم مجھے بیمار بنانا چاہتے ہو۔" نیا نے ہنس کر پوچھا۔

خدا نہ کرے بھابی' آپ کو کبھی چھینک بھی آئے۔" وہ تیزی سے بولا۔

"اچھا بابا' یہ بتاؤ کہ تمہاری بھتیجی اس وقت کیا کر رہی ہے۔" نیا نے پیار سے کہا۔

"وہ سوئی ہوئی ہے۔"

"یار' اس کا کوئی نام تو رکھ لو۔" زوہیب نے اخبار پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

"جی ہاں' میں نے رکھ دیا ہے۔"

"ہمیں بھی تو پتہ چلے۔" نیا نے کہا۔

"ہوں' اس کا نام' یہاں کی حسین وادیوں میں گنگنانے والا گیت ہے۔" وہ مسرور سے انداز میں بولا۔

"یعنی 'گیت' اپنے چاچو کی زندگی کا خوشیوں بھرا گیت۔" وہ بڑے جذبے کے عالم میں بولا اور زوہیب اور نیا نے ستائشی انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"اگر آپ دونوں کو اعتراض ہو تو نام تبدیل کر دیں۔"

"جی نہیں' وہ چاچو کی جان ہے' چاچو کا گیت ہے' ساز ہے' وائلن ہے۔" زوہیب شرارت میں کہتے چلے گئے اور نیا کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"ارے یاد آیا شکیب بڑے دنوں سے تمہارا وائلن نہیں سنا۔" نیا نے کہا۔

"کل تک مجھے وائلن کی شدت سے طلب تھی لیکن اب اس میں کسی حد تک کمی واقع ہو گئی ہے۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"یار' ہمارا تو وائلن سننے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔" زوہیب نے اس کی دلجوئی کے لئے کہا۔

"ٹھیک ہے رات کو سنا دوں گا۔ اس وقت نہیں گیت کے فیڈر کا وقت ہے۔" وہ آہستہ سے کہہ کر اٹھنے لگا۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں' شکیب کاش تم نے وہ سب نہ کیا ہوتا۔ زندگی کی وسیع اور خوبصورت راہوں کو مسدود نہ کیا ہوتا۔" نیا ترحم سے بولی۔ تو وہ ہولے سے ہنس دیا۔

"بھابی' میری تقدیر کی سیاہی کوئی دھو نہیں سکتا۔"

"ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ تم آج باہر کے ملک چلے جاؤ' زندگی کی ویرانی' یہ سناٹا' ساری تنہائی ختم ہو جائے گی۔ کوئی خطرہ بھی نہیں ہو گا۔" زوہیب مغموم ہو گئے تھے لیکن اس کا حوصلہ بڑھانا ضروری تھا۔ آخر وہ ان کا اکلوتا بھائی تھا

"نہیں بھیا۔ پہلے آپ لوگوں کے لئے ایسا نہ کر سکا اب۔ اب تو گیت میرے پیروں کی زنجیر ہے۔ میں سمجھتا ہوں جو ہوتا ہے' ہو لیکن گیت سے جدائی منظور نہیں۔" وہ ٹھوس انداز میں کہتا ہوا باہر نکل گیا اور زوہیب خلاء میں کچھ تلاش کرنے لگے۔

☆ ☆ ☆ ☆

دن پر لگا کر اڑتے چلے گئے شکیب نے مکمل طور پر گیت میں خود کو مدغم کر لیا تھا۔ اسے اپنے ذات کا حصہ بنا لیا تھا۔ صبح سے لے کر شام تک وہ اسے کھلانے' پلانے' نہلانے میں مصروف رہتا۔ گھر کی کچھ ذمہ داری لڑ جھگڑ کر نیا نے اپنے سر لے لی تھی۔ لیکن گیت سے وہ بالکل دستبردار ہو گئی تھی۔ شکیب کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ کس وقت سے اس کی گود میں بٹھائے یا نہ بٹھائے۔ نیا اور زوہیب نے بالکل بھی خیال نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ حد درجہ مطمئن تھے کہ گیت کے آجانے سے شکیب کی تنہائی اور بے چینی میں کمی آگئی تھی۔ وگرنہ گھر میں قید انسان کی کیا زندگی ہوتی ہے۔ دن

بھر اس کی مصروفیت گیت کی وجہ سے بڑھ گئی تھی۔ گیت اس قدر اس سے مانوس ہو گئی تھی کہ نیا کی گود میں زیادہ دیر نہ ٹھہرتی۔ جونہی قریب سے شکیب کی آواز یا قدموں کی آہٹ محسوس کرتی۔ رونا شروع کر دیتی۔ گول مٹول' سرخ و سفید گیت کی آواز جونہی وہ سنتا سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس کے پاس پہنچ جاتا۔

"شکیب! وہ زندگی کے بارے میں اب تمہارا فیصلہ کیا ہے؟"

گیت نے جیسے ہی چلنا شروع کیا تو شکیب خوشی سے پاگل ہو اٹھا۔ پورے گھر میں اس کے چکر لگوائے۔ جب وہ گود میں آئی تو اس کے ننھے منے پیر چوم لئے۔ دیوانگی میں آنکھیں بھیگ گئیں۔ پاس بیٹھی نیا تڑپ اٹھی۔

"شکیب یہ کیا کیا تم؟"

"کچھ نہیں بھابی۔ بس خوشی میں ایسا ہو گیا۔" وہ پلکیں صاف کرتے ہوئے بولا۔

"تمہاری آنکھیں بھیگیں اور وجہ کچھ نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔" وہ مضطرب سی اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"بس ویسے ہی' سوچتا ہوں' گیت بھاگنے لگی ہے' یہ ننھے منے قدم بھاگتے بھاگتے بڑھ جائیں گے اور میں جوان قدموں سے چلنے کی امید پر خوش ہوں۔ ایک روز اپنے انہی جامد' زنجیروں میں جکڑے پیروں پر کھڑا رہ جاؤں گا۔" وہ بہت دور نکل گیا نیا دکھ سے ہنس دی۔

"شکیب ہم گیت کو ان راہوں پر بھاگنے نہیں دیں گے۔ وہ تمہارا سایہ ہے تمہارے سنگ رہے گی۔"

"خدا نہ کرے بھابی کہ میرا سایہ بن کر رہے۔ میں اس کی آزاد زندگی پر پہرے کیوں بٹھاؤں؟"

"دیکھو ابھی تو بہت چھوٹی ہے۔ اس کے رخصت ہونے میں بہت وقت ہے۔ تم ابھی سے افسردہ کیوں ہوتے ہو۔" نیا نے عین اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جہاں ویرانیاں سمٹی ہوئی تھیں۔

"اچھا میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" وہ ایک دم تروتازہ ہو گیا۔

"ہونہہ' جس کے پر بندھے ہوں وہ بھلا کیا فیصلہ کرے گی؟" وہ کربناک لہجے میں بولا اور نیا نے پھر بھی وہ خواہش سنا ڈالی جسے وہ عرصے سے دبائے ہوئے تھی۔

"شکیب تم شادی کر کے باہر چلے جاؤ' بلکہ ہم بھی چلتے ہیں۔"

"نہیں بھابی ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایک معصوم وجود میرے حوالے سے کیوں پستیوں اور رسوائیوں کا بوجھ اٹھائے اور یہ آپ خواب وخیال کی باتیں کب سے کرنے لگیں۔"

"تم کیا سمجھتے ہو کوئی لڑکی نہیں ملے گی کیا؟" اس نے کریدا۔

"یہ میں نے کب کہا ہے' لیکن بھابی ٹمٹماتے ہوئے چراغ سے کب تک روشنی کی توقع کریں گی آپ؟" وہ دکھی سا فرش پر کھیلتی گیت کے قریب بیٹھ گیا۔

"قدرت رحم کرنے والی ہے' تمہارے اندر حوصلہ ہونا چاہئے۔"

"ساری حقیقت سننے اور جاننے کے باوجود آپ کتنی پرامید ہیں میری زندگی کے لئے۔ جب کہ میں ہر آہٹ پر' یہاں تک کہ ہوا کے جھونکے پر اپنی سانس ہموار کرتا ہوں۔"

"اتنا مایوس نہیں ہونا چاہئے۔" نیا کی آواز رندھ گئی۔

"نہیں میری مایوسی گیت کی خوشیوں پر اپنا احساس کھونے لگی ہے مگر پھر بھی جانے والے مسافر کا کیا بھروسہ نہ جانے کب جانا پڑ جائے۔ اتنا وقت بھی نہ جانے کس طرح دبے قدموں سے گزر گیا۔"

"اوہو یہ دیور بھابی میں کیا مذاکرہ چل رہا ہے؟" کمرے کی فضا ان کے آنے سے تبدیل ہوگئی۔ نیا نے جلدی سے ہونٹوں پر مسکان سجائی اور نم آلود آنکھیں صاف کیں۔ شکیب بھی بشاشت چہرے پر لانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

"کچھ نہیں بس ہم گپ شپ کر رہے تھے۔" نیا نے بات بنائی۔

"اچھا جناب' تو پھر اسی خوشی میں ایک کافی ہو جائے۔" زوہیب حسن نے ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے فرمائش کی۔

"ابھی لے کر آتی ہوں۔" نیا اٹھ کر جانے لگی کہ شکیب بول پڑا۔

بھابی آپ ٹھہریں' میں لے کر آتا ہوں آپ گیت کا خیال رکھیں۔" ساتھ ہی وہ باہر نکل گیا۔

نیا باتوں میں مصروف ہوگئی اسے خیال ہی نہ رہا کہ کب گیت کھیلتی کھیلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ پتہ اس وقت چلا جب اس کے زور سے رونے کی آواز آئی ساتھ ہی کسی برتن کے فرش پر گرنے اور شکیب کی دلخراش چیخ بھی بلند ہوئی۔ نیا اور زوہیب دوڑ کر باہر آئے۔ گیت برآمدے

کی سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ سیڑھیاں تو صرف تین تھیں۔ مگر چھوٹا بچہ کچھ چوٹ اور کچھ خوف سے رونے لگتا ہے۔ شکیب ان دونوں سے پہلے وہاں پہنچ کر گیت کو گود میں اٹھائے چپ کرا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ کربناک انداز میں ہونٹ بھی چبا رہا تھا۔

"شکیب تمہیں کیا ہوا؟"

"بس وہ گرم پانی میرے اوپر گر گیا۔ میرے پیر اور ہاتھ کچھ متاثر ہوئے ہیں۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

"نہیں' نہیں' یہ جھوٹ ہے' تمہارے پیر بری طرح جھلس گئے ہیں۔" نیا تڑپ کر بولی اور گیت کو اس سے لے لیا۔

"چلو اٹھو برنال وغیرہ لگا دوں' تم نے تو گیت کو اپنے اعصاب پر سوار کر لیا ہے۔" زوہیب آہستہ سے بولے۔ اور اس کا بازو تھام کر اندر اپنے کمرے کی طرف لے گئے۔ تکلیف کی شدت سے وہ سسکاریاں ہی بھر رہا تھا۔ قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ نیا کی آنکھیں بھر آئیں اور حلق بھی اندر سے رندھ گیا۔ گیت کو زیادہ چوٹ نہیں لگی تھی۔ تھوڑا سا رو کر وہ نیا کی گود میں سو گئی۔ نیا نے اسے بستر پر سلا کر ٹھیک طرح سے کمبل اڑھا دیا اور شکیب کے کمرے میں آ گئی۔ زوہیب خاموش' خاموش اس کے پیروں پر برنال لگا رہے تھے۔ اور وہ ایک ٹک چھت کو گھور رہا تھا۔ نیا س کے سرہانے بیٹھ کر بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"بھابی آپ کی یہی محبت تو مجھے مرنے نہیں دیتی۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"خدا نہ کرے کہ تمہیں کچھ ہو۔" نیا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"یار شکیب کیوں اس بے وقوف عورت کو پریشان کرتے ہو۔" زوہیب نے مذاقاً کہا۔

"نہیں بھیا' میں سچ کہہ رہا ہوں کہ یہ عظیم ماں ہیں میری جنہوں نے میرے وجود کی ہر تاریکی اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔" وہ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر نیا کے ہاتھ چومنے لگا۔

"تم منفی سوچیں ترک کیوں نہیں کر دیتے۔ تم اتنے بڑے مجرم بھی نہیں۔" نیا بے چینی سے ہونٹ چبانے لگی۔

"شکیب میرے بھائی جب تک بھی یہ بھائی تمہیں محفوظ رکھ سکا۔ ضرور رکھے گا اگر کبھی ایسا وقت آ گیا تو مجھے معاف کر دینا۔ میرا بس چلے تو ساری دنیا سے دور کہیں تمہیں چھپا دوں۔ اپنی

آنکھوں میں بسالوں۔ مگر شاید یہ میرے بس میں نہیں۔" زوہیب حسن کے لہجے کی نمی ان دونوں نے واضح طور پر محسوس کی۔

"بھیا جب تک میری زندگی ہے کوئی مجھے نہیں چھو سکتا پھر آپ پریشان کیوں ہیں؟" شکیب نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن تمہاری زندگی کی یہ محرومیاں کیسے برداشت کریں۔" نیا دکھ سے بولی۔

"جس طرح میری وجہ سے سب خطرات برداشت کئے ہیں، اذیتیں برداشت کی ہیں۔" وہ آنکھیں موند کر بولا۔ زوہیب اور نیا نے تاسف سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اسے غنودگی میں دیکھ کر وہ اپنے کمرے میں آگئے۔

☆ ☆ ☆ ☆

اور پھر ماہ و سال برق رفتاری سے بھاگتے چلے گئے۔ ہر، ہر دن کے ساتھ شکیب کے دل میں گیت کی محبت ترقی کرتی رہی اور ہر ڈھلتی رات میں وہ کھلے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اس کی طویل عمر کی دعائیں کرتا محبت کا یہ انداز، یہ رنگ روپ کبھی دیکھنے سننے میں نہیں آیا تھا۔ گیت جو کہ اب تقریباً پانچ برس کی ہوگئی تھی۔ شکیب سے خوب باتیں کرتی تھی۔ ہروقت اس کے پہلو سے لگی رہتی اور جب اس سے میٹھی میٹھی زبان میں باتیں کرتی تو وہ نہال ہوا اٹھتا۔ پھر تو وہ دن کو رات کہتی تو وہ رات کہتا اور اگر رات کو دن کہتی تو وہ اثبات میں گردن ہلانے لگتا۔ گیت ہر طرح اس سے خوش تھی۔ صرف ناراضگی تھی تو وہ اتنی کہ وہ اسے بازار لے کر نہیں جاتا تھا۔ اس ناراضگی کا اظہار وہ کئی مرتبہ کر چکی تھی۔ اور نیا ایسے میں بڑی مشکل سے اسے بہلاتی، جب نیا سے کوئی جواب نہ بن پاتا تو زوہیب کی طرف اسے ٹال دیتی عموماً زوہیب بھی آئیں بائیں شائیں کرنے لگتے۔ کبھی تو وہ بہل جاتی اور کبھی ہنستے ہنستے سے اکھڑ جاتی۔

اس دن ٹی وی لاؤنج میں نیا گیت کا سویٹر بنا رہی تھی۔ تب ہی شکیب بیٹھا وائلن کے سروں میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی گود میں سر رکھے گیت بڑی دیر سے خاموش لیٹی تھی۔ جوں جوں سوز بڑھ رہا تھا۔ شکیب کسی دوسری دنیا میں گم ہوتا جارہا تھا۔ اس کے چہرے کا درد سروں میں بکھر کر دلوں میں تڑپ پیدا کررہا تھا۔ نیا بھی سلائی منہ میں ڈالے اس کے زرد، زرد چہرے پر بیتے

وئے خوبصورت دس سال تلاش کررہی تھی جو زمانے بھر کی بدصورتی اس کے دامن میں ڈال ئے تھے۔ جوانی کے بھرپور سال، تنہائی کے زہر سے نیلے پڑ گئے تھے۔ خوبصورت کتابی چہرہ، بڑھی ئی بے ترتیب شیو اور زردیوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے دنیا سے کٹ سا گیا ا۔

"اسٹاپ۔" گیت ایک دم چلائی تو وہ جیسے ایک دم گہری محویت سے بیدار ہوگیا۔ نیا بھی نک گئی۔

"چاچو، اب بس کریں۔" وہ ٹھنکی۔ اس کے کہنے پر شکیب نے فوراً وائلن پرے ہنک دیا اور اسے گود میں بھر کے پیار کرنے لگا۔

"چاچو کی جان، بس اب ٹھیک ہے، بولو اب کیا کریں؟"

"اوں، ہوں۔ میں سوچ لوں۔" وہ ہونٹوں پر ایک انگلی رکھ کے معصومیت سے کسی سوچ ں پڑگئی۔

"بس اب کوئی فرمائش ہوگی۔" نیا نے ہنس کر کہا اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

"مما آپ چپ رہیں۔ یہ میرا اور چاچو کا معاملہ ہے۔" وہ آنکھیں مٹکا کر اپنے مخصوص توتلے ز میں بولی۔

"بالکل، بھابی صاحبہ آپ چپ رہیں۔" شکیب نے اس کی حمایت کی تو اس نے جھٹ اس دن میں بانہیں ڈال دیں۔

"چاچو سیر کرنے لے چلو۔"

"کیا، گیت ہر روز ایک ہی رٹ ہوتی ہے تمہاری۔" شکیب سے پہلے نیا بول پڑی۔

"کیوں" آپ کو کیا ہے۔" وہ ٹھنکی۔

"کہا جو ہے کہ چاچو باہر نہیں جائیں گے۔" نیا نے سرزنش کی۔

"کیوں؟" وہ چلائی، دراصل شکیب کی حد درجہ توجہ نے اسے خود سر بنا دیا تھا۔

"ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔" وہ غیر دانستہ طور پر کہہ گئی۔

"جھوٹ۔" وہ منمنائی۔

"پلیز بھابی۔ کچھ نہیں ہوتا' میں لے جاتا ہوں' رات ہو رہی ہے' جلدی واپس آجائیں گے۔" شکیب نے بات بنانا چاہی۔

"ہرگز نہیں' شکیب یہ تو پاگل ہے' تم کچھ تو ہمارا خیال کرو۔" نیا برا مناتے ہوئے بولی۔

"بھابی' بھابی۔"

"مت کچھ کہو' بس اگر اس کا جانا بہت ضروری ہے تو اپنے پپا کے ساتھ چلی جائے گی' وہ آتے ہی ہوں گے۔" نیا نے دو ٹوک فیصلہ سنادیا۔ ساتھ ہی گیت نے ٹھنکنا شروع کر دیا۔

"پلیز بھابی میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"مجھے کوئی بات نہیں سننی۔ بس کرنے دو اسے ضد' تمہارے لاڈ نے اسے بالکل بدتمیز بنادیا ہے۔ لاکھ سمجھاؤ ایک ہی تان ملاتی ہے۔" نیا غصے سے کہتی نئی اون اور سلائیاں اٹھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور شکیب خاموش ہو گیا۔ لیکن گیت نے گلا پھاڑ پھاڑ کے رونا شروع کر دیا۔ اس کا رونا شکیب کے اندر بھونچال پیدا کرنے لگا۔ اسے لاکھ چمکارا مگر وہ روتی ہی جا رہی تھی۔

"گیت' میری جان' اب چپ ہو جاؤ' دیکھو مما کی بات کا برا نہیں مانتے۔"

"مما گندی ہیں' آپ کو جانے نہیں دیتیں' چاچو ڈاکٹر کیا آپ کو مارے گا۔" وہ جونہی روتے روتے اٹک اٹک کر بولی تو وہ اسے سینے سے بھینچ کر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ گیت کے لئے تو وہ موت کو بھی گلے لگا سکتا تھا۔ اسی تحریک نے اسے دبے قدموں سے دس سال کے بعد باہر کی دنیا میں قدم رکھنے پر مجبور کر دیا نئی دنیا' نئے دور اور نئے تقاضوں نے اسے بری طرح بوکھلا دیا۔ سیاہ گرم شال چہرے تک اچھی طرح لپیٹے وہ گیت کو سیر کراتا رہا۔ وہ بہت خوش معلوم ہو رہی تھی۔ کافی دیر بعد وہ اسے لئے گھر لوٹ آیا۔

اس نے ڈرتے' ڈرتے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھائے تو زوہیب اور نیا بیک وقت چلائے۔

"شکیب یہ کتنی غلط حرکت کی ہے تم نے۔"

"کچھ نہیں ہوتا۔ آپ اطمینان رکھیں۔" وہ مدھم لہجے میں بولا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو تم' اور گیت کی جا بے جا ضدیں پوری کرنا اتنا ضروری بھی نہیں۔" زوہیب حد درجہ برہم نظر آرہے تھے۔

"نیا نے غصے سے گیت کے گال پر ایک چپت رسید کر دی اور اس کا الارم بجنے لگا۔

"پلیز بھابی' آپ نے اچھا نہیں کیا' اس کا کیا قصور ہے۔ اس کے لئے تو میں بڑے سے بڑے خطرے مول لینے کو تیار ہوں۔" وہ اس کا رخسار چومتے ہوئے کمرے میں چلا گیا اور اسے بمشکل بہلا کر بستر پر لٹا دیا پھر خود اس کو دودھ لانے کا کہہ کر کچن میں چلا گیا۔ لیکن جب دودھ لے کر واپس آیا تب تک وہ سو چکی تھی۔ اسے بہت افسوس ہوا لیکن نہ تو اسے بے آرام کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کا بھوکا سونا اچھا تھا۔ اسی کشمکش میں وہ ساری رات دودھ کا گلاس لئے اس کے سرہانے بیٹھا رہا۔

صبح نیا نماز سے فارغ ہو کر جونہی اسے جگانے کے لئے آئی تو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ رات بھر ایک ہی زاویئے سے بیٹھا رہا تھا۔ نیا نے آہستہ سے شانہ ہلایا۔ تو وہ چونک کر دیکھنے لگا۔

"یہ کیا حماقت ہے؟" وہ ڈپٹ کر بولی۔

"صبح بخیر۔" وہ خوشگواری سے بات بدل گیا۔

"اللہ جانے تم کب سدھرو گے شکیب۔" نیا بےزار سی باہر چلی گئی اور وہ بھی اٹھ کر نہانے کے لئے باتھ روم میں گھس گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆

دسمبر کا نہایت خوشگوار اور چمکدار دن تھا۔ چمکیلی سنہری دھوپ میں گرمی کی سی تمازت جسموں کو بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ نیا اور شکیب گھر کے سارے کام نپٹا کر برآمدے میں پڑی رسیوں پر بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ گیت کے سکول سے واپس آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ کیب کی نظریں بار بار دروازے پر جا کر ٹھہر جاتیں۔ باتیں وہ نیا سے کر رہا تھا۔ لیکن دھیان گیت کی رف لگا تھا۔ اس کے سکول سے واپس آنے تک وہ بےکل سا پھرتا رہا۔ اس کی پسند کی ڈھیروں یزیں میز پر سجائے بےچین نظروں سے دروازہ تکنا اس کا معمول تھا۔

جیسے ہی گاڑی نے ہارن دیا۔ وہ لپک کر گاڑی کے قریب پہنچ گیا۔ گیت فوراً گود میں سوار گئی' اس نے زوہیب کو سلام کیا مگر وہ بہت خاموش تھے' موڈ خراب معلوم ہو رہا تھا۔ وہ تیزی ے ڈگ بھرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے اور وہ پریشان پریشان سا گیت کا یونیفارم تبدیل ا کے اسے کھانا کھلا کے بھائی اور بھابی سے کھانے کا پوچھنے گیا تو باہر ہی رک گیا۔

"تم سمجھنے کی کوشش کرو کہ وہ ہمیں کتنا عزیز ہے' اور کس طرح سب دنیا سے کٹ کر ہم اسے عزیز رکھے ہوئے ہیں' تم خود پڑھ لو' اس کے ذرا سے رات کے باہر نکلنے پر یہ خبر بن گئی۔ اگر روز باہر آئے جائے گا تو سمجھ لو کہ شکیب ہم سے دور ہو جائے گا۔" زوہیب پوری رفتار سے بولے جا رہے تھے اور نیا کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

"آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ آئندہ میں اسے ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ وگرنہ ذمہ دار بھی ہر بات کے ہم ہوں گے۔ یا تو بزدلی کی نہ ہوتی۔ اب تو تاحیات یہ خیال رکھنا پڑے گا کہ' اور تم کیسی عورت ہو کہ ایک بچی کو نہیں سنبھال سکتیں' گلا دبا دو اس بدتمیز کا جس نے مشکل پر مشکل پیدا کرنے کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔" زوہیب شدید غصے کا شکار معلوم ہوتے تھے۔ وہ دل گرفتہ سا واپس پلٹ آیا۔ اور آنکھیں موند کر سوچوں میں گم ہو گیا۔

"بھیا' کب تک' کب تک آپ حقیقت سے نظریں چرائیں گے' میری وجہ سے بیٹی کا گلا بھی دبا دینا چاہتے ہیں۔ کتنے عظیم ہیں آپ اور میں کتنا کمینہ کہ میں نے ہی یہ خوف اور پریشانی کی تلوار' آپ کے سر پر لٹکائی۔ کاش میں نے آپ کی نصیحت پر عمل کیا ہوتا' میں کتنا برا ہوں' اپنے ساتھ ساتھ آپ پر بھی خوشیوں کے راستے بند کر چکا ہوں' خود تو تہی دست ہوں ہی آپ لوگوں کو بھی تہی داماں کر دیا ہے۔ میری وجہ سے آپ مزید مشکل میں نہیں پڑیں گے۔ میں گیت کے لئے آپ کی غلط سوچ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ واقعی میرے خشک' پپڑی زدہ ہونٹوں کا تبسم ہے' خوشی کا گیت ہے' زندگی کی علامت ہے' میں اپنی گیت کو سمجھا دیا کروں گا۔" کافی دیر بعد وہ سوچوں سے آزاد ہوا اور نئے حوصلے لے کر کام میں مصروف ہو گیا۔

رات کو کھانے پر زوہیب کا موڈ بحال تھا۔ وہ کافی خوشگوار لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ نیا بھی کچھ مطمئن نظر آ رہی تھی۔ مگر وہ صرف گیت کی ذات تک محدود تھا۔ چھوٹے چھوٹے نوالے اس کے منہ میں ڈال کر اس پر جھک کر پیار کرتا۔

"یار شکیب پانچویں کلاس میں پڑھنے والی بچی کو کب تک نوالے کھلاؤ گے؟" زوہیب نے ہنس کر پوچھا۔

"جب تک میں زندہ ہوں۔" وہ مختصر جواب دے کر پھر مصروف ہو گیا۔

"اللہ تاحیات تمہیں زندہ سلامت رکھے۔" نیا نے بے ساختہ کہا۔

"چاچو' آپ کہیں جائیں گے تو نہیں؟" گیت اٹھلا کر بولی۔

"ہاں بیٹے' جب تک تم نہیں چاہو گی میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" وہ کرب سے مسکرایا۔

"شکیب اب گیت کافی بڑی ہو گئی ہے اسے علیحدہ سلایا کرو' تمہیں ڈسٹرب کرتی ہو گی۔"

"نہیں بھیا' گیت میرے وجود کا حصہ ہے اسے میں خود سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔"

"اچھا ٹھیک۔ ہمیں کیا!" نیا نے فوراً اس کی بات سنبھال لی۔

"بھابی جس کے پاس زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا' اس بچی کی صورت میں اسے مقصد مل گیا ہے' پھر بھلا میں کیا کروں؟" وہ سادگی سے سوال کر رہا تھا۔

"چلو جی' جو چاہے کرو' ہم تو گیت کے جہیز میں اس کا چاچو دے دیں گے۔" زوہیب نے مذاقاً کہا اور ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"گیت بیٹے! ہوم ورک کر کے سونا ہے۔" نیا ہدایت کر کے چلی گئی۔

"چاچو' آپ یہ سیاہ چادر کیوں اوڑھے رہتے ہیں؟" گیت نے برجستہ پوچھا اور وہ گڑ بڑا گیا۔

"بس بیٹا' ویسے ہی' سیاہ بخت لوگوں کی علامت یہی ہوتی ہے۔" وہ مدھم لہجے میں بولا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے خاموش رہی۔

نیا نے کافی کا کپ شکیب کو پکڑاتے ہوئے وائلن بجانے کی فرمائش کر دی۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے آج پھر وہی درد بھری دھن چھیڑ دی۔ دل کا درد سروں میں ڈھل کر مفہوم پیش کرنے لگا۔

محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے
بڑی چوٹ کھائی جوانی پہ روئے

رات کے سناٹے میں سوز میں ڈوبا ساز دور دور تک فضاؤں میں درد پھیلا رہا تھا۔ زوہیب اور نیا پر جیسے سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ وہ خود تو جیسے شدید کربناک لمحات سے گزر رہا تھا۔ رخساروں پر جھکی پلکیں سختی سے بھنچے ہوئے ہونٹ' لرزتا ہوا جسم بہت سی کہانیاں سنا رہا تھا۔ اس قدر

اضطراب تھا اس کی انگلیوں میں۔ ہاتھوں میں کہ نیا نے ایک دم اسے روک دیا۔ اس کے ہاتھ رک گئے مگر آنکھیں بند رہیں۔

"چاچو آپ یہ نہ بجایا کریں۔" گیت نے شدت سے اس کے دکھ کو محسوس کیا۔

"او کے ڈیئر۔ آئندہ نہیں بجائیں گے۔" اس نے اس انداز سے وائلن خود سے الگ کیا کہ زوہیب اور نیا کو پکا یقین ہو گیا کہ آئندہ واقعی نہیں بجائے گا۔

☆ ☆ ☆ ☆

وقت کچھ اس روانی سے گزرا کہ گیت نے دسویں برس میں قدم رکھ دیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ اپنے چاچو سے محبت بھی پختہ ترین ہو گئی تھی۔ شکیب کے اب بھی وہی معمولات تھے۔ وہی دن رات اور وہی قید تنہائی۔ سب کچھ اتنے عرصے سے ویسا ہی تھا۔ لیکن آج اتنی اچانک اور غیر متوقع تبدیلی آئی کہ گھر میں بھونچال سا آگیا۔

زوہیب کبھی شکیب کو اپنے بیڈ روم میں لے آتے اور کبھی سٹور میں چھپا دیتے لیکن کسی طرح اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ نیا الگ بوکھلائی بوکھلائی گھر میں پھر رہی تھی۔ باہر ہلکی سی آہٹ بھی ہوتی تو چونک پڑتی۔ شکیب بار بار انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ دونوں اس وقت اس کی کسی بات کا کوئی جواب دینا نہیں چاہتے تھے بلکہ اس وقت تو مسئلہ کسی محفوظ مقام کا تھا۔ جہاں شکیب کو رکھا جا سکے۔ مگر کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ بار بار اخبار ہاتھ میں اٹھا کر پڑھتے اور گھبرا کر پھر پھینک دیتے۔ ایسے میں گیت واحد فرد تھی جسے کسی بات کا علم نہیں تھا۔ وہ حیران تھی کہ کوئی اسے کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ جب وہ اخبار دیکھنا چاہتی تو زوہیب اخبار موڑ کر جیکٹ میں رکھ لیتے۔

بالآخر وہ بول ہی پڑی۔

"پپا پلیز مجھے بتائیں کیا پریشانی ہے؟"

"کک، کچھ نہیں بیٹا۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" زوہیب سختی سے بولے۔

"چاچو، آپ ہی بتائیں۔" اس نے مجرموں کی طرح گردن جھکائے شکیب سے کہا۔

"سنا نہیں تم نے اپنے کمرے میں جاؤ۔" نیا نے ڈانٹ پلائی تو وہ روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"پلیز بھابی۔ اس کو کیوں ڈانتی ہیں؟" شکیب تڑپ کر بولا۔

"یار اس وقت تمہیں اس کی پڑی ہے؟" زوہیب جھنجلا گئے۔

رات کا ایک بج رہا تھا، ساری دنیا سوئی ہوئی تھی۔ مگر اس کے گھر کے مکین اضطرابی کیفیت میں اندر باہر پھر رہے تھے۔ اسی بھاگ دوڑ اور ٹھنڈے موسم کی وجہ سے شکیب کا جسم جلنے لگا۔ جب برداشت نہ ہوا تو زوہیب کے بستر پر گر سا گیا۔ پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ زوہیب اور نیا کے لئے ایک نئی پریشانی کھڑی ہو گئی۔ زوہیب اس کو چیک کرنے میں مصروف ہو گئے۔ رات اسی طرح گزر گئی۔ جیسے ہی صبح کی اذان سنائی دی۔ نیا نے شکر الحمد کہا اور وضو کر کے نماز پڑھنے لگی۔ اس کے خیال میں دکھوں بھری رات گزر گئی تھی۔

اس نے چائے بنائی اور زوہیب کے لئے لے کر آئی۔ وہ رات بھر سوئے نہیں تھے اس وجہ سے سخت سر میں درد تھا اور آنکھیں سرخ تھیں۔ انہوں نے فوراً چائے کا کپ تھام لیا۔ اسی وقت گیت بھی سرخ آنکھیں لئے وہیں آگئی۔ لگتا تھا رات بھر وہ بھی نہیں سوئی تھی۔ اسے اب تک ویسے ہی اکیلے سونے کی عادت نہیں تھی۔

"بیٹا کیا رات کو سوئیں نہیں؟" نیا نے پوچھا۔

"نہیں، لیکن آپ مجھے بتائیں کہ کیا بات ہے؟" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

"کوئی بات نہیں ہے۔ تم اس قدر متفکر کیوں ہو؟" نیا نے نرمی سے اس کے بال سنوارے۔

"نہیں، آپ جھوٹ بولتی ہیں، مجھے سب کچھ بتائیں۔" وہ نیا کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

"تمہارا وہم ہے، جاؤ شاباش ہاتھ منہ دھو لو۔" زوہیب نے کہا۔

"ہرگز نہیں جب تک آپ مجھے نہیں بتائیں گے میں کچھ نہیں کروں گی۔" وہ خود سری سے ٹ گئی۔

"پلیز گیت، دیکھو چاچو کو سخت تیز بخار ہے۔ تمہاری وجہ سے ڈسٹرب ہوں گے۔" نیا نے لیب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہا۔

"تو آپ لوگ کیا منہ دیکھ رہے ہیں۔ ہسپتال کیوں نہیں لے جاتے انہیں۔" وہ نہایت تمیزی سے بولی۔ زوہیب چڑ گئے۔

"ہمیں پتہ ہے، لیکن ہسپتال نہیں لے جا سکتے۔"

"لیکن کیوں۔ بولئے یہ وجہ ہی تو میں جاننا چاہتی ہوں۔ میں اب بڑی ہوگئی ہوں۔ اچھے برے کی تمیز رکھتی ہوں! پھر آپ لوگ مجھ سے کیوں چھپاتے ہیں۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

"جب کہہ دیا کہ وہم ہے تمہارا۔" نیازچ ہوگئی۔

"میں بھی پوچھ کر رہوں گی' میرے چاچو سخت بیمار ہیں اور آپ بہانے بنا رہی ہیں۔ مما آپ کو میری اور چاچو کی قسم بتائیں کیابات ہے؟" نیا اور زوہیب دونوں زلزلے کی زد میں آگئے۔ ہونٹ سل گئے۔

"بولئے پپا۔ بولئے مما۔" وہ باری باری دونوں کے شانے ہلانے لگی۔

"کیاکروگی سب کچھ جان کر؟" زوہیب مغموم لہجے میں بولے۔

"میں پر سکون تو ہو جاؤں گی۔" وہ بولی۔

زوہیب نے ایک طویل سانس لی اور کہنا شروع کیا۔

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر کے پاکستان پہنچا۔ شکیب اس وقت کراچی کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا اور ہوسٹل میں قیام پذیر تھا۔ ہمارا آبائی گھر میانوالی میں تھا۔ میں گھر آگیا۔ لیکن گھر کی تنہائی سے بیزار ہو کر میں نے شکیب کو میانوالی بلانا چاہا تو اس نے انکار کر دیا کہ وہ تعلیم مکمل کر کے آئے گا۔ میں مطمئن ہوگیا' میرا تقرر مقامی ہسپتال میں ہوگیا۔ شکیب دوسرے تیسرے دن مجھے خط لکھتا رہتا تھا اور فون پر بھی بات ہوتی رہتی تھی۔

کچھ دن اسی طرح گزر گئے۔ ایک روز ایک جاننے والے کراچی سے آئے تو انہوں نے صحیح صورتحال مجھے بتائی کہ شکیب کا اوباش قسم کے لوگوں سے تعلق ہے' دہشت گردی اور غنڈہ گردی میں ملوث ہے' آئے دن کلاسز کا بائیکاٹ ہوتا ہے اور ہنگامے کئے جاتے ہیں۔ مجھے یہ سن کر شدید غصہ آیا اور دکھ بھی ہوا۔ میں فوراً کراچی پہنچا تو شکیب نے مجھے پوری طرح مطمئن کر دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں' میں نے اسے بہت سمجھایا کہ برے لوگوں کی صحبت بہت خراب کرتی ہے تم یہ حرکتیں چھوڑ دو۔ اس نے رضامندی دے دی اور میں پھر پر سکون ہو کر واپس آگیا۔ لیکن دھیان ہروقت اسی طرف لگا رہتا تھا۔ ہمارے درمیان اتنی محبت تھی کہ میں اس کے تصور سے پیار کرتا تھا۔

اسی روا روی میں کافی مہینے گزر گئے۔ میں تنہائی کا شکار ہروقت سڑکوں پر پاگلوں کی طرح گھو
اش کرتا رہتا۔ ایسے میں میرے سینئر ڈاکٹر سراج نے مجھے مشورہ دیا کہ میں شادی کر لوں۔ مگر
ائی کے سوا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ لہٰذا میں نے عاجزی سے معذرت کرنا چاہی تو وہ میرا مطلب
ھ گئے اور اپنی بیٹی یعنی تمہاری مما سے رشتے کی پیشکش کی۔ شادی کی تاریخ ٹھہری تو میں نے شکیب
نفصیلی خط لکھا کہ تم فوراً چلے آؤ۔ مگر اس کی طرف سے مکمل خاموشی رہی۔ میں نے بے شمار خط
ے' فون کئے۔ تنگ آکر شادی سے ایک دن پہلے میں جہاز سے کراچی گیا۔ مگر شکیب سے ملاقات
ہو سکی۔ لڑکوں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس نے قادر خان نامی لڑکے کو شدید زخمی کر دیا تھا۔
ن ایک لڑکی کی وجہ سے۔ لڑکا ہسپتال میں تھا اور لڑکی جس کا تعلق ایک پٹھان فیملی سے تھا۔
ے اس کے گھر والے لے گئے ہیں۔ شکیب کو اس سے بہت محبت ہے۔ وہ بھی کرتی ہے لیکن
وری کے سبب جانا پڑا۔ شکیب اس کے گاؤں گیا ہے۔

یہ باتیں مجھے پریشان کر گئیں۔ میں حواس باختہ سا اسے کراچی میں تلاش کرتا رہا مگر بے
د۔ رات ہوگئی صبح دس بجے نکاح تھا۔ سراج صاحب کی عزت کا خیال کر کے میں بے دلی سے
بس آگیا۔ مجھے شدید صدمہ تھا۔ شکیب کی طرف سے۔ میں نے ہر مقام پر اسے سمجھانے کی
شش کی تھی۔ مگر وہ اس طرح بے راہ روی کا شکار ہو جائے گا ایسا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔
ہی ادارے انسانیت کا درس دیتے ہیں' حیوان نہیں بناتے۔ پھر بھی نجانے کیوں نوجوان نسل
ھوں پر پردے گرا لیتی ہے۔ شدید غصے کی حالت میں' میں نیا کو رخصت کر لایا۔ مگر اندر جیسے
فان مچا ہوا تھا۔ کراچی فون پہ فون کر رہا تھا۔ مگر شکیب کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کی محبت مجھے چین
ں لینے دیتی تھی۔ کئی پھیکے پھیکے سے دن بیت گئے۔

اس رات میں اس کے ہی غم میں نڈھال سا بیٹھا تھا قریب ہی نیا بیٹھی تھی۔ رات کے تقریباً
، بجے تھے کہ دروازہ زور زور سے بجنے لگا۔ میں سلیپر پہنتے ہوئے دروازہ کھولنے آیا۔
رازے کھلتے ہی شکیب تیزی سے اندر داخل ہوگیا۔ بڑھی ہوئی شیو اور سیاہ چادر میں لپٹا ہوا
کر بھی میں فوراً پہچان گیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ نڈھال سا صوفے پر گر گیا۔ نہ سمجھتے
ئے بھی میں ساری بات سمجھ گیا۔ خاموشی سے میں نے خود کو بستر پر گرا کر نیا سے کہا۔

"نیا یہ تمہارا اکلوتا دیور شکیب ہے۔" نیا فرط جذبات سے اٹھ کر اس کے قریب گئی اور اس کے ہونٹوں پر جمی پپڑیاں دیکھ کر وہ تیزی سے پانی لائی۔ وہ ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔ پھر جونہی اس کی سانس ہموار ہوئی تو وہ نیا کے پیروں میں جھک گیا۔ نیا نے اسے خوب پیار کیا۔ جب وہ میرے پیروں تک آیا تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میں نے بے چین ہو کر اسے سینے سے لگا لیا۔

نیا اس کے لئے کھانا لائی۔ وہ کئی روز کا بھوکا تھا۔ تیزی سے سارا کھانا کھا گیا۔ کھانے کے بعد میں نے اس سے اصل وجہ معلوم کی۔ اس نے بتایا کہ میں نے گل زمان کو گولی مار دی ہے۔ کیونکہ وہ میرے ساتھ بھاگنے کو تیار نہیں تھی۔ بلکہ میرے منہ سے بھاگنے کا لفظ سن کر وہ مشتعل ہو گئی اور مجھے بدمعاش کہنے لگی۔ میں یہ توہین برداشت نہیں کر سکا۔ اگر وہ اپنے گھر والوں سے بغاوت نہیں کر سکتی تھی تو میں شکست کس طرح تسلیم کر لیتا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا مگر اس نے صاف کہہ دیا کہ اس کے بابا شیر دل خان سے اس کی شادی کر رہے ہیں اور وہ بہت خوش ہے۔ اس بات پر میں مشتعل ہو گیا اور میں نے اسے مار دیا۔ میں محبت کے وہ سارے منظر کیسے بھلاتا جو اس نے مجھے دکھائے تھے۔ میرے ساتھ جینے مرنے کے وعدے کئے تھے۔ میرے اندر کا اوباش انسان بیدار ہوا اور میں نے گولی چلا دی۔ بڑی مشکل سے میں بھاگنے میں کامیاب ہوا لیکن میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ بھائی کی موت سامنے نظر آنے لگی۔ ایک بھائی اور وہ بھی پھانسی پر لٹک جائے۔ یہ میرے دل نے نہیں مانا اور ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا ہو گیا۔ وہ رات قیامت سے کم نہیں تھی۔ ساری رات میں اور نیا پہرہ دیتے رہے۔ ایک طرف میرے ضمیر کی ملامت تھی، غم و غصہ تھا۔ دوسری طرف وہ محبت اور شفقت تھی جو مجھے غصے سے باز آنے پر مجبور کر رہی تھیں کہ میں آہنی دیوار بن جاؤں اپنے بھائی کو پھانسی کے پھندے سے بچا لوں۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ مختصر وقت میں مجھے فیصلہ کرنا تھا۔ کہ یا تو شکیب کو پولیس کے حوالے کر دوں یا پھر ہمیشہ کے لئے کہیں محفوظ کر لوں۔

اس جنگ میں ضمیر ہار گیا اور میں نے نیا کو مختصر سامان پیک کرنے کے لئے کہا اور رات کے سناٹے میں نکل پڑے۔

پھر بیٹا۔ صبح ہو گئی اور ہم ایک دیہی علاقے میں پہنچ گئے۔ وہاں بڑی مشکل سے اخبار حاصل کیا۔ تو اپنا سفر مزید تیز کر دیا۔ پولیس کو شکیب کی تلاش تھی۔ گل زمان کے والدین اثر و رسوخ

الے لوگ تھے۔ افراتفری مچ گئی۔ ہم بمشکل بچتے بچاتے سوات آ گئے۔ ایک غریب مزدور کے گھر
ناہ حاصل کی۔ اتنی مشکلات میں گھر کر بھی مجھے یا تمہاری ماما کو شکیب سے کسی قسم کی نفرت نہ ہوئی۔
م ہر لحاظ سے اس کا خیال رکھے ہوئے تھے۔ پھر کچھ عرصہ وہیں خاموشی سے گزر گیا۔ وہاں ہمیں
ں کو تلاش کرنے آنا تھا۔ میں' میں نے آہستہ آہستہ باہر نکلنا شروع کیا' اور پھر" اور پھر کچھ نہیں"
بت روتی ہوئی چلائی اور کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ اس نے خود ہی پوری بات جاننے کی فرمائش کی
ی اور خود ہی بغیر سنے چلی گئی۔ یہ بات سوچ کا پہلو رکھتی تھی۔ نیا اس کے پیچھے پیچھے گئی۔ وہ بستر پر
ندھے منہ پڑی ہچکیاں لے رہی تھی۔

"گیت کیا بات ہے۔"

"کچھ نہیں۔ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔" وہ دھاڑی۔

"بات پوری کیوں نہیں سنی۔" نیا نے پوچھا۔

"اس لئے کہ باقی ساری بات خود بخود سمجھ گئی ہوں۔" وہ آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی۔

"پھر' پھر چلو تمہارے پپا بلا رہے ہیں۔ چاچو کے قریب بیٹھو۔"

"نہیں' مت نام لیں چاچو کا۔" وہ غصے میں چیخی اور نیا جیسے سکتے میں آ گئی۔

"میں پپا سے بات کرتی ہوں۔" وہ چھلاوے کی مانند زوہیب کے پاس پہنچ گئی۔ زوہیب
ب پر جھکے اسے پانی پلا رہے تھے۔ شاید ابھی وہ غنودگی سے بیدار ہوا تھا۔ گیت نے حقارت
ی نگاہ شکیب پر ڈالی اور زوہیب سے مخاطب ہوئی۔

"پپا' کب تک آخر قانون کے مجرم کی تیمارداری کریں گے۔ آپ!" اتنا تیز اور کرخت
تھا کہ زوہیب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"بولئے' کیا یہی ذمہ دار شہری کا فرض ہے کہ وہ مجرموں کی سرپرستی کرے۔" وہ سینہ تان کر
ے کے مدمقابل کھڑی ہو گئی۔ زوہیب کا ہاتھ اس کے رخسار پر نشان چھوڑ گیا۔

"نہیں' نہیں بھائی۔" شکیب بمشکل نقاہت سے بولا۔

"خاموش رہیں آپ' میں اپنے پپا کے ضمیر کو جھنجھوڑنا چاہتی ہوں۔" وہ زہرخند لہجے میں
ا۔

"بکواس بند کرو' شکیب مجرم بعد میں ہے' پہلے میرا بھائی ہے۔" زوہیب غرائے۔

"جی ہاں' لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ سارے مجرم کسی نہ کسی کے بھائی ہوتے ہیں اور جنہیں وہ موت کی نیند سلاتے ہیں وہ بھی کسی کے کچھ لگتے ہیں۔ کیا رشتوں کی اہمیت ہر جگہ پر مختلف ہو جاتی ہے۔ بولئے پپا آپ کے ان بھائی صاحب نے جس مظلوم لڑکی کا خون کیا تھا۔ کیا وہ جانور تھی؟ اس کا کوئی اپنا پرایا نہ تھا؟ کیا بگاڑا تھا اس نے؟ اپنے جسم کی چوٹ بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ انہوں نے محض اس وجہ سے کہ وہ ان کی غنڈہ گردی سے مرعوب نہیں ہوئی تھی۔ اور ڈر کر ان کے ساتھ بھاگنے کے لئے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ یہ کیوں بھول جاتے ہیں دہشت گرد کہ ہر جرم کے بعد جیل کی سلاخیں ان کا مقدر ہیں۔ اور آپ؟"

"بکواس بند کرو۔" زوہیب تہذیب کا دامن چھوڑ کر غم و غصے سے پاگل ہو گئے اور انہیں احساس ہی نہ رہا کہ انہوں نے بری طرح اسے پیٹ ڈالا تھا۔ نیا زور سے چلائی تب انہیں ہوش آیا۔

"کیا کر رہے ہیں آپ؟" نیا نے بڑھ کر انہیں روکتے ہوئے کہا۔

"مارنے دیں مجھے۔ مگر میں جس گھر میں مجرم بستے ہوں وہاں نہیں رہوں گی' معزز' پڑھے لکھے لوگ جب مجرموں کی سرپرستی کرنے لگیں تو انسان کس پر اعتبار کرے۔ ہر شخص کو اپنا بھائی' بیٹا معصوم لگتا ہے' اگر اسی طرح سب سوچتے رہے تو مما کون بڑھتے ہوئے جرائم کو نیست و نابود کرے گا۔" وہ سیسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹی ہوئی تھی

"مت بھولو کہ شکیب میرا بھائی۔" زوہیب چلائے۔

"بھ۔ بھائی' مت اسے کچھ کہیں' میں سزا کا مستحق ہوں۔ میرے بہت بڑے جرم کی یہی سزا ہے۔" شکیب کی سانس غیر ہموار ہونے لگی۔ زوہیب تڑپ کر اس کے قریب آ گئے اور نیا بھی اس کے ہاتھ تھام کر بیٹھ گئی۔

"شکیب میری زندگی میں کوئی دکھ تمہارے قریب نہیں آئے گا۔"

"اور دیکھ لو شکیب یہی وہ تمہارا گیت ہے جو تم سے نفرت کا اظہار کر رہی ہے۔" نیا سسک اٹھی۔

"ہاں' نفرت ہے مجھے۔" گیت تڑخ کر بولی اور باہر نکل گئی۔

"بھ' بھائی' مجھے معاف۔ کر۔ دینا۔ گ۔ گیت کو اچھا اچھا ہوا۔ نفرت ہو گئی۔ سس سکون آ گیا۔ یہ سزا۔ اس سزا سے بڑی۔ بڑی ہے۔" پھر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ سینے کو ہاتھ سے مسلنے لگا۔ زوہیب اور نیا کی آنکھیں بھر آئیں۔ زوہیب اس کو چیک کرنے لگے۔ لیکن وہ چیک کرنے کی تمام حدوں سے باہر نکل گیا۔ اتنی خاموشی سے کہ ایک لمحے کو تو زوہیب کو بھی احساس نہ ہو سکا۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان تھی۔ زوہیب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔ نیا کو تو جیسے سکتہ ہو گیا۔ اس کا بھائی جیسا دیور اس سے جدا ہو گیا تھا۔

"مجھے معاف کر دینا شکیب کہ تمہاری عظمت کے مقابل میری اولاد بھی کمتر ثابت ہوئی۔" نیا نے دکھ سے سوچا۔

"خاموش ہو جاؤ نیا' اب اسے آزاد سمجھو' اسے کسی قید کی ضرورت نہیں' اسے سختی کی سزا سے اللہ نے بچا لیا ہے۔" زوہیب آہستہ سے کہہ باہر نکل گئے۔ حواس ابھی بحال نہیں ہوئے تھے کہ پولیس کی گاڑی کی آواز پر انہوں نے دروازہ کھول دیا اور آگے بڑھ کر پولیس انسپکٹر کا استقبال کیا۔

"شکریہ انسپکٹر صاحب' میرا بھائی ہر قید سے آزاد ہو گیا ہے۔ اسے رہائی مل گئی ہے' اسے اپنوں نے ہی آزادی دلا دی ہے' غیروں کے دکھ تو انسان برداشت کر لیتا ہے۔ اپنوں کے زخم مار ڈالتے ہیں۔ آج ساز سوز سے آزاد ہو گیا۔"

مہربان کیسے کیسے

"قسم سے زارا اگر جھروس ڈاکٹر مجھے نظر آجاتے تو میں اسے -------اسے------" اس نے دانت کچکچا کر غصے میں کہا۔

"فار گاڈ سیک عروج احمد اس بے چارے کا قصور کیا ہے؟" زارا جو گھنٹہ بھر سے اسے سمجھا رہی تھی زچ آگئی۔

"قصور 'اس خبیث نے مجھے انجکشن لگا کر آپریشن کرنے کی بجائے ویسے ہی آپریشن کر دیا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی"_ وہ سخت آگ بگولہ ہو کر کے بیڈ کے کنارے پر مارنے لگی۔

"او مائی گاڈ' عروج صاحبہ نے معمولی سے اسٹیچنگ کو سیریس آپریشن بنا دیا"۔ زارا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"ہنس لو' خوب ہنسو' میں ڈاکٹر کو سمجھ لوں گی"۔

"بھئی بار بار اس ڈاکٹر کو کس لئے کوستی ہو؟ زارا نے چڑ کر کہا۔

"تمہیں آخر اس سے ہمدردی کیوں ہے؟" اس نے چڑ کر پوچھا۔

"ہمدردی کی بات نہیں محترمہ' اس بے چارے نے کیا ہی کیا ہے؟" زارا نے عاجزی سے کمرے میں چاروں اطراف دیکھا اور دل میں دعا کی کہ یا اللہ آغاجی کو بھیج دے میری تو اس عذاب سے جان چھوٹے۔

بات کچھ بھی نہیں تھی آغا احمد خان کی نازو نعم میں پلی اکلوتی بیٹی عروج احمد کے دائیں پاؤں میں شیشہ چبھ گیا تھا۔ گھاؤ کچھ زیادہ تھا خون بہنے لگا دنیا جہاں کی باتیں کرنے والی عروج احمد نے چلا چلا کر گھر سر پر اٹھا لیا۔ آغاجی سخت ہراساں ہو گئے۔ گھر کے نوکر بوکھلا گئے۔ اس کی آہ

وبکا ساتھ والی کوٹھی یعنی چچا اسد خان کی کوٹھی تک پہنچ گئی۔ زارا اسد بھاگتی چلی آئی۔ شور مچا مچا کر سب کو بری طرح پریشان کر دیا۔ آغاجی فوراً" تو جب ہی واقع ہاسپٹل لے گئے وہاں شور مچانے کی وجہ سے ہلکی سی نیند کی گولی آغاجی کے کہنے پر اسے دے دی گئی اور اس کے بعد زخم جلدی بھرنے کے لئے دو ٹانکے لگا دیئے گئے۔ جونہی وہ جاگی تو ہلکے سے درد کو بھی قیامت کا درد بنا کر وہ مسلسل ڈاکٹر کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ ____زارا کو آغاجی اس کے پاس چھوڑ گئے تھے ____وہی یہ عتاب سہہ رہی تھی افسوس کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر کمرے میں آیا نہیں تھا اس لئے زارا بھی ڈاکٹر سے لاعلم تھی۔

اس کی بڑبڑاہٹ ابھی جاری تھی کہ گرے سوٹ میں وائٹ اوور آل پہنے ایک خوش شکل نوجوان نے کمرے میں داخل ہو کر سلام کیا۔

"مسٹر اس بدتمیز ڈاکٹر کو بلاؤ۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں"۔ بجائے اس کے سلام کا جواب دیا جاتا' عروج نے غرا کر اس نوجوان کو پریشان کر دیا۔

"کیا کام ہے ان سے آپ کو" نوجوان نے حیرت سے عروج احمد کے حسین سراپے کو دیکھا۔

"کام؟ کام تو ان کا تمام کرنا ہے کہہ دیں انہیں کہ میں ان کا حلیہ بگاڑ دوں گی کیا سمجھا ہے انہوں نے ہائے آغاجی___" چلاتے چلاتے درد سے بالکل چھوٹے سے بچے کی طرح آغا جی کو آواز دی۔ نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ زارا خجل سی عروج کو گھور رہی تھی۔

"کیا قتل کرنے کا پروگرام؟ دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں' بالکل' بتا دیں انہیں اور_____ "اور اور کیا بتاؤں؟" بولتے بولتے جو دیکھا تو ان گہری نظروں سے گھبرا کر چپ ہو گئی مگر اس نے فقرہ جاری رکھا۔

"بولئے اور کیا سزا ہے اس گستاخ' بے ادب کی؟" نہایت معصومی سی پوچھا گیا وہ چونکی۔

"تم کون ہو' وارڈ بوائے یا کمپونڈر"۔ اس نے گھورا۔

"عروج پلیز۔" زارا کو شرمندگی ہو رہی تھی۔

"کہہ لینے دیجئے آپ" اس نے زارا کو منع کی۔

"ہاں تو عروج صاحبہ اور کچھ"۔ وہ بھی شاید مزے لے رہا تھا۔

"اور یہ اپ اتنا فری کیوں ہو رہے ہیں؟" وہ اسی پر چڑھ دوڑی۔

"گاڑی آگئی ہے بی بی جی"۔ اسی لمحے باوردی ڈرائیور نے آکر زارا کی مشکل حل کر دی۔

"آغاجی کیوں نہیں آئے؟"

؟وہ فارم پر چلے گئے ہیں"_

"کیا؟ ہمیں لینے کی بجائے آغاجی فارم پر چلے گئے"۔ وہ غصے سے بولی۔

عروج پھر کیا ہوا چلو ہم چلتے ہیں"۔ زارا نے چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"تو میں نہیں جاؤں گی" وہ اڑ گئی۔ زارا نے سر پیٹ لیا۔

"خدا کے واسطے عروج احمد گھر پر ناراض ہو جانا اب چلو" زارا نے تقریباً" ہاتھ جوڑ دیئے۔

بمشکل وہ رضامند ہوئی۔

"اسٹیچنگ کب کھلنی ہے اور ڈریسنگ وغیرہ؟" زارا نے اس سے پوچھا___وہ ہونٹ سکیڑ کر مسکرایا۔

تقریباً" دس پندرہ روز میں ٹانکے کھلنے ہیں اور ڈریسنگ کے لئے میں روز آجایا کروں گا' ڈاکٹر صاحب سے پوچھ کر"۔

"آل رائٹ___" زارا نے کہا اور عروج کو سہارا دے کر آہستہ آہستہ چلنے کو کہا۔

"کمپاؤڈر صاحب آپ مدد کریں"۔ عروج نے ترخ کر کہا تو وہ ایک دم دوسری طرف سے سہارا دینے پر مجبور ہو گیا۔

گاڑی چلی بھی گئی اور ڈاکٹر اسامہ علوی دلچسپی سے اس کے بارے میں سوچتے ہوئے روم نمبر دس کی طرف بڑھ گئے۔

"بیڈ پر لٹا کر زارا نے شکر کا لمبا سانس لیا۔

تھینک گاڈ۔ خیریت سے یہ مرحلہ مکمل ہو گیا_"

"کیسے مکمل ہو گیا" پندرہ دن میں محتاج ہو کر بستر پر پڑی رہوں" عروج نے منہ بسورا۔

"مجبوری ہے کس نے کہا تھا کہ چھلانگیں لگاؤ۔ زارا غصے سے بولی۔

"اچھا' اچھا' یہ سب ملازم کہاں مر گئے ہیں مجھے شدید بھوک لگی ہے"۔

" پوری فوج آپ کی خدمت کے لئے متعین ہے کچن مین بے شمار چیزیں تیار ہو رہی ہیں محترمہ کیلئے۔" زارا نے تفصیل بیان کی۔

"اتنی چیزیں مجھے اکیلی تو نہیں کھانی"۔ عروج نے ہنس کر کہا۔

"آپ بھول رہی ہیں کہ گل بی بی ہمراہ روشی اور سمیر کے آج آرہی ہیں"۔ زارا نے خوشی سے بتایا۔

"ہرے' ونڈر فل' بہت مزہ آئے گا"_ وہ زور سے چلائی۔

"عروج بی بی' یہ چکن سوپ پی لیں"۔ خانساماں نے سوپ کا پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم سوپ پیئو میں ذرا فریش ہو کر آتی ہوں۔ پاپا بھی آگئے ہوں گے اتنے میں مہمان بھی آجائیں گے"_ زارا یہ کہہ کر چلی گئی عروج نے آہستہ آہستہ پینا شروع کر دیا۔ پیتے پیتے اسے ایک دم کچھ دیر پہلے ہاسپٹل کی بے ہودہ گفتگو یاد آگئی اور ساتھ میں وہ وجیہہ سا کمپونڈر ___بے ساختہ ہی وہ مسکرا دی۔

"واہ عروج احمد' وہ جب اپنے ڈاکٹر کو بتائے گا تو_____"

"تو کیا ڈاکٹر بھاڑ میں جائے" اس نے خود ہی جواب دیا اور سوپ پینے میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆☆

آغا احمد خان ملتان کے بہت معروف' زمیندار تصور کئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ڈیری فارم بھی ان کی توجہ کا طلبگار تھا وہ بہت شفیق اور مہربان انسان تھے ان سے چھوٹے ایک بھائی اسد خان اور ان سے چھوٹی بہن گل بی بی تھیں۔ آغاجی نے چھوٹے بہن بھائیوں کو ہمیشہ ماں باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ اپنی شادی سے پہلے اسد خاں اور گل بی بی کی شادی

کی ___گل بی بی پشاور چلی گئیں اور اسد خان ساتھ والی کوٹھی میں رافعہ بیگم کے ساتھ زندگی گزارنے لگے۔ آغاجی کی شادی رافعہ بیگم نے اپنی ننھیالی کزن سے کرادی حسین ترین عفت جہاں زیادہ عرصہ آغاجی کے ساتھ نہ چل سکیں۔ عروج کی پیدائش کے فوراً بعد داغ مفارقت دے گئیں۔ اس وجہ سے آغاجی نے اپنی اکلوتی' پیاری بیٹی کو پوری کائنات سمجھ لیا۔ اس کی ہر خوشی پوری کرنا عین فرض سمجھ لیا اس قدر لاڈ پیار اور توجہ نے عروج احمد کو حد درجہ چھوئی موئی' ضدی اور ہٹ دھرم بنا دیا جہاں وہ ضدی تھی وہاں اسی طرح معصوم اور حساس بھی تھی اس میں بھولپن بھی کمال کا تھا۔ صرف اس کی دوستی زارا اسد یعنی اپنی چچازاد سے تھی سارا وقت دونوں مختلف مشاغل میں مصروف رہتیں۔ کبھی پکنک اور کبھی شاپنگ۔ زارا بھی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے اسد خان کی بہت لاڈلی تھی۔ آغاجی دونوں کو ایک برابر محبت اور شفقت دیتے تھے۔ کوئی فرمائش ہوتی یا کوئی مسئلہ وہ صرف آغاجی کو بتایا جاتا تھا____ اسد خان نے خود کو بڑے بھائی سے کبھی علیحدہ نہیں سمجھا تھا برائے نام گھر الگ تھا ورنہ ہر روز رات کا کھانا سب ایک ہی ٹیبل پر آغاجی کے ساتھ کھاتے تھے۔

گل بی بی پشاور میں خوشحال اور ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہی تھیں دو بچے تھے روشی اور سمیر' شوہر کا انتقال ہو چکا تھا بہت بڑے گھرانے کی بہو تھیں شوہر کے مرنے کے بعد بھی ان کی زندگی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ یہی بات احمد خان اور اسد خان کے لئے باعث اطمینان تھی۔

عروج' زارا دونوں نے بی اے کر کے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا جب کہ روشی نے آگے یونیورسٹی میں داخلہ لے رکھا تھا۔ سمیر بھی سول انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ بچوں کو چھٹیاں ہوئیں تو ملتان آنے کا پروگرام بن گیا آغاجی کو زمینوں پر جانا تھا۔ بہن کی آمد پر بھرپور انتظامات کی ذمے داری اسد خان کے ذمے لگا گئے تھے اور رافعہ بیگم نے آغاجی کی ہدایت کے مطابق بچوں کے کمرے صاف کرائے۔ کھانے کا اچھی طرح جائزہ لیا ایک بجے کی فلائٹ تھی رافعہ بیگم نے کام ختم کر کے شوہر کو اطلاع دی کہ پونا ایک ہو رہا ہے ائیرپورٹ جائیے اور خود پہلے عروج کو دیکھا۔

"عروج اٹھو بیٹا میں کپڑے نکالتی ہوں ہاتھ منہ دھو کر کپڑے تبدیل کر لو۔"

"چچی مجھے نہانا ہے میرے جسم میں دوائیوں کی بو آ رہی ہے"۔

"آپ کے پیر پر پانی پڑ گیا تو ___ زخم کو تو بچانا ہے"۔ رافعہ بیگم نے سمجھایا اور کپڑے منتخب کر کے وارڈروب بند کر دی۔

"میں پیر گیلا نہیں ہونے دوں گی"۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ اٹھو میں سہارا دے کر باتھ روم میں چھوڑ دوں پھر زارا کو بھیجتی ہوں۔ وہ تمہاری مدد کرے گی۔ رافعہ بیگم نے بازوؤں کے سہارے اسے باتھ روم تک چھوڑا___ تھوڑی دیر میں زارا آ گئی۔

"محترمہ' اگر پیر گیلا ہو گیا تو ڈاکٹر برہم ہو گا"۔ زارا نے دانستہ ڈاکٹر کا ذکر کیا۔ وہ فوراً آگ بگولہ ہو گئی۔

"یہ خوش نصیبی ہے اس ڈاکٹر کی ورنہ۔

"ورنہ عروج احمد اسے کچا چبا جاتیں تم نے غور کیا کہ وہ کمپونڈر کیسی غضب کی پرسنلٹی والا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ ___" زارا نے آنکھیں گھمائیں۔

"خیر چھوڑو اس کو ایسے گھور رہا تھا جیسے کھا جائے گا"۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔

"جس کا کمپونڈر اتنا ہینڈسم ہو وہ خود کتنا خوبصورت ہو گا۔" زارا نے جان بوجھ کر پھر ڈاکٹر کا ذکر کیا۔

"دیکھ لیں گے کبھی اس کو بھی۔ اس نے بال ہیئر بینڈ میں جکڑتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے اسد خان کی گاڑی کے ہارن پر زارا چلائی۔

"گل بی بی آ گئیں"_

"تم باہر نہیں جاؤ گی وہ یہیں میرے کمرے میں آئیں گے۔" عروج نے اکڑ کر کہا اور ایسا ہی ہوا۔ گل بی بی کی چہیتی بھتیجی کے چوٹ لگی تھی وہ سن کر ہانپتی کانپتی وہیں آ گئیں وہ ان کے گلے سے لگ گئی۔

"میری پھول سی بچی کے چوٹ لگ گئی"۔ انہوں نے اس کو چہرے کو چومتے ہوئے کہا۔

"گل بی بی! ہم بھی آپ کی بھتیجی ہیں"۔ زارا نے معصومیت سے کہا تو کمرے میں موجود اسد خان سمیت سب کا قہقہہ گونج اٹھا۔

"ارے تو بھی میری جان ہے" گل بی بی نے زارا کو بانہوں میں بھرلیا۔

"اب جلدی سے کھڑی ہو جاؤ ورنہ ہم بور ہو جائیں گے"۔ سمیر نے عروج کے بال کھینچے۔

"ہاں ہم چھٹیاں انجوائے کرنے آئیں ہیں اور تم"۔ روشی نے منہ بنایا۔

"بھئی یہ محترمہ تو پندرہ دن مزید بستر پر براجمان رہیں گی' ہم آپ کو کمپنی دینے کے لئے تیار ہیں" زارا نے عروج کو چڑایا۔

"ہم تیار ہیں" سمیر نے شرارت سے زارا کو گھورا تو وہ سرخ پڑگئی۔

"رافعہ بھابی اس مرتبہ میں بات کر کے جاؤں گی" گل بی بی نے رافعہ بیگم سے کہا۔

"بات کی کیا ضرورت ہے آپ کا حق ہے"۔ اسد خان نے خوشدلی سے بہن کو جواب دیا۔ زارا تو لجا کر باہر بھاگ گئی۔

"کاش میرا ایک اور بھائی ہوتا تو میں عروج کو بھی اپنی بھابی بناتی"۔ روشی نے کہا تو سب مسکرا دیئے۔

"اچھا اب چلیں کھانا لگ گیا ہے"۔ رافعہ بیگم نے کہا۔

"اور میں کیسے چلوں؟" عروج نے معصومیت سے کہا۔

"ہم ہیں بیٹا آپ کو لے کر جانے والے۔" اسد خان نے فوراً بھتیجی کو گود میں اٹھا لیا اور آگے آگے چل دیئے۔

کھانے کی میز پر ہلکی پھلکی گپ شپ جاری رہی۔

"لال' کمرے میں کھانا پہنچا دیا۔" عروج نے خانساماں بابا سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سب نے سراسیمگی میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر سب کھانے میں مصروف ہوگئے۔

کھانے کے بعد گل بی بی' اسد خان اور رافعہ بیگم۔ اسد بیگم کی کوٹھی میں چلے گئے جب کہ نئی پود سب عروج کے کمرے میں اکٹھی ہوگئی اسی لمحے ٹیلی فون کی آواز پر زارا نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو۔"

"ہیلو' کیا میں عروج احمد سے بات کر سکتا ہوں۔" دوسری طرف بھاری مردانہ آواز ابھری۔

"کیوں نہیں' مگر آپ کی تعریف۔" زارا کو حیرت ہو رہی تھی بھلا کون ہو سکتا ہے۔"

"میں ڈاکٹر اسامہ علی بول رہا ہوں۔" جھٹکے سے کہا گیا۔

"باپ رے۔" بے ساختہ ہی زارا کے منہ سے نکلا ________ عروج جو اسی کو دیکھ رہی تھی۔ "عروج تمہارا فون ہے۔" زارا ٹیلی فون سیٹ بیڈ پر لے آئی۔

"ہیلو۔" عروج نے کہا۔

"تو آپ ہیں عروج احمد۔" طنزیہ پوچھا گیا۔

"آپ کو شک ہے۔" اس نے چڑ کر کہا۔

"نہیں بلکہ اتنی بے ہودہ اور بدتمیز لڑکی عروج احمد ہی ہو سکتی ہیں۔" نہایت سختی سے کہا گیا وہ بھنا گئی۔

"ہیں' ہیں' کون ہیں آپ؟" اس کے بولنے پر زارا کی تو ہنسی نکل گئی۔

"ڈاکٹر اسامہ علی۔" بہت گراجدار لہجے میں کہا گیا۔

"او آئی سی' تو آپ ہیں' یقیناً میرا پیغام مل گیا ہو گا۔"

"جی ہاں' اسی سلسلے میں براہ راست آپ سے سننا چاہ رہا تھا۔"

"آپ کو ڈاکٹر بنایا کس نے ہے' جس نے بھی ایسا کیا وہ بے ہوشی کی حالت میں ہو گا' اگر ہوش میں ہوتا تو کیا وہ ایسی غلطی کرتا۔ قطعاً نہیں' کیوں کہ ڈاکٹر کی تختی لٹکا لینے سے آدمی ڈاکٹر نہیں بن جاتا۔ ارے جس طرح آپ ڈاکٹر ہیں ایسی ڈاکٹری تو میں بھی جھاڑ سکتی ہوں ذرا پیر میں شیشہ مار دو پھر میرے پاس علاج کے واسطے آجانا۔ اللہ نے چاہا تو ایسا آپریشن کروں گی کہ آپ کی سات پشتیں یاد رکھیں گی ویسے بہتر ہو گا کہ آپ جانوروں کا علاج کریں کیونکہ جانور بے چارے احتجاج نہیں کرتے۔ اب سن کر عمل کرنا مسٹر۔"

"اتنی بکواس کرنے والی کو پتا ہے کیا کہتے ہیں گدھی اور گدھی بھی وہ جو لاعلاج ہو چکی ہے۔" جواباً بہت سنجیدگی سے کہا گیا تو وہ بری طرح جھلا گئی۔

"اگر تم اس وقت میرے سامنے ہوتے تو پتا چلتا کہ یہ گدھی ٹکریں کتنی زور دار مارتی ہے۔"

"محترمہ مجھے انسانوں سے ملنے کا شوق ہے گدھوں سے نہیں۔" یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ عروج غصے میں لال پیلی ہوگئی۔

"کیوں کیا کہہ دیا ڈاکٹر اسامہ علی نے۔" زارا نے بڑی لاپرواہی سے پوچھا۔

"ہنہ گدھا ہو گا خود" وہ پھنکاری

"یہ کیا ماجرا ہے؟" سمیر اور روشی ایک ساتھ بولے جو وہاں آگئے تھے تب زارا نے لفظ بہ لفظ ان کے گوش گزار کر دیا۔ وہ دونوں بڑی دیر ہنستے رہے۔

"دیکھو تم لوگ چپ ہو جاؤ ورنہ ______ ورنہ"

"ایک تو عروج کی گاڑی ورنہ پر ایسی اٹکتی ہے کہ بس۔" زارا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"زارا کی بچی ______" عروج نے تکیہ زور سے مارا۔

"ہیں' ہماری شادی ہوئی نہیں بچی کدھر ہے۔" سمیر نے شوخ نظروں سے زارا کو دیکھا۔ وہ مصنوعی خفگی سے گھور کر رہ گئی۔ جب کہ اب عروج ہنس رہی تھی۔

"ویسے ڈاکٹر صاحب والا قصہ بہت خوب رہا۔" روشی بولی۔

"مجھے تو ڈر ہے کہ وہ عروج کی بدتمیزی آغا جی کو نہ بتادے۔" زارا نے کہا۔

"ہنہ بتادے' میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔" وہ غرائی۔

"اگر اس کا منہ دیکھ کر تم دنگ رہ گئیں تو ______" سمیر نے چھیڑا۔

"یو' مین' بھیانک۔" اس نے پوچھا۔

"جی نہیں' خوبصورت۔ سمیر نے کہا۔"

"ہو نہیں سکتا۔" وہ بولی۔

"ویسے ڈاکٹر کا کمپونڈر بہت اسمارٹ اور خوبصورت ہے۔" زارا نے حیرت سے پوری آنکھیں گھمائیں۔

"اے' اے' مس زارا اسد آپ بھول رہی ہیں کہ آپ کے نام کے ساتھ ہمارے بھیا کا نام لگ چکا ہے۔" روشی نے شرارت سے زارا کا کان کھینچا۔

"اری کم عقل وہ تو عروج کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔"

"بکو مت۔" عروج نے گھورا۔

"یقین نہ آئے تو آج شام یعنی تھوڑی دیر بعد اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔" زارا نے کہا۔

اور پھر واقعی ٹھیک سوا چھ بجے غفور کاکا نے اس کے آنے کی اطلاع دی۔

"یہیں اندر لے آؤ۔" اس نے کہا اور بالوں میں انگلیاں پھیر کر درست کرنے لگی۔

اس وقت سمیر اسد خان کی طرف چلا گیا تھا۔ صرف روشی اور زارا ہی عروج کے پاس تھیں۔ ایک دم ہی کمرے میں دلفریب مہک پھیل گئی۔ آف وائٹ شلوار سوٹ میں نفاست سے بال سنوارے دھیمی دھیمی مسکان لبوں پر سجائے فرسٹ ایڈ بکس لئے وہ حاضر تھا۔ وہ کسی طرح بھی کمپونڈر نہیں لگ رہا تھا۔

"ہیلو ایوری باڈی۔" وہ بڑی ادا سے مسکرایا۔

"ہیلو۔" عروج نے سرسری انداز میں کہا۔ اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کرسی کھینچ کر بیڈ کے قریب بیٹھ گیا۔ اور فرسٹ ایڈ بکس کھولنے لگا۔

"آپ نے اپنے ڈاکٹر کو پیغام پہنچا دیا تھا۔" عروج نے پوچھا۔

"ہنہ جی ہاں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔

"وہ تو بہت بدتمیز ڈاکٹر ہے۔" عروج نے غصے میں کہا۔

"کیا کاٹتا ہے؟" وہ حیرانی سے بولا۔ زارا اور روشی کی ہنسی نکل گئی۔

"میرا مطلب ہے وہ واقعی بدتمیز ہے اور احمق بھی۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" وہ معصومیت سے بولا۔

"ہاں تو اور سنو اور تمہارا نام کیا ہے۔" اسے خیال آیا اب تک نام بھی نہیں پوچھا تھا۔

"جی کمپونڈر۔" وہ ہکلایا۔

"یہ نام تو نہیں ہے۔" زارا نے ہنس کر کہا۔

"اجی سب اسی نام سے پکارتے ہیں۔" کام مکمل کر کے اس نے ہاتھ دھونے کی غرض سے باتھ روم کا پوچھا اور بیگ اٹھا کر اجازت چاہی۔

"بیٹھیے چائے پی کر جائیں۔" عروج نے ازراہ مروت کہا وہ شاید یہی چاہ رہا تھا جھٹ بیٹھ گیا۔

کچھ ہی دیر میں چائے آگئی۔ روشی نے اسے چائے بنا کر دی۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے غور سے عروج کو دیکھا۔ کالے پر پیلے پرنٹ کا سوٹ' اس پر بغیر کاجل کی سرخ ڈوروں والی آنکھیں' بے ترتیبی میں بھی بلا کا حسن تھا۔

"ارے ہاں کمپونڈر یاد آیا۔" وہ ایک دم بولی تو وہ چونک اٹھا۔

"پچھلے ہفتے سے میری پیاری سبز چڑیا بیمار سی ہے۔ کچھ نہیں کھاتی' بولتی بھی نہیں اور میری طرف دیکھتی بھی نہیں اس کا اس دنیا میں میرے سوا ہے ہی کون۔ یہ بتاؤ میں کس ڈاکٹر کو دکھاؤں؟" وہ اس قدر معصومیت اور روانی سے بولتی چلی گئی کہ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ زارا اور روشی نے سر پیٹ لیا۔

"ڈاکٹر اسامہ علی کو۔"

"کیا؟ مجھے اپنی چڑیا سے ہاتھ دھونا ہے تم ایسا کرو پلیز اسے شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر کو دکھالاؤ۔ میرا پیر زخمی ہے ورنہ ________"

"مگر میں اسے کہاں لے جاؤں؟" وہ جز بز ہونے لگا۔

"ڈاکٹر کے پاس' میں اسے بلواتی ہوں۔" ساتھ ہی اس نے ملازم کو آواز دی اور پنجرہ لانے کو کہا۔ کچھ ہی دیر بعد ملازم پنجرہ لئے آگیا ("چڑیا تو مرگئی ہے۔" یہ سن کر عروج زار زار رونے لگی۔ دھاڑیں مار مار روتے دیکھ کر سب پریشان ہوگئے تو وہ فوراً کھسک گیا اور زارا' روشی چاروناچار اسے تسلیاں دینے لگیں۔

☆☆☆☆☆

آج صبح سے موسم ابر آلود تھا سرمئی بادلوں کے نرغے میں پھنسا آسمان بالکل بے بس تھا سورج اپنی تمام تر سرکشی کے باوجود باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی پروا کے سنگ جب ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تو روشی' سمیرا اور زارا کی طبیعت بری طرح سیر سپاٹے کیلئے

مچلنے لگی۔ مجبوری صرف عروج کی تھی مگر وہ بضد تھی کہ ساتھ ضرور جائے گی اور گاڑی میں بیٹھی رہے گی لیکن آغا جی نے بڑے حیلوں بہانوں سے اسے روک لیا۔ وہ منہ بسورتی ہوئی بالکونی میں کرسی ڈلوا کر موسم کا لطف لینے لگی وہ تینوں گاڑی نکال لے گئے رافعہ بیگم 'گل بی بی کچن میں موسم کی مناسبت سے کھانے کی چیزیں تیار کرانے لگیں۔ اسد خان اور آغا جی زمینوں کے کسی اہم مسئلے پر بات کرنے لگے۔ بور تو صرف وہ ہو رہی تھی اسی وقت گرے کلر کی گاڑی پورچ میں آکر رکی۔ اس میں سے کمپونڈر برآمد ہوا۔ بلیو پینٹ اور وائٹ لائن والی شرٹ میں باوقار چال چلتا ہوا وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ عروج حیران تھی کہ اتنی لمبی شاندار سی کار ایک کمپونڈر کی ہے یہ چال ڈھال' کہیں یہ ہمیں بے وقوف تو نہیں بنا رہا۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر اسامہ کی لے آیا ہو۔ ذہن نے تاویل پیش کی' وہ منتظر تھی کہ وہ کمرے میں آنے ہی والا ہے مگر وہ خاصی دیر بعد ملازم کے ہمراہ آیا۔

"السلام علیکم۔" وہ بہت مہذب انداز میں بولا۔ عروج کے ذہن میں اس کے جسم سے اٹھتی مہک گھس گئی۔

"آپ آغا جی کے پاس تھے؟"

"جی ہاں' ان سے ملنا ضروری تھا۔" اس نے بیٹھ کر بیگ کھولا۔

"وہ کیوں۔"

"دعوت نامہ دینا تھا۔" اس نے ٹانکے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کیسا دعوت نامہ؟"

"ڈاکٹر اسامہ علی کی سالگرہ ہے کل شام پانچ بجے۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"ہمیں کیوں بلایا ہے؟" وہ تیزی سے بولی۔

"ٹھیک سے تعارف کے لئے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

"بس جتنا ہو گیا کافی ہے۔ مزید کی ضرورت نہیں۔" اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"اچھا مگر ڈاکٹر صاحب کا تو خیال ہے کہ آپ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

"مجھے جاننے کی بھی ضرورت نہیں۔" وہ تڑخ کر بولی۔

"مگر آغاجی تو فرمار ہے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ان کے واقف کار کے بیٹے ہیں۔" بیگ
کرتے ہوئے اس نے کہا اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

دوپہر کھانے کی میز پر اس نے آغاجی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر اسامہ علی کو آپ جانتے ہیں۔"

"ہاں اچھی طرح' آتے جاتے انسان سے کون ناواقف ہو گا۔" آغاجی نے سلاد ا
پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا انہوں نے دعوت نامہ دیا ہے۔"

"ہاں میرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہے۔ تم سب لوگ چلے جانا' گفٹ بھی خرید لی
" آغاجی نے سرسری طور پر کہا۔

"مگر ہم کیوں جائیں۔" وہ چڑ کر بولی

"واہ بیٹا جی' ملنا جلنا چاہئے' وہ بہت اچھا انسان ہے میں نے وعدہ کر لیا ہے۔ روشی"
کی بھی تفریح ہو جائے گی۔" آغاجی نے تاکید کی۔ وہ کچھ بول نہ سکی۔

"ابھی تک وہ تینوں نہیں آئے۔" گل بی بی نے کہا۔

"آجائیں گے' گھوم پھر کر' چھوٹا سا تو ملتان ہے کتنی دیر گاڑی دوڑائیں گے۔" ا
نے بہن کو مطمئن کیا۔

"مگر آغاجی' میرا پیپر تو ٹھیک نہیں۔" عروج نے عذر پیش کیا۔

"نہیں ان کا خیال ہے کہ اب خطرے والی کوئی بات نہیں' کل تک اور فرق پڑ جا
گا اور تم بیٹھی رہنا مگر اب نہ جانا ٹھیک نہیں۔" آغاجی جواز پیش کر کے' کھانا ختم کر کے ا
کھڑے ہوئے۔

"آغاجی' بس _______ رافعہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں میں ذرا لال کمرے میں جا رہا ہوں۔" وہ چلے گئے اور وہ کھانے میں مصروف
ہو گئے۔"

"اتنا وقت گزر گیا' مگر اس نے خود کو نہیں بدلا۔ گل بی بی آہستہ سے بولیں۔

"شاید بدلنے کی نہ اس نے خود کوشش کی اور نہ ہم نے چاہا۔" رافعہ بیگم نے جواب

"مگر آغاجی تو بہت پریشان ہی رہتے ہیں' ان کے سوا کسی اور کی تو بالکل ہی بات نہیں
"اسد خان نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"آغاجی کے بقول ان کی دو آنکھیں ہیں ایک عروج اور دوسری ربا۔" رافعہ بیگم نے
ی لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے مگر ربا کو بھی اب سب سمجھنا چاہئے کمرے کی حدود سے باہر بھی دنیا
۔" گل بی بی نے ناپسندیدہ انداز میں کہا۔ ابھی بات نجانے کتنی دیر جاری رہتی کہ آغاجی کو
ں آتا دیکھ کر سب خاموش ہوگئے۔ عروج جو خاموشی سے ساری باتیں سن رہی تھیں آہستہ
تہ آرام آرام سے چل کر لال کمرے میں پہنچ گئی۔ کمرہ خالی تھا کھانے کے خالی برتن میز پر
باتھ روم میں پانی کی آواز پر وہ سمجھ گئی کہ رباجی باتھ روم میں ہیں بغیر ملے واپس پلٹنا چاہتی
لہ رک گئی۔

"کیا حال ہے عروج" نہات نرمی سے اس نے پوچھا۔ پلٹ کر ہولے سے مسکرا دی۔

"ٹھیک' آپ سنائیں۔"

"تمہیں کیسی نظر آرہی ہوں؟" ایسے دلنشین انداز میں اس نے پوچھا کہ عروج اس
سراپے میں الجھ گئی۔ سفید سادہ ساڑھی میں چمپئی رنگ' ماہتاب جیسا چہرہ' سیاہ غلافی آنکھیں
سیاہ بالوں کی چٹیا وہ لڑکی ہو کر ہمیشہ اس کے حسن سے خائف سی ہو جاتی ------ اور ہلکا
قابت کا احساس اس میں جاگ اٹھتا تھا کہ رباجی اس قدر حسین کیوں ہیں۔ خالی حسن ہی
بلکہ آواز تو بے شمار جھرنوں کا گمان دیتی تھی' کبھی کبھار اپنے کمرے میں سے گنگنانے کی
پر جو بھی سنتا سحر زدہ سا اپنے قدموں پر رک جاتا۔

"عروج ہمیشہ کھو کیوں جاتی ہو؟" اس کے شانوں پر پیار سے ہاتھ رکھ کر اس نے
ا۔

"نہیں' بس افسوس ہوتا ہے کہ آپ ساری دنیا سے کٹ کر کیوں رہتی ہیں؟" عروج
ال گئی۔

"میں دوسری دنیا کی جو ہوں۔" اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

"آپ سمجھتی ہیں جب کہ جس گھر میں آپ ہیں وہاں۔"

"عروج حقیقتیں چھپ نہیں جاتیں' بلکہ حقیقت اپنا آپ تسلیم کراتی ہے ابھی تمہیں سمجھ نہیں آئے گی۔" اس کا موڈ ایک دم ہی آف ہو گیا۔ عروج ہمیشہ کی طرح بیزار سی کمرے سے نکل آئی۔

ناشتے کے بعد سے زارا اور عروج کا اسی بات پر جھگڑا ہو رہا تھا کہ عروج سالگرہ پر نہیں جانا چاہتی تھی اور زارا اسے لے جانا چاہتی تھی ___ دونوں میں خاصی لے دے ہو چکی تھی مگر مسئلہ اپنی جگہ قائم تھا پھر روشی او سمیر بھی مسئلے کے حل کے لئے میدان میں کود پڑے۔

"پاگل لڑکی! ڈاکٹر کا ذکر سن سن کر میں تو سخت بے چین ہوں ملنے کے لئے۔" روشی نے کہا۔

"مگر میں بے چین نہیں ہوں۔" عروج غرائی۔

"دیکھو اس سے مل کر ہی ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کیسا ہے؟" زارا نے کہا۔

"ہاں اور کیا پھر ویسے بھی اس نے خود دعوت دی ہے۔" سمیر نے چیونگم چباتے ہوئے کہا۔

"مگر۔"

"اگر مگر نہیں' ہم سب جائیں گے چلو بازار سے گفٹ خرید لائیں۔" زارا نے ٹھوس لہجے میں بات مکمل کی۔

"ہنہ گفٹ' جاؤ پھر گدھا خرید لاؤ" عروج نے ناک چڑھا کر کہا۔

"اوہ بے چارا ڈاکٹر۔" سمیر نے بیچارگی سے کہا۔

"یہ تو ملنے پر پتا چلے گا کہ کون کیسا ہے؟" روشی نے بھی ٹانگ اڑائی۔

"اچھا' اچھا' اب یہ فیصلہ کرو گفٹ کیا لینا ہے؟" اس نے گویا ہتھیار ڈال دیئے۔

"سوٹ پیس دے دیتے ہیں۔" روشی نے رائے دی۔

"نہیں کوئی اور چیز۔" زارا نے مخالفت کی۔

کلون یا پھر شوینگ کٹ۔" سمیر بولا۔

"اوہ ہنہ کچھ اور میرا مطلب ہے سردی کی آمد آمد ہے جرسی خرید لیں۔" زارا نے کہا۔

"ہرگز نہیں میں تو اس کو آئینہ دوں گی تاکہ وہ اپنی شکل دیکھ سکے۔" عروج نے کھلکھلا کے کہا تو سب اس کے ہم خیال ہو گئے اور ہنسی ہنسی میں فیصلہ ہو گیا۔

"تو جاؤ سمیر یہ کام تو تم بھی بہ آسانی کر سکتے ہو۔" عروج نے کہا۔

"ٹھیک ہے آؤ زارا چلیں۔" وہ آنکھ دبا کر زارا سے بولا۔

"ہیں_________" روشی اور عروج نے چلا کر گھورا تو وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسی وقت آغا جی نے عروج کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"جی آغا جی۔"

"ادھر آؤ بیٹا۔" آغا جی نے بیڈ پر اپنے قریب بلایا۔

"جی خیریت ہے آغا جی۔" عروج متفکر سی بولی۔

"ہاں سب خیریت ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ ربا کو بھی راضی کر لو جانے پر۔"

"مگر آپ کو تو ان کی عادت کا علم ہی ہے۔" عروج نے کہا۔

"جانتا ہوں بیٹا مگر اس طرح وہ ختم ہو جائے گی اک چھوٹی سی لرزش کی ہم اتنی بڑی سزا نہیں بھگتتا دیکھ سکتے۔" آغا جی بہت اداس ہو گئے۔

"ربا جی اپنے خول سے باہر جھانکتی ہی نہیں شاید انہیں اعتماد ہی نہیں جب کہ آپ انہیں میری طرح ہی چاہتے ہیں۔" عروج کو باپ کی افسردگی کا ملال تھا۔

"تم کوشش کرو کہ اس کا اعتماد بحال ہو اسے راضی کرو ہم چاہتے ہیں کہ وہ ماضی بھول جائے۔" آغا جی نے بڑے وثوق سے بیٹی کو کہا۔ عروج سر ہلا کر سیدھی لال کمرے میں پہنچ گئی۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کر رہی تھی۔" کتاب بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کو بند کمرے میں وحشت نہیں ہوتی۔"

"جو چیزیں ذات کا حصہ بن جائیں ان سے وحشت نہیں ہوتی۔" نہایت متانت سے اس نے کہا۔

"اس کمرے سے باہر کی دنیا بہت خوبصورت ہے۔" "عروج نے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔

"کاش کہ میرا اندر خوبصورت ہوتا۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"پلیز ربا جی' آغاجی آپ کے لئے پریشان رہتے ہیں۔"

"تو سمجھاؤ انہیں کہ مت ہوں پریشان' میں انہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی۔"

"آپ اپنے خول سے باہر نکلیں سب کچھ بھول جائیں۔" عروج نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے بس میں نہیں ہے اور مجھے اس گھر کی عزت بہت پیاری ہے میرے باہر نکلنے سے فرق پڑے گا اس لئے ایسا میں کبھی نہیں کروں گی۔" پلکوں کی نمی وہ صاف عروج سے چھپا گئی۔

"اچھا آج شام سالگرہ میں جانا ہے آپ کو؟"

"میرا جواب معلوم ہے پھر بھی۔" اس نے سوالیہ انداز میں عروج کو دیکھا۔ اور عروج ہمیشہ کی طرح ناکام سی واپس لوٹ آئی۔ آغاجی کو اس کا جواب دے دیا۔ وہ خاموش ہو گئے اور وہ اپنے کمرے میں آگئی۔

میک اپ کو آخری ٹچ دے کر جو پلٹی تو زارا اور روشی کی شریر نظروں سے شرما گئی۔

"واہ' واہ' ڈاکٹر صاحب کی تو چھٹی ہو جائے گی۔" زارا نے شرارت سے ساڑھی کے پلو کو کھینچا۔

"بکو مت' چڑ ہے مجھے ڈاکٹر سے' وہ بولی۔

"ایمان سے کزن' یہ گرین کلر تو بہت سج رہا ہے۔" روشی نے بھی ٹکڑا لگایا۔

"اچھا' اچھا چلو سمیر گاڑی میں جھلا رہا ہو گا۔"

"گفٹ تو اٹھا لو۔" زارا نے گفٹ پر زور دیتے ہوئے کہا تو ان دونوں کی ہنسی نکل گئی۔

گلستان علی کے گیٹ سے گاڑی اندر داخل ہوئی تو اس کا دل ڈاکٹر اسامہ کے تصور سے دھک دھک کرنے لگا۔ بمشکل نپے تلے قدم اٹھا کر سب کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی تو سامنے عین وسط میں کمپونڈر ہی نیوی بلو سوٹ میں لبوں پر مسکراہٹ سجائے مہمانوں سے گپ شپ کر رہا تھا۔ اس کی نظر نہیں پڑی تھی۔

"عروج' یہاں تو کوئی جاننے والا نہیں۔" زارا نے سرگوشی کی۔

"وہ کمپونڈر ہی دکھائی دے رہا ہے۔" عروج نے بھی ہولے سے کہا۔

"مجھے تو یہی ڈاکٹر لگتا ہے۔" روشی نے خیال ظاہر کیا۔

"میں پوچھ کر آتا ہوں۔" سمیر نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہم کسی سے پوچھ لیتے ہیں۔" عروج نے کہا اور فوراً قریب کھڑی ایک اتون سے پوچھ لیا۔

"یہ سامنے ہی تو کھڑے ہیں ڈاکٹر اسامہ علی۔"

"کیا؟ کمپونڈر نہیں بلکہ' بلکہ ------" غصے کے مارے وہ سرخ ہو گئی۔

"اس نے ہمیں بے وقوف بنایا۔" زارا کو بھی غصہ آ گیا۔

"بنے بنائے لوگوں کو کیا بنائے گا۔" سمیر نے ہنس کر کہا۔

"اوہ میں ڈاکٹر کو سمجھ لوں گی چلو فوراً۔ عروج چلائی۔

"بغیر ملے' بغیر گفٹ دیئے۔" سمیر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ پاؤں احتیاط سے اٹھاتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ مجبوراً وہ تینوں بھی ں کے پیچھے ہو گئے۔ گاڑی گیٹ کے اندر ہی تھی کہ پیچھے سے تیز آواز آئی۔

"مس عروج احمد' پلیز رک جایئے۔ وہ ڈاکٹر اسامہ علی ہی تھے۔ عروج نے بھنا کر سمیر یکھا۔ سمیر نے تیزی سے گاڑی گیٹ سے باہر نکال لی۔ سارے راستے وہ کبھی خود کو اور کبھی ٹرا سامہ کو کوستی رہی۔ سب نے ان کے جلد گھر آنے کا نوٹس لیا مگر اس نے کوئی جواب ں دیا بلکہ آغاجی کو اس وقت پتا چلا جب رات ڈاکٹر اسامہ نے آکر انہیں سارا معاملہ سنایا۔ ا کی موجودگی میں آغاجی نے عروج کو اپنے کمرے میں بلا لیا وہ ٹھٹھک کر دروازے میں ہی ـ گئی۔ وہ شان بے نیازی سے صوفے پر براجمان مسکرا رہا تھا۔

"عروج آؤ بیٹا۔" آغاجی نے بلایا وہ ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ "یہ آپ نے آج کیا بدتمیزی کی ڈاکٹر صاحب کے گھر۔" آغاجی نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"جی' اگر اسے بدتمیزی کہہ رہے ہیں تو دھوکہ دینے کو کیا کہتے ہیں؟" اس نے سلگتے ہوئے کن اکھیوں سے اسامہ علی کی طرف دیکھا۔

"کون سا دھوکہ' جلد بازی میں اخذ خود کرلیتی ہو' مجھے تو آپ کے ہاسپٹل والے رویئے پر بھی ڈاکٹر صاحب سے ندامت ہورہی ہے۔" آغاجی نے تنبیہہ کی وہ احساس توہین سے سلگ اٹھی۔

"چلیں میں نے بدتمیزی کی۔ پھر انہوں نے اپنے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔" اس نے غصے سے کہا۔

"آپ نے بتانے کا موقع ہی کب دیا بلکہ آپ کی زبان نے ہی تو مجھے شرارت پر اکسایا۔

" اسامہ علی نے دلفریب انداز میں ہنس کر کہا۔

"چلو اب ڈاکٹر صاحب سے سوری کرو اور دوستی کرلو۔" آغاجی نے بیٹی کی بگڑی شکل دیکھ کر دلار سے کہا۔

"میں دوستی کیلئے تیار ہوں بلکہ اتنی شریر اور اچھی دوست کا طلبگار ہوں کیونکہ سب کچھ ہے کوئی دوست نہیں۔" اسامہ علی نے اٹھ کر اپنا بھاری ہاتھ اس کے آگے پھیلایا۔ وہ چند لمحے تذبذب میں گرفتار سوچتی رہی پھر آغاجی کے اشارے پر ہلکے سے مسکرا کر اپنا چھوٹا سا نرم ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"جمعہ کی نماز کے بعد سب کھانے کی میز پر جمع ہوگئے۔ ڈاکٹر اسامہ کو خصوصی طور پر آغاجی نے کھانے پر انوائیٹ کیا تھا-----اسامہ علی کی نیک سیرت اور اچھی عادات نے آغاجی کو اسیر کرلیا تھا۔ عروج سے دوستی کے بعد وہ بلا جھجک آنے جانے لگا تھا بلکہ دوست اب تین چار نہیں پانچ ہوگئے تھے کبھی آؤٹنگ' کبھی چائنز اور کبھی سینما۔ زیادہ نہیں تو گھر میں روز شام کو کبھی کارڈ کی بازی لگتی' کبھی کسی کی فرمائش کی فلم چلتی' کسی کے ہاتھ کی بنی ڈش اڑائی جاتی۔ اس طرح اسامہ علی بھی خاصے خوش رہتے تھے ورنہ جس کا بھری دنیا میں کہیں کوئی نہ ہو وہ بھلا

خاک مسکرائے گا۔ اسامہ علی کو عروج کی بے ساختہ معصوم باتوں اور شرارتوں نے مسکرانے پر مجبور کیا تھا۔ وہ کسی ایسے ہی شریر دوست کے متمنی تھے۔

"غفور کاکا۔" آغاجی نے ملازم کو آواز دی۔

"جی حضور۔"

"لال کمرے میں کھانا پہنچادیا۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی صاحب جی۔"

"چلو سب بسم اللہ کرو۔" آغاجی نے سب کو کھانا شروع کرنے کے لئے کہا_____

اسامہ علی کو لال کمرے والی بات سمجھ نہیں آئی تھی مگر پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی اس لئے کھانے میں مصروف ہوگئے۔

پر تکلف کھانے کے بعد سب بڑے آغاجی کے کمرے میں جمع ہوگئے' وہاں ضروری فیصلہ ہونے کا امکان تھا۔

"آپ سب مابدولت کے کمرے میں چلیں کیوں کہ آغاجی کے کمرے میں زارا اور سمیر کی کھچڑی پکائی جارہی ہے۔" عروج کو ہلکا سا اندازہ تھا کہ گل بی بی کئی روز سے آغاجی کے سامنے یہ مسئلہ رکھنا چاہ رہی تھیں آغاجی کی کوئی نہ کوئی ایسی مصروفیت ہوتی کہ بات ادھوری رہ جاتی مگر آج فرصت ہی فرصت تھی۔

"پھر تو کھچڑی کھا کر ہی جائیں گے۔" اسامہ علی قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے بولے۔ زارا شرم سے سرخ پڑگئی۔

"چلو کارڈ کھیلتے ہیں۔" روشی نے رائے پیش کی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" سمیر نے کہا۔

"میں تو رسالہ پڑھوں گی آپ لوگ کھیلیں۔" عروج نے کہا اور رسالہ لیکر بیٹھ گئی۔

زارا اور سمیر کا رشتہ طے پا گیا تھا۔ شادی کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی تھی۔ آئندہ ماہ پہلے جمعے کو مبارک قرار دیا گیا تھا۔ سمیر کے تو خوشی سے زمین پر پاؤں نہیں ٹک رہے تھے زارا بری

طرح لجائی لجائی سمیر سے کترا رہی تھی۔ روشی اور عروج نے ملکر چھیڑنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا ان کا تھوڑا بہت ساتھ اسامہ علی بھی دے دیتے۔

گل بی بی نے فوراً پشاور جانے کا پروگرام بنا لیا تاکہ شادی کی تیاری کی جا سکے۔ دن ہی کتنے رہ گئے تھے کل ان کی روانگی تھی اس سے پہلے اسامہ اور عروج نے زارا اور سمیر کو ٹریٹ کے لئے گھیر لیا۔ آخر کو دونوں نے رات کا ڈنر کا وعدہ کیا تب ان کی جان چھوٹی تھی۔

ٹھیک آٹھ بجے وہ چاروں تیار ہو کر اسامہ علی کا انتظار کر رہے تھے کمرے سے نکل کر پائیں باغ میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں اسامہ علی بھی وہیں آ گئے۔ مگر بالکل عجیب ہونق سے انداز میں، چلتے آگے تھے پلٹ کر پیچھے دیکھتے تھے ____ ہونٹ دانتوں تلے دبا تھا۔ آنکھوں میں حیرت تھی ___ مدھم سی روشنی میں بھی ان کے چہرے کی کیفیت واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔

"ارے ارے ڈاکٹر صاحب کیا چڑیل پیچھے لگ گئی ہے۔" سمیر نے ہنس کر کہا۔

"نہ، نہیں حور کہیئے۔ عروج! یہ، وہ کون ہے؟ وہ نہایت بوکھلاہٹ میں بولے۔

"کون، کون بھئی؟" عروج اور زارا نے بیک وقت پوچھا۔

"وہ درمیان کے کمرے میں ایک لڑکی کا سایہ۔" وہ ابھی تک اس سحر سے نہیں نکلے تھے۔

"اوہ آپ نے شاید رباجی کو دیکھ لیا ہے۔" عروج نے ہنس کر بتایا۔

"رباجی، یہ کون ہیں؟" ان کی نظروں کے آگے اب تک روشنی کی چادر سی تنی ہوئی تھی۔ ارد گرد سب دھندلا نظر آ رہا تھا۔

"میری ہمشیرہ۔" عروج نے پھر ادھوری بات کی۔

"ہمشیرہ مگر آپ نے کبھی ذکر نہیں کیا"۔ وہ تعجب سے بولے۔

"اسامہ جی وہ لال کمرے کی ملکہ ہیں، باہر نظر آئیں تو ذکر بھی ہو۔" سمیر نے روانی سے کہا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ جس کا مطلب تھا کہ وقت کافی ہو گیا ہے۔

"ملواؤ گی نہیں۔" اسامہ کی بے ترتیب دھڑکنوں نے خواہش کی۔ "اللہ کا نام لیں چلیں دیر ہو رہی ہے۔" عروج نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"کیوں، کیا وہ کاٹتی ہیں؟" اسامہ کو شاید کوئی جواز بھلا نہیں پا رہا تھا۔

"کسی روز ملوا دیں گے اب تو بھوک سے برا حال ہے۔" زارا نے منہ بسورتے ہوئے قدم اٹھائے، مجبوراً اسامہ علی کو قدم اٹھانے پڑے مگر لال کمرے کے آگے سے گزرنا مشکل ہو گیا۔ دل نے مچل کر اس حور شمائل کو دیکھنے کی خواہش کی۔ اس وقت جو کیفیت طاری تھی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک چکا چوند تھی جو لمحہ بھر کو نگاہوں میں سما گئی تھی گو کہ نہ ٹھیک سے دیکھا تھا اور نہ جانا تھا پھر یہ سب کیا تھا؟ کیا طلسم تھا؟

"کم ان اسامہ"۔ عروج نے پہلی مرتبہ بے تکلفی سے پکارا۔ زارا اور روشی نے مسکرا کر نظروں میں اشارہ کیا۔ عروج شرما گئی۔

کہنے کو تو وہ ان کے ہمراہ ہوٹل پہنچے، کھانا بھی کھایا، آئس کریم بھی واپسی پر کھائی مگر ایسے جیسے کوئی بے ہوشی کی کیفیت میں ہو۔ انہیں گھر ڈراپ کر کے وہ کھوئے کھوئے سے گلستان علی پہنچے تو چوکیدار سے گیٹ بند کرنے کا کہہ کر سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے۔ بیڈ پر گر کر لمبے لمبے سانس لئے۔ مگر پھر وہ خوشبو دار سایہ ارد گرد محسوس ہونے لگا ____ اس کے حواس اس فسوں خیز عکس کے قیدی بن گئے ____ وہ کون ہے؟ عروج کی ہمشیرہ تو پھر اس طرح بند کمرے میں۔ نہیں وہ تو بھٹکی ہوئی حور ہے جو راستہ بھول کر زمین پر آ گئی ہے یا میرے خدا مجھے اس کے سحر سے آزاد کر۔ اسامہ علی نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال مٹھیوں میں بند کرتے ہوئے اسے کہا مگر رات بھر یہی سلسلہ جاری رہا کروٹ پر کروٹ بدل کر رات گزار دی۔

☆☆☆☆

آج کا دن بڑی بے چینی سے گزرا ___ شام کے سائے ڈھل رہے تھے جب وہ عروج پیلس پہنچے۔ چاروں طرف مکمل خاموشی تھی صرف لان میں مالی اپنے کام میں مصروف تھا وہ اسی طرف آ گئے کین کی خوبصورت کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"سب لوگ کہاں ہیں؟"

"جی، مہمان تو صبح چلے گئے۔ عروج بی بی، زارا بی بی، رافعہ بیگم صاحبہ کے ساتھ بازار گئی ہیں اور آغا جی اپنی عینک کا فریم لگوانے گئے ہیں" _ مالی نے پوری تفصیل بیان کر دی۔

"اچھا ٹھیک ہے میں انتظار کر لیتا ہوں تم خانساماں سے کہہ کر چائے بھجواؤ"۔ سر کرسی کی پشت سے لگا کر آنکھیں موند لیں۔ مالی جا چکا تھا دل مچل رہا تھا کہ اس پری وش سے ملا جائے___نہ چاہتے ہوئے بھی قدم لال کمرے کی طرف اٹھ گئے۔___کمرے کا دروازہ بند تھا۔ صرف مترنم سی آواز چاروں اطراف جادو جگا رہی تھی وہ کچھ گنگنا رہی تھی اسامہ آواز کے سوز و گداز میں کھو گئے۔ ہمت ہی نہ ہوئی کہ دروازہ پر دستک دے سکیں۔ دل مضمحل کو لیکر واپس لان میں پلٹ آئے۔ چائے لئے خانساماں نے ادب سے سلام کیا کچھ ہی دیر میں عروج، زارا واپس آگئیں۔ رافعہ بیگم تو جلدی جلدی اپنی کوٹھی کی طرف چلی گئیں جب کہ وہ دونوں مسکرا کر لان میں آگئیں۔

"ہیلو"۔

"صبح کیوں نہیں آئے آپ، قسم سے سمیرا اور روشی یاد کرتے ہوئے گئے ہیں اور ویسے بھی صبح سے میرے سفید کبوتر کے پیٹ میں درد تھا اور____"

"فار گاڈ سیک عروج احمد سنجیدہ گفتگو بھی کر لیا کرو"۔ اسامہ علی سخت جھنجلا کر بولے۔ عروج کو جیسے چپ لگ گئی۔

"سوری۔ دراصل میں کچھ اپ سیٹ تھا"۔ وہ شرمندہ ہو گئے۔

"شکر ہے یہ بتائیے کب آئے؟" عروج بچوں کی طرح ہنس دی۔

"کچھ دیر پہلے"۔ "چلو آج جھیل پر چلتے ہیں واپسی پر کینٹ سے آئس کریم اور میٹھے پان بھی کھائیں گے"۔ عروج نے چلبلے انداز میں کہا، زارا نے بھی خوش ہو کر گردن ہلا دی۔

"ٹھیک ہے مگر ایک شرط پر"۔

"وہ کیا"۔ عروج نے حیرانی سے کہا۔

"آپ کی ہمشیرہ بھی ہمارے ساتھ چلیں گی"۔ انہوں نے گویا بم پھوڑ دیا۔

"رباجی، نہ بابا نہ"_ عروج نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"کیوں_____؟"

"جا کر پوچھ لیں وہ کہیں نہیں آتی جاتیں"۔ زارا نے لاپرواہی سے کہا۔

"کیوں، کیا وہ آدم بیزار ہیں، وہ تھوڑا جھلا کر بولے۔

"بس ایسا ہی سمجھ لیں، مگر آپ کیوں رباجی کے پیچھے پڑ گئے"۔ عروج نے اٹھلا کر اپنی گھنیری زلفیں جھٹکیں۔ اسامہ نے بغور اسے دیکھا شوکنگ پنک سادہ سوٹ میں گلاب کی کسی ادھ کھلی کلی جیسا اس کا سراپا بہت خوب صورت تھا مگر___وہ___جس حسین سراپے میں رات سے الجھے ہوئے تھے وہ تو شاید پہلے ان کی نظروں سے کہیں نہیں گزرا تھا۔

"بھئی کیا سوچنے لگے، عروج نے چھوا تو چونکے۔

"تو پھر چلیں"_ عروج نے پھر وہیں سے سلسلہ جوڑا۔

"اچھا ملواؤ تو____" وہ پھر بولے۔

"او میرے خدا، وہ کسی سے نہیں ملتیں اگر آپ کو شوق ہے جھاڑ کھانے کا تو خود مل لو، ہم اتنے میں فریش ہو جائیں پھر چلیں گے"۔ عروج نے کہا اور پرس اٹھا کر زارا کے ہمراہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی وہ پھر لمبے ڈگ بھرتے ہوئے لال کمرے تک جا پہنچے۔ اب کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا___انہوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ہلکے سے دستک دی۔

"کون___؟" مترنم سی آواز آئی۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" مدھم آواز میں اسامہ علی بولے۔

"آپ کون___؟" آواز غیر شناسا ہونے کی وجہ سے ہلکی سی حیرت سے پوچھا گیا۔

"اسامہ علی"۔

"معذرت کے ساتھ، میں آپ کو نہیں جانتی"_

"جی میں جانتا ہوں مگر میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں"_ وہ مارے اشتیاق کے بوکھلا گئے۔

"مگر میں آپ سے ملنا نہیں چاہتی"_ دوٹوک خشک جواب سن کر بھی وہ پلٹے نہیں بلکہ احتجاج جاری رکھا۔

"پلیز مجھے غلط نہ سمجھیں"۔

"آپ اس قدر مصر کیوں ہیں؟"

"دیکھئے میں نہایت شریف آدمی ہوں"_

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ہیں کون اور کیوں مجھ سے تکرار کر رہے ہیں"۔

ایک دم دروازہ پورا کھلا اور گویا چاند زمین پر آگیا بالکل ان کے قریب' روبرو تیکھے چتون لئے وہ سخت برہم نظر آرہی تھی۔

"جی بولئے"۔ ان کی محویت دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو گڑبڑا گئی اور کچھ نرمی سی بولی۔

"اس قدر اذیت پسندیدگی اور اتنی حسین زندگی"۔ وہ محویت کے عالم میں بولے۔

"جی" وہ حیرت سے بولی۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس زنداں میں مقید کیوں ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"اپنی مرضی سے جینے کو زنداں نہیں کہتے مگر آپ کو اس سے مطلب؟" وہ برہمی سے بولی۔

"مطلب ہو بھی سکتا ہے"۔ وہ ہولے سے مسکرائے۔

"پلیز آپ اس گھر کے دیگر افراد تک ہی محدود رہیں"۔ اس نے ترخ کر کہا اور کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

"آجایئے' آجایئے بہت ہوگئی"۔ عروج اور زارا کے ہنس کر کہنے پر وہ جھینپ سے گئے اور آگے آگے چل دیئے مگر ایک مضبوط مستحکم ارادے کے ساتھ ___

کئی روز وہ بری طرح مصروف رہے۔ ہاسپٹل میں ان کی موجودگی ضروری تھی۔ رات گئے فراغت ہوتی تو وہ سیدھے گھر چلے آتے۔ آج صبح بھی وہ عجلت میں ناشتہ کر رہے تھے کہ عروج آندھی اور طوفان کی طرح داخل ہوئی۔

"او' ہیلو گڈ مارننگ" وہ خوشی سے بولے۔

"شرم نہیں آتی آپ کو کتنے روز ہوگئے شکل دکھائے ہوئے"۔ عروج نے غصے میں کہا۔

"او' ڈیئر عروج آپ نہیں جانتیں کہ میں کتنا مصروف ہوں"۔

"بھاڑ میں گئی مصروفیت ہم تو بے چین تھے"۔ وہ خفگی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"مصروفیت کو آج بھاڑ میں پھینکنے والے تھے خیر آپ کی بے چینی کی وجہ"۔ وہ شرارت سے بولے۔

"بہت بھولے ہیں آپ"۔ اس نے گھورا۔

"قسم سے بالکل بھولے' بہرحال تم ناشتہ کرو"۔

"نہیں میں کر کے آئی ہوں"۔

"میں ڈیئر جلدی میں ہوں سیریس کیس ہے آج شام میں آؤں گا"۔ انہوں نے جلدی جلدی چائے ختم کی۔

"ٹھیک ہے' بھول نہ جانا"۔ وہ تاکید کر کے چلی گئی۔ اور وہ بھی بیگ اٹھا کر چل دیئے۔

"شام کو وہ عروج پیلس پہنچے۔ گاڑی لاک کر کے لان میں کھلے خوبصورت گلابوں کے کنج کے قریب زرد ساڑھی میں بلاشبہ وہی تھی۔ سیاہ دراز زلفیں پشت پر کھلی تھیں ان کے قدم اسی طرح اٹھ گئے۔

"اوہ اونہہ"۔ وہ **کھنکھارے** تو وہ تیزی سے پلٹی۔

"آپ ___" گلابی ہونٹ دھیرے سے وا ہوئے۔

"کیسی ہیں آپ؟" انہوں نے دلنشین سراپے کو نگاہوں میں بساتے ہوئے کہا۔

"آپ کی میرے ساتھ ایسی بے تکلفی بالکل نہیں ہے"۔ تیکھے انداز میں جواب دیکر اس نے جانے کے لئے قدم بڑھائے تھے کہ انہوں نے اس کی ساڑھی کا پلو تھام لیا۔

"پلیز رباجی' انسانوں میں رہنا سیکھیے"۔

"مجھے سبق پڑھانے کا شکریہ"۔

"کیوں اپنی ذات مقفل کی ہوئی ہے" انہوں نے احتجاج کیا۔

"بعض اوقات یہی بہتر ہوتا ہے"۔ اس نے دھیرے سے پلکیں اٹھائیں ___ ان کی نظروں میں دور دور تک کوئی کہانی تھی' کوئی راز تھا۔

"میں روز یہاں آتا ہوں آپ سے التماس ہے کہ آپ ہمارے ساتھ بیٹھا کریں' چائے پئیں گھومیں پھریں"۔

"سوری" وہ مختصرا" کہہ کر تیزی سے اندر چلی گئی۔ اسامہ کا دل یکبارگی پھر زلزلوں کی زد میں آگیا۔ انہیں ایسا لگنے لگا کہ وہ اس جادو کی ملکہ کے حصار میں قید ہوتے جارہے ہیں۔ وہ سر سے پیر تک انہیں جکڑ چکی ہے۔ کچھ دیر بعد جب خمار ٹوٹا تو عروج کے کمرے کے طرف چل پڑے۔

"اوں ہوں بیٹھنا نہیں ہے"۔ عروج نے چلا کر کہا۔

"وہ کیوں؟"

.اس لئے کہ ہم کینٹ جارہے ہیں"۔ زارا نے کہا۔

"کس لئے؟"

"زارا اور سمیر کی شادی سرپر آگئی ہے شاپنگ کرنی ہے اور دہی بڑے بھی کھانے ہیں"_ عروج کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"بہت چٹوری ہو"_ اسامہ بولے۔

"چلیں"_

"شاپنگ میں لڑکیاں بڑی دیر لگاتی ہیں"_ وہ اکتائے۔

"نہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی"۔ عروج نے پرس اٹھایا۔

"اچھا آغا جی سے تو مل لوں"۔

"وہ بہاولپور گئے ہیں"۔ عروج نے کہا اور وہ آگے آگے چل دیئے۔

"دیکھتے ہی دیکھتے وہ مبارک جمعہ بھی قریب آگیا جس میں زارا کو گھر سدھارنا تھا ایک ہنگامے پر موقوف تھی گھر کی صورت' شادی کے سبب دونوں کوٹھیوں کی نئے سرے سے تزئین و آرائش ہوئی تھی سب مہمان آچکے تھے___زارا کمرے میں بند مایوں کی رسم پوری کر رہی تھی۔ رافعہ بیگم کو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ آغا جی نے خصوصی طور پر یہ کہا تھا کہ ہمارا کوئی بیٹا نہیں لہذا تمہیں ہی انتظامات وغیرہ کا جائزہ لینا ہے۔ وہ واقعی بیٹا بن کر مصروف ہوگئے تھے تمام کام کاج کے دوران بھی وہ بھٹک کر ادھر ادھر اسے تلاش کرنے لگتے جب لڑکیوں کے مترنم سے قہقہے گونجتے وہ سوچنے لگتے کہ آخر اس کا جھرنوں جیسی آواز والا قہقہہ کیوں نہیں۔

"زارا کو آج مانجھے بٹھانا تھا۔ ہال کمرے میں زارا کو لاکر بیٹھایا گیا تھا___مایوں کے
رد جوڑے میں اسکا سادہ مگر خوبصورت روپ دیکھنے کے لائق تھا۔ عروج نے بھی پیلے کرتے
اجامے پر بھاری گوٹے کے کام والا دوپٹہ لیکر آئینہ دیکھا تو شرم سے سرخ ہوگئی۔____
ر آمدے سے گزرتے ہوئے اسامہ علی اس سے ٹکرا گئے۔

"واہ جی واہ آپ بھی مایوں بیٹھی ہیں کیا؟" انہوں نے شرارت سے کہا وہ بری طرح
نرما گئی۔" آج نظر اتار لینا"۔ اسامہ علی کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور عروج برسوں کا سفر
نوں میں طے کر گئی۔

اسامہ علی نظر بچاکر لال کمرے کی طرف آگئے کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔ انہوں نے ہلکے
سے دستک دی۔

"پلیز عروج مجھے ہنگاموں سے وحشت ہوتی ہے"۔ اس کی آواز آئی وہ شاید عروج
ی تھی۔

"رباجی' دروازہ کھولئے"۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"آپ براہ مہربانی چلے جائیں"۔ گرجدار آواز پر وہ مشتعل سے ہوئے۔۔

"دروازہ کھولئے' دروازہ کھولئے"۔ اتنی تکرار' اس نے دروازہ کھولا ضرور مگر
خت غصے میں بولی۔

"آپ بلاوجہ مجھ سے تکرار کرتے ہیں"۔

"اس لئے کہ میں آپ کو سب کی طرح ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ آج زارا کو مانجھے
ٹھایا جارہا ہے۔ سب ہنس رہے ہیں خوبصورت نظر آرہے ہیں اور آپ_____؟"

"وہ خوبصورت ہیں اس لئے"_ لاپرواہی سے کہا۔

"آپ سے زیادہ نہیں"_ وہ مسکرائے۔ سادہ سفید ساڑھی میں وہ اسی طرح دلفریب
ی۔

"ہاں کیونکہ ان کا ظاہر و باطن دونوں خوبصورت ہیں اور میرے اندر اتنی بدصورتی
ہے کہ سب خوبصورت لوگ آنکھیں بند کرلیں"۔

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں آپ جائیں"۔ وہ چڑ کر بولی۔

"آپ بھی اچھی طرح تیار ہو کر سب کے درمیان چلیں تب"۔

"میں ایسا نہیں کر سکتی"۔

"تو پھر میں بھی یہاں سے نہیں جاؤں گا"۔ وہ صوفے پر براجمان ہو گئے۔ یہ ضد تھی جس نے اسے مجبور کر دیا کیا ہے اس شخص کو؟ کیوں مجھے آزمانے پر تلا ہے تیاری کے دوران وہ سوچتی رہی۔

فیروزی مقیش کے کام والی ساڑھی میں بالوں کی ڈھیلی سی چٹیا باندھ کر بغیر میک اپ کے وہ اپنے طور پر تیار ہو گئی۔ اسامہ نے سر سے پیر تک جائزہ لیا۔ پھر نشیلے انداز میں بولے۔

"گو کہ ہمیں خمار چھا رہا ہے تاہم ہلکا سا میک اپ بھی کر لیجئے"۔ اس نے خاموشی سے یہ بات بھی مان لی۔ بالکل سنجیدگی سے وہ ان کے ہمراہ چل کر ہال کمرے کی طرف آئی۔ عروج اور آغا جی کسی مسئلے پر بات کر رہے تھے۔ ان پر نظر پڑی تو مارے حیرت اور مسرت کے وہ حیران رہ گئے۔

"ارے میری پیاری بیٹی ویری گڈ"۔ آغا جی کے خوشی سے تھپتھپانے پر وہ پہلی مرتبہ آہستہ سے مسکرائی___ اسامہ علی کو بہت بھلی لگی۔

"آپ نے تو کمال کر دیا"۔ عروج نے خوشی سے کہا۔

"کمال تو ان کے حسن و جمال کا ہے"۔ اسامہ نے آہستہ سے عروج کے کان میں سرگوشی کی۔ عروج نے متحیر نظروں سے اسامہ کو دیکھا اور ربا کا ہاتھ تھام کر ہال کمرے میں چلی گئی اور آغا جی اسامہ کو لئے باہر مہمانوں کے درمیان آ گئے۔

"مجھے بہت خوشی ہو اگر ربا عروج کی طرح زندگی گزارے"۔ آغا جی نے کہا۔

"خاموشی اور کم گوئی دانشمندی کی دلیل ہے۔ ربا جی کافی ذہین ہیں"۔ اسامہ نے جواب دیا۔

"اس میں کوئی شک نہیں"۔ مگر افسردگی مجھے پسند نہیں"۔

"میرا خیال ہے وہ تنہائی پسند ہیں مگر افسردہ نہیں"۔ اسامہ بولے۔

"تنہائی بھی ٹھیک نہیں ہے کاش وہ اپنی سوچ سے باہر آ جائے"۔ آغا جی نے دعائیہ ندا ز میں کہا۔ اسامہ نے دل ہی دل میں ایسا کرنے کا تہیہ کیا اور کھانے کا جائزہ لینے کے لئے آغا ں سے کہا اور چل دیئے۔

اگلے دن ناشتے کے فوراً بعد پھر زور و شور سے مصروف ہو گئے۔ آج رات مہندی ی۔ پھر بارات بھی رات ہی کو ملتان پہنچ رہی تھی۔ اسد خان کی کوٹھی میں بارات کے ٹھہرنے کا نظام تھا۔ صبح وہیں سے تیار ہو کر آغا جی کی طرف آنا تھا جب کہ ایک دیوار کا فاصلہ تھا۔ اتین کو تو اپنے کپڑوں، زیوارت اور میک اپ کی فکر تھی جب کہ مردوں کو انتظامات سے صت نہیں تھی___ اسامہ کسی کام سے اندر عروج کے کمرے میں آئے تو وہ ان کے ذمے گئی۔

"میرا لہنگا درزی کے پاس ہے صبح پہننا ہے کل جمعہ ہے"۔

"تو کیا ضروری ہے کہ لہنگا ہی پہنا جائے"___ وہ لاپرواہی سے بولے۔

"واہ میں نے بنوایا ہی بارات کے لئے ہے"۔

"کوئی ہماری پسند سے پہن لیجئے"۔ اسامہ نے کہا تو عروج گلنار ہو گئی۔

"تو پھر خود ہی پسند سے نکال کر دیجئے"۔ اس نے وارڈ روب کھول کر کہا اسامہ نے ٹ تمام کپڑوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھا پھر گرین، یلو باڈر والی چمکیلی ساڑھی نکال کر اسے ادی۔

"یہ بہت سجے گی"۔ انہوں نے مسکرا کر کہا عروج نے ساڑی سینے سے لگا کر فضاؤں اڑتے ہوئے محسوس کیا۔

"ربا جی کو دیکھ لیجئے گا کہ وہ کیا پہن رہی ہیں"۔ اسامہ نے جاتے جاتے کہا۔

"ان کی فکر لاحق ہو گئی"___ عروج نے ویسے ہی پوچھا۔ وہ چونکے۔

"فکر تو کسی کی بھی کی جا سکتی ہے ڈیئر"۔ وہ جذب کے عالم میں بول کر چلے گئے۔ عروج ن خیالوں میں مگن ہو گئی۔

"مہندی کی رسم شروع ہونے کو تھی اسامہ نے چاروں طرف دیکھا۔ اسے نہ پاکر وہ پھر لال کمرے کی طرف آگئے۔ اندر سے سریلی آواز میں پرسوز گیت کی آواز پر وہ لمحہ بھر کو باہر رکے۔ پھر ایک دم اندر داخل ہوگئے۔ اس نے چونک کر بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھا۔

"یہ کیا' رسم شروع ہونے والی ہے اور آپ"۔ وہ جھنجلا کر بولے۔

"پلیز' مجھے نہیں معلوم کہ آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں"۔

"کسی کے کوئی خواہ مخواہ پیچھے نہیں پڑتا"۔ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

"مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا"۔ وہ رخ موڑ کر کھڑی ہوگئی۔

"آپ اس طرح کیوں رہتی ہیں؟" وہ سامنے آگئے۔

"ویسے رہنے میں بہت سے خدشات سر اٹھاسکتے ہیں؟"

"کیسے؟"

"آپ خدا کے واسطے میری جان چھوڑ دیں"۔ وہ زچ ہوگئی۔

"اگر ایسا نہ کرسکوں تو؟" انہوں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں ٹھیک ہوں"۔ وہ بوکھلا گئی۔

"آپ ٹھیک ہی تو نہیں ہیں"۔

"کیا خرابی ہے"۔

"یہی کہ چلیں سب کے درمیان' اچھی طرح تیار ہوکر"_

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ میں اور عروج میں کیا فرق ہے؟" وہ چڑ سے گئے۔

"وہ عروج ہے اور میں ربا"_ وہ دھیرے سے بولی۔

"رباجی' زندگی بہت خوبصورت ہے"۔ اس قدر پیار اور مستی سے اس کا نام پکارا کہ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"ہنہ' اچانک اگر زندگی کی بد صورتی کا پتہ چلے تو سب باتیں خواب و خیال ہو جائیں"_ وہ اداس ہوگئی۔

"آپ آزما کر تو دیکھیں"_

"نہیں مجھے کچھ نہیں آزمانا"۔

"خیر فی الحال آپ تیار ہوجائیں۔ میں آپ کے ڈریس کا انتخاب کر دیتا ہوں" وہ بے تکلفی سے الماری کھول کر ساڑیاں دیکھنے لگا۔

"یہ ساڑی پہن لیں"۔ انہوں نے ڈارک بلیو گولڈن کام والی ساڑی نکال کر دی۔

پہلی مرتبہ ربا کو ایسا لگا کہ اس سے زیادہ اپنا کوئی نہیں۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" وہ قریب آکر بولے۔

"آپ جائیں میں تیار ہوکر آتی ہوں"۔ وہ بوکھلا کر نظریں چرا گئی۔ اسامہ علی اس کی اس بھولی سے ادا پر ہنس دیئے اور باہر نکل گئے۔

پھر رات گئے تک ہنگامہ بپا رہا۔ ڈھولک پر گیت گائے جاتے رہے۔ ربا خلاف توقع مہمانوں کے درمیان رہی۔ آغاجی کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ اسامہ علی تو اتنے خوش اور مسرور تھے کہ بیان سے باہر____

"صبح پھر ہر شخص افراتفری میں مبتلا تھا___ بارات کے استقبال کے لئے اعلیٰ قسم کا انتظام کیا گیا تھا۔ کھانے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اسامہ علی تیار ہونے کے لئے گئے۔ عروج زار کو لے کر بیوٹی پارلر چلی گئی۔ ربا نے اس ضدی شخص کی ضد سے ڈر کر خود ہی تیاری مکمل کر لی۔

"فالسئی رنگ کی ستاروں والی ساڑی پر خوبصورت اسٹائل کا جوڑا بنا کر نفیس سا سیٹ پہن لیا۔ ہلکے سے میک اپ کے ٹچ کے بعد جونہی ڈریسنگ ٹیبل سے پلٹی تو اسامہ کو محویت سے دیکھتا پاکر وہ سٹپٹا گئی۔

"میں نے تیاری کر لی ہے"۔

"بہت شکریہ مگر اب دل پر ہاتھ رکھئے"۔ وہ سرشاری سے قریب آکر اس کا ہاتھ تھام کر سینے تک لے گیا۔

"جی____ گھبرا کر اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"دھک دھک تو سن لیجئے۔ آپ کی یہ تیاری قیامت بھی تو ہمیں پر ڈھا رہی ہے"۔ وہ مخمور لہجے میں بولے۔

"پلیز ڈاکٹر صاحب"۔ وہ رک کر بولی۔

"اوں' ہنہ ڈاکٹر نہیں بلکہ اسامہ صرف اسامہ کہیئے"۔

"جی اسامہ صاحب"۔ وہ گھبرائی۔

" صرف اسامہ آپ کا اپنا اسامہ"۔ انہوں نے چھیڑا وہ ایک دم افسردہ سی ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ رو پڑتی اسامہ علی نے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

پھر حسب پروگرام سب کام اختتام کو پہنچے۔ زارا کی رخصتی کے بعد اسامہ علی اپنے گھر آگئے کئی روز کی تھکن اوپر سے بے آرامی سب باتوں نے مل کر اتنا تھکا دیا کہ وہ سیدھے بستر پر گر سے گئے۔ کچھ ہی دیر میں نیند نے غلبہ پا لیا۔ دنیا و مافیہا سے ایسے بے خبر سوئے کہ کچھ پتہ نہیں رہا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب کسی نے جھنجوڑ کر انہیں ہلایا۔ ہڑ بڑا کر ایک دم اٹھ بیٹھے۔

"اوئے شہریار تم"۔ وہ خوشی سے چلائے۔

"جی ہاں ہم"۔ شہریار نے پر جوش طریقے سے اسامہ کو گلے لگا لیا۔

"اطلاع کیوں نہیں دی" اسامہ نے شکایت کی۔

" سرپرائز میری جان"_

"کیسے آنا ہوا؟" اسامہ نے پوچھا۔

یار بزنس بھی عجیب گورکھ دھندہ ہے مارکیٹ میں پیسے پھنس جائیں تو سخت مشکل ہو جاتی ہے۔ ملتان میں کم و بیش ہمارا ڈھائی لاکھ پھنسا ہوا ہے۔ میں بڑے بھیا کو کہہ کر آیا ہوں کہ اس وقت تک نہیں آؤں گا جب تک مکمل پیسے نہ وصول کر لوں"۔ شہریار نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے"۔ اسامہ نے گردن ہلائی

"تم سناؤ ہاسپٹل کیسا چل رہا ہے؟"

"بہترین۔ تم اپنی سناؤ کس کس سے معاشقے چل رہے ہیں کچھ بدلے ہو یا کہ نہیں"۔

"سچ پوچھو تو ایک ظالم نے ایسی ٹھوکر لگائی ہے کہ کوئی اور بھاتا ہی نہیں"_ شہریار کی نظروں میں ایک دم چنگاریاں سلگ اٹھیں۔

"اچھا کون ہے وہ خوش نصیب جو آپ کو پسند آگئی سچ مچ"۔ اسامہ نے شرارت سے پوچھا۔

"تھی ایک طوائف کا گندا خون"۔ شہریار نے حقارت سے کہا۔

"اے اے یہ کون سا شریفانہ انداز ہے"_ اسامہ نے ٹوکا۔

"سچ کہہ رہا ہوں کہ اس کے حسن نے مجھے پاگل بنا دیا تھا مگر اس نے مجھے ایسے رد کیا ے بہت شریف زادی ہو"۔ مجھے بھیڑیا کہا ایک بار مل جائے خون پی جاؤں۔ اس کے حسن کو ;یوں سے رگڑ ڈالوں"۔ شہریار تہذیب کے دائرے سے باہر نکل گیا۔

"بری بات ایسی جگہوں پر جاتے ہی کیوں ہو؟ میں نے ہمیشہ تمہارے کردار کی اصلاح نی چاہی اب تم اسے دوش دے رہے ہو"۔ اسامہ نے ڈھلتے دن کے پیش نظر اٹھ کر کمرے لائٹ آن کی اور ملازم کو چائے کے لئے کہا۔

"وہ غائب ہی ہوگئی۔ مجھے اسی کی تلاش ہے' میں اس کا غرور خاک میں ملا دوں گا"۔ ریار نے مضبوط لہجے میں مکا صوفے پر مارا۔ اسامہ اس کی بے وقوفی پر ہمیشہ کی طرح ہنس یئے۔ یہی فرق تھا دونوں گہرے دوستوں میں ایک تہذیب کے دبستان کا نمائندہ دوسرا غیر لاقی پست سوچ کا غلام___اسامہ علی ہر لحاظ سے مختلف تھے۔ جب کہ شہریار کو پیسے کی وانی نے ہمیشہ لڑکیوں کے چکر میں رکھا شراب شباب دونوں اس کی کمزوری رہے۔

"اب یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے یا پھر؟"

"نہیں میں اپنی دادی کے پاس رہوں گا"۔ شہریار نے کہا۔ اسامہ خاموش رہے۔

☆☆☆

عروج پشاور زارا کو لینے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ آنا تو دو روز بعد تھا مگر پھر سیر و تفریح کی نں سے اس نے آغاجی کو فون کر دیا___آغاجی اس کے بغیر بہت اداس ہو جاتے تھے۔ ربا ; ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ شام کو اسامہ علی کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے لان میں ہی انہوں نے ئے منگوالی۔

"برخوردار کیا حال احوال ہیں"۔ آغاجی نے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے آغاجی دعا ہے آپ کی"۔ وہ نہایت سعادت مندی سے بولے۔

"اچھی بات ہے مگر ہم تو عروج کے بغیر اداس ہو جاتے ہیں"۔

"یہ تو ہے ان کی شرارتوں سے رونق رہتی ہے ربا تو بالکل کمرے میں ہی رہتی ہے"

انہوں نے جان کر ربا کا ذکر کیا۔

"ہاں' لیکن اب وہ خاصی تبدیل ہوگئی ہے شادی پر میں تو حیران رہ گیا"۔ آغا جی خوشی سے بولے۔

"اوہ شادی کی مووی گھر بھول آیا"۔ اسامہ علی نے ایک دم سر سہلاتے ہوئے کہا۔

چلو آجائے گی"۔ آغا جی نے کہا۔

"ربا جی کا مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ"۔

"بس بچپن سے اس کا مزاج ہی ایسا ہے خیر مجھے تم سے ایک بات کرنی تھی"۔ اسامہ علی کو محسوس ہوا کہ آغا جی یہ ذکر مناسب نہیں سمجھتے بلکہ ٹال جاتے ہیں"۔

"جی حکم کریں"۔

"پتا نہیں بیٹا کرنی چاہئے یا کہ نہیں دراصل عروج میری زندگی ہے اس کا پیار مجھے جرات دیتا ہے مگر___؟" وہ چائے کا سپ لے کر تھوڑا سا رکے۔

"آپ کمال کرتے ہیں میں آپ کا بیٹا ہوں بلکہ مجھے بھی آپ سے بات کرنی ہے"۔

"اچھا تو پھر بیٹے کو پہلے بات کرنی چاہئے۔" آغا جی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں پہلے آپ۔"

"کم آن بیٹا۔" آغا جی کے کہنے پر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہو کر لفظ اکٹھے کرنے لگا۔

"وہ آغا جی' اگر میرے بزرگ ہوتے تو بات کرنے کا حق ان کا تھا مگر دوسری صورت میں' میں آپ کے سامنے گزارش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔" نپے تلے لفظ ادا کر کے اس نے آغا جی کو دیکھا وہ بڑی توجہ سے ان کی بات سن رہے تھے۔

"آغا جی میرے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھیں مجھے بیٹا بنالیں۔" وہ روانی میں کہہ گئے۔ آغا جی نے مسکرا کر دیکھا۔

"کتنے اتفاق کی بات ہے کہ میں یہی بات کرنے والا تھا کہ میں تمہیں اپنا بیٹا بنالوں تو کیسا رہے؟"

"میں ربا کے بغیر ادھورا محسوس کرنے لگا ہوں۔" اسامہ علی مستی میں کہہ گئے۔ آغا جی کے ہاتھ کانپ اٹھے چائے چھلک گئی۔ پورے وجود پر لرزش طاری ہوگئی۔

"آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔" انہوں نے آغا جی کی خاموشی پر پوچھا۔

"نہیں مگر۔" آغا جی کپکپاتی زبان مزید ہلا نہ سکے۔ معذرت کر کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اسامہ علی ان کی کیفیت جانے شاداں' شاداں سے ربا سے ملنے کے لئے لال کمرے کی طرف آگئے۔ پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے تو جیسے سکتہ سا ہو گیا ہو۔ وہ سوئی ہوئی تھی۔ سیاہ دراز زلفیں تکئے پر بکھری تھیں خوبصورت آنکھوں پر گھنیری پلکوں کا سایہ' دہکتے عارض' چمکیلے گلابی ہونٹ' ان کا دل مچلنے لگا' شرارت پر اکسانے لگا۔ چھونے کو تڑپنے لگا______یہ جذبے بھی بڑے سرکش ہوتے ہیں جب سر اٹھائیں تو پھر اچھا بھلا سمجھدار انسان بھی بہک جاتا ہے۔ مضبوط جسموں کو پانی کی طرف بہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ آہستہ سے اس پر جھکے اس کی مہکتی زلفوں کو چوم لیا۔ ان کے جسم کی مہک اور لبوں کی تپش سے وہ جاگ گئی۔ اپنے اتنے قریب پاکر انہیں دیکھ کر وہ بوکھلا گئی۔ حیران رہ گئی کہ خواب حقیقت کی شکل اس طرح بھی اختیار کر سکتا ہے۔

"آپ کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے تھا۔" ہلکی سی خفگی سے وہ بولی۔

"اپنی دستاویز پر دستخط کئے ہیں۔ پیار کی مہر لگائی ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولے۔

"نہیں ایسا سوچیں بھی مت۔" وہ گھبرا کر پرے ہوگئی۔

"اس کا تو اعلان بھی ہو چکا۔" انہوں نے چھیڑا۔

"خدا کے واسطے جائیں آپ یہاں سے۔" وہ بری طرح پریشان ہوگئی۔ اسامہ علی بہکتے جذبوں کی تسکین کے بعد بہت مسرور تھے واپسی پر ان کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆☆

اگلے دنوں وہ بہت مصروف رہے گھر جانے کی بھی فرصت نہیں ملی۔ شہریار کے ٹیلی فون پر بھی عجلت میں صرف معذرت کی۔ علاقے میں ہیضے کی وبا پھیلنے کی وجہ سے بچے بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ اس قدر بیماری میں مبتلا بچے لائے گئے تھے کہ سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے وبا پر قابو پایا گیا۔ حالات معمول پر آئے تو انہیں بھی اپنا خیال آیا۔ گھر آکر خوب آرام کیا شام گئے اٹھ کر نہائے اور تیار ہو کر گاڑی نکالی۔

"غلام محمد کوئی آیا تو نہیں"۔ انہوں نے گاڑی نکالتے ہوئے چوکیدار سے پوچھا۔

"شہریار صاحب آئے تھے۔ آپ سوئے ہوئے تھے اب رات کو آئیں گے۔ غلام محمد نے بتایا۔

"اچھا میں گھنٹے بعد واپس آجاؤں گا"۔ اسامہ علی نے کہا اور گاڑی نکال لے آئے۔

عروج زارا کو لے کر آچکی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ دونوں بے تاثر چہرہ لئے اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں۔ اسامہ علی کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس رویے کے کیا معنی ہیں سوچ ہی رہے تھے کہ غفور کاکا نے ربا کا پیغام دیا۔ اس نے انہیں اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ وہ حیران سے لال کمرے کی جانب آگئے۔ وہ بڑے گہرے اور سنجیدہ موڈ میں کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔

"زہے نصیب آپ نے یاد فرمایا"۔ وہ شوخی سے تہذیب چلے آئے۔

"ڈاکٹر اسامہ علی مجھے آپ کی بے تکلفی پسند نہیں"۔ وہ تڑخ کر بولی۔

"پسند کیا ہے"۔ وہ پھر بھی نہ سمجھے۔

"کچھ بھی نہیں، آپ بھی اس پسند ناپسند کے چکر سے باہر نکل کر سوچیں"۔ اس نے تیزی سے کہا۔

"کہنا کیا چاہ رہی ہیں آپ؟" وہ سنجیدہ سے ہوگئے۔

"یہی کہ آپ اپنے الفاظ آغا جی سے واپس لے لیں"_

کون سے الفاظ؟" وہ سخت پریشان ہوگئے۔

"وہی الفاظ جن کی میری نظر میں کوئی وقعت نہیں، میں آپ کو یہ اختیار نہیں دے سکتی کہ آپ مجھے پسند یا ناپسند کریں"_ وہ رخ موڑ کر بولی مگر اس کے لبوں کی لرزش اسامہ علی نے واضح طور پر محسوس کی۔

"ربا میرے احساس کی توہین کرنے کا حق نہیں ہے تمہیں، وہ غصے سے بولے۔

"جو چیز آزار کا باعث بنے وہ پسند کرنا حماقت ہی ہے"_ اس کا لہجہ بالکل مدھم ہوگیا۔

"کھل کر بات کرو، تمہاری پرابلم کیا ہے؟" انہوں نے شانوں سے پکڑ کر اس کو اپنی طرف کیا۔

"آپ نے فرق پوچھا تھا نہ عروج اور مجھ میں، تو غور سے سن لو وہ عروج احمد ہے میں دلربا۔ ربا نہیں بلکہ دلربا، یہ پاکیزہ چھت، محبتوں کا شیش محل عروج احمد کی وراثت ہے۔ اس کی محفوظ پناہ ہے۔ دلربا کا تعلق اس شیش محل سے نہیں بلکہ گندگی کے اس حصے سے جسے ادب شناس "بازار حسن" کہتے ہیں۔ یہ دلربا ایک طوائف زادی ہے۔ سمجھے آپ"۔ اس نے طنز سے ہنس کر کہا اور اسامہ کو دیکھا۔ جو بالکل اطمینان سے کھڑے تھے۔ ہلکی سی حیرت کے علاوہ ان کے چہرے پر اور کچھ نہیں تھا۔

"تو پھر____" وہ فقط اتنا بولے۔

"مجھے اس گھر سے پیار ملا ہے، عزت ملی ہے کیا میں اس گھر کی خوشی نگل جاؤں، عروج پیاری لڑکی کی خوشی برباد کردوں۔ اس پناہ گاہ کی حرمت مسمار کردوں۔ آپ کی محبتوں کی چاہتوں کی اصل حقدار عروج ہے۔ وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہے۔ ٹوٹ کر چاہتی ہے۔ کل رات سے وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے، آغا جی اپنی لاڈلی بیٹی کے غم میں بہت اداس ہیں"۔ آغا جی کو دکھ دینے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی------ان کے اس گندگی پر اتنے احسانات ہیں آپ جیسے ہزار کیا سینکڑوں اسامہ میں قربان کر سکتی ہوں"۔ وہ جذباتی ہوگئی۔

"مثلاً کتنے احسانات"_ وہ دلچسپی سے مسکرائے۔

"اگر وہ مجھے سہارا نہ دیتے تو نہ جانے کتنی بار فروخت کی جاتی____میرا تعلق لاہور کے بازار حسن سے ہے میری ماں ریشم بائی نے میری پیدائش پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ مجھے اس گندگی کی زندگی سے دور نکال دے گی۔ اسی لئے اس نے مجھے تعلیم دلوائی۔ ہر طرح کی تہذیب سکھائی۔ میری تربیت شریف عزت دار گھرانوں کی بیٹیوں کی طرح کی گئی۔ جس کا شمشاد بائی کو قلق تھا وہ میری ماں سے اس بات پر لڑتی جھگڑتی تھی۔ ایک روز شمشاد بائی نے ایک بگڑے ہوئے رئیس زادے سے میری قیمت وصول کرلی۔ میری ماں نے رات کے اندھیرے میں بڑی مشکلوں سے مجھے بھاگ جانے کا موقع دیا۔ ہمارا شہر میں کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ میں بچ بچا کر اسٹیشن پر پہنچی۔ پھر میں ٹرین میں اللہ کا نام لے کر سوار ہوگئی۔ ٹرین ملتان اسٹیشن پر رکی تو میں پھر اللہ کے بھروسے پر نیچے اتر گئی کہیں تو اترنا ہی تھا۔ اسٹیشن کے گیٹ سے قدم باہر رکھ

کر میں نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا۔ مجھے سفید گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے آغاجی بہت معتبر اور بھروسے کے قابل لگے۔ میں نے دوڑ کر انہیں پکارا۔

"سنئے"۔

"جی کیا بات ہے بیٹا"۔ آغاجی بہت خلوص سے بولے۔

"یہاں لڑکیوں کی کوئی جائے پناہ ہے جو میری مدد کریں"۔ میں نے ملتجی انداز میں کہا۔

"شکر ہے تم نے یہ بات مجھ سے پوچھی ہے ورنہ آج کی رات بھیڑیوں کی دنیا میں پھر عید ہو جاتی"۔ آغاجی نہایت افسردگی سے بولے انہوں نے میرے لئے گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا اور محبت سے بیٹھنے کو کہا۔ مجھے ان پر اعتبار ہو چکا تھا۔ میں بیٹھ گئی۔ گاڑی آہستہ روی سے آغاجی چلاتے رہے۔ اس دوران میں نے اپنی داستان حیات انہیں سنا دی۔ اس وقت سے آج تک اس گھر کی چھت تلے میں نے سب کچھ پایا ہے' محبت' عزت' شفقت' باپ کا احساس' بہن کا پیار سب کچھ ملا ہے مجھے۔ میرا ماضی نجانے کہاں دفن ہو چکا ہے مگر پھر بھی میں اپنے ماضی سے خوفزدہ سی ہوں۔ خود ہی سوچو کیا میں احسان فراموش ہو جاؤں' اتنی اچھی بہن کو دکھ دوں___میں آپ کے قابل نہیں۔ آپ عروج کے لئے بات کریں۔ اس کی خوشی کے لئے میں خود کو قربان کر سکتی ہوں"۔ واپس اسی دنیا میں جا سکتی ہوں"۔

"چٹاخ____"اسامہ علی کا بے اختیار جذباتی انداز میں ہاتھ اٹھا اور اس کے صبیح رخسار پر نشان چھوڑ گیا۔ تھپڑ مار کر وہ نہایت مضطرب سے مٹھی سہلانے لگے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی___اس جملے سے پہلے وہ بالکل مطمئن اور پرسکون سے تھے بلکہ اس کی کوئی بات ان پر اثر ہی نہیں کر رہی تھی۔

"دلربا جی' یہ آپ کی پوری بات کا جواب نہیں ہے بلکہ آخری بات کا جواب ہے' کان کھول کر سن لیں یہ آپ کی ربا سے دلربا بن جانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کا جذبہ اس گھر' اس گھر کے مکینوں کے لئے درست ہے بلکہ میں اگر آپ کی جگہ ہوتا تب میں بھی یہی کرتا مگر میں آپ کے جذبے کا پابند نہیں۔ میں نے عروج سے نہیں آپ سے محبت کی ہے۔

آپ کو کوئی اختیار نہیں کہ احسان کا بدلہ اتارنے کے چکر میں مجھے بھی مجبور کریں"۔ وہ رسان سے بولتے چلے گئے۔

"مگر وہ عروج___"

"افسوس ہے مجھے کہ عروج نے میرے جذبات کو اس انداز میں لیا' ورنہ قسم مجھے تمہاری' میں نے پہلے دن سے آج تک اسے صرف اور صرف ایک اچھا شریر دوست سمجھا ہے"۔

"آپ کو اب اسی دوستی کو محبت میں بدلنا ہوگا"۔ اس نے دوٹوک کہا۔

"ہنہ اس طرح کپڑے تو بدلے جاتے ہیں یہ معاملات نہیں"۔ وہ گمبھیر لہجے میں بولے اور اس کی طرف بغور دیکھا۔

"میں عروج کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔

"آپ کوئی حماقت کر کے تو دکھائیں"۔ بازوؤں سے پکڑ کر انہوں نے ایسی سختی سے بھینچا کہ وہ کانپ اٹھی۔ وہ چلے گئے وہ بستر پر پڑ کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی___عروج دل تھام رکھڑکی سے پرے ہو گئی۔

آغاجی سخت پریشان تھے ایک طرف جان سے عزیز بیٹی تھی دوسری طرف ربا جو بیٹی تو نہیں تھی مگر عزیز اس سے بھی زیادہ تھی۔ شاید اس لئے کہ جو عہد وہ اس کی فلاح اور خوشی کے لئے کر چکے تھے وہ کڑا امتحان بن گیا تھا۔ عروج کی سرخ سوجی آنکھیں اور ربا کی بے بس' بے آب و گیا زندگی' انسان بہت کمزور ہوتا ہے۔ بمشکل قربانی دے پاتا ہے۔ مگر آغاجی نے قربانی کا ارادہ کرنے میں چند گھنٹے سے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ نہ انہوں نے عروج سے بات کی اور نہ ربا سے بلکہ -------اسامہ علی کو فون کیا۔

"آداب آغاجی"۔

"بیٹا خوشخبری دینی ہے"۔ آغاجی کی آواز میں خوشی شامل تھی۔

"جی فرمائیں"۔

"ہمیں رشتہ منظور ہے۔ کل جمعہ ہے دوپہر کا کھانا ہماری طرف کھاؤ بعد نماز ظہر کے ر
کو انگوٹھی پہنادو۔ شادی کے لئے تیاری وغیرہ میں تقریباً" دو ماہ چاہئیں"۔ آغاجی نے پورا پروگرام بنالیا تھا___ اسامہ علی کی دل کی دھڑکنیں رقص کرنے لگیں۔

"بہت شکریہ آغاجی' میں یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا"۔

"بیٹا احسان کیسا' بیٹیاں تو رخصت کرنی ہی ہوتی ہیں"۔ آغاجی نے کہا۔

"ہم کل حاضر ہو جائیں گے"۔ وہ سعادت مندی سے بولے۔

"کتنے افراد ہوں گے تقریباً""۔ آغاجی نے پوچھا۔

"بس دو' میں اور میرا دوست شہریار" وہ شوخی سے بولے۔ آغاجی نے حیرت کا اظہار کیا اور فون بند کر دیا۔

"اسامہ علی نے گھڑی پر نظر ڈالی رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ انگوٹھی خریدنا تھی شہریار سے ملنا تھا گاڑی کی چابی اٹھائی ہی تھی کہ شہریار آگیا۔

"دوست میں یاد ہی کر رہا تھا"۔

"اچھا' تو پھر ہم حاضر ہیں حکم کریں"۔ شہریار بولا۔

"کل تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے کل ہم تمہاری بھابی کو انگوٹھی پہنا رہے ہیں" اسامہ علی کی آنکھوں میں جگنو تھرک رہے تھے۔

"واقعی' ویری گڈ' خوش نصیب ہو"۔ شہریار نے انہیں گلے سے لگالیا۔

"ایسی خوش نصیبی تو تم بھی حاصل کر سکتے ہو"۔ اسامہ نے چھیڑا۔

"نہیں' شہرشار خان نے قسم کھائی ہے کہ اسی کو حاصل کرنا ہے شہریار کے چٹان جیسے لہجے میں بہت سا خوف اسامہ علی نے محسوس کیا۔

"اللہ کرے وہ تمہیں مل جائے۔ اس وقت تو تم مابدولت کے ساتھ بازار چلو رنگ خریدنی ہے"۔ اسامہ علی نے ہاتھ پکڑ کر شہریار کو اٹھایا۔

"ایک شرط پر"۔

"وہ کیا___؟"

"سیٹ میں اپنی بھابی کے لئے خریدوں گا اور اپنے ہاتھوں سے پہناؤں گا"۔ شہریار نے کہا تو اسامہ علی نے ہنس کر رضامندی دے دی۔

☆☆☆☆

"آغاجی' مجھے آپ کا یہ فیصلہ منظور نہیں"۔ دلربا نے ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"ربا! یہ طرز تخاطب' ہم کیا سمجھیں"۔ آغاجی نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"معافی چاہتی ہوں مگر دلربا خود غرض بننا نہیں چاہتی"۔ وہ نرمی سے بولی۔

"پگلی ہو تم' دلربا کو تو ہم اسٹیشن کے باہر ہی چھوڑ آئے تھے ہم ربا بیٹی سے پوچھ رہے ہیں"۔ انہوں نے بڑے شفیق انداز میں اسے قریب بٹھالیا۔

"یہ آپ کی محبت ہے آغاجی مگر میں عروج کا حق نہیں چھین سکتی"۔

"حق اس کا ہوتا ہے جس کو کوئی چاہے' اسامہ علی عروج کو نہیں تمہیں چاہتے ہیں"۔

"مگر عروج تو انہیں بہت چاہتی ہے"_

"شاید نہیں یقیناً" لیکن غلط فہمی کی کوئی منزل نہیں ہوتی' عروج کو ہم نے سمجھادیا ہے ور ہمارا خیال ہے کہ تم مزید ہم سے تکرار نہیں کروگی"۔ آغاجی نے بات مختصر کر دی وہ خاموش ہوگئی۔

" جاؤ شاباش' عروج اور زارا کو میں نے تاکید کر دی ہے۔ انہوں نے کہا اور وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔

"یہ کیسی خوشی ہے دلربا کہ تمہارے دل کو سکون نہیں' قرار نہیں۔ اک بے چینی اور اضطراب ہے پتا نہیں کیوں عروج کی شکایتی نظریں چاروں اطراف دکھائی دیتی ہیں"۔ چکراتے سر کو تھام کر بستر پر گئی۔

عروج اور زارا نے اسے سجا سنوار کر تیار کر دیا۔ پنک پوتھ کی ساڑھی پر جڑاؤ دار سیٹ پہنا کر بالوں کا خوبصورت اسٹائل میں جوڑا کر دیا۔

"چشم بددور۔" زارا نے تھوڑی اوپر اٹھا کر شرارت سے کہا۔ وہ آہستہ سے مسکرا کر رہ گئی___ عروج وہ مکمل خاموش تھیں آغاجی کے کہنے کے مطابق ساری تیاری ہوچکی تھی۔

"لڑکیوں' چلو ربا کو ہال کمرے میں لے چلو"۔ رافعہ بیگم نے آکر کہا تو وہ اسے لئے ہا
کمرے میں آگئیں۔

آغاجی کے قریب اسامہ علی بیٹھے تھے بالکل سامنے والے صوفے پر دائیں ہاتھ وا
صوفے پر اسد خان بیٹھے اور بائیں ہاتھ والے صوفے پر شہریار خان' اس کی پشت دروازے
طرف تھی۔

"ادھر لے آؤ ہماری بیٹی کو"۔ آغاجی نے اٹھ کر کہا اور اسے اسامہ علی کے قریب بٹھ
دیا۔ زارا نے ساڑھی کا پلو آہستہ سے اس کے سر پر پھیلا دیا۔ اور تھوڑا سا گھونگھٹ بنا دیا۔

"میرا خیال ہے رسم ادا کی جائے"۔ رافعہ بیگم نے قیمتی انگوٹھی آغاجی کو پکڑائی۔

"پہلے اسامہ جی انگوٹھی پہنائیں"_ زارا نے کہا تو اسامہ علی نے مخمل کی ڈبی سے
ہیرے کی نازک سی انگوٹھی نکال کر اس کی انگلی میں پہنا دی۔ آغاجی نے بھی جوابا" انگوٹھی
اسامہ علی کو پہنا دی۔ مبارک باد کے شور کے فوار" بعد اسامہ علی بولے۔

"آؤ شہریار' اپنی بھابی کو گفٹ دے دو"۔ اسامہ علی کے کہنے پر شہریار نے وہ قیمتی
سیٹ نکالا اور بالکل ربا کے پیروں میں دوزانوں بیٹھ کر شرارت سے کہا۔

"پہلے رخ روشن دکھائیے دیور جی کو"۔ زارا نے ربا کا چہراہ ذرا سا اوپر اٹھایا۔
شہریار خان کا چہرہ تن سا گیا۔ حیرت زدہ سا کبھی وہ ربا کو دیکھنے لگتا اور کبھی اسامہ کو' کنپٹی کی رگیں
تن گئیں لب بھینچ گئے۔ ہاتھوں کی سخت مٹھیاں بند ہو گئیں۔

"تو آپ ہیں دلربا جی"۔ اس نے دانت چبا کر کہا آواز کی سختی سے ربا نے گھنیری پلکیں
اٹھائی تو زرد پڑ گئی۔ تھر تھر جسم کانپنے لگا۔ وہ طنزیہ مسکرا دیا۔

"یہ تحفہ میری یاد دلاتا رہے گا دلربا جی"۔ وہ طنزیہ بولا اور اٹھ کر اپنی نشست پر چلا
گیا وہ جو آنسو ضبط کر رہی تھی ایک دم تیز قدموں سے اٹھی اور باہر نکل آئی چند منٹ بھی اگر
وہاں بیٹھی رہتی تو دم گھٹ جاتا۔ بستر پر گر کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی اس کا سیٹ اتار کر فرش
پر پھینک دیا۔

"آغاجی کی یہ دو بیٹیاں ہی ہیں شاید"۔ واپسی پر شہریار نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے
اسامہ سے پوچھا۔ "ہنہ' ہاں" اسامہ کھوئے کھوئے سے بولے۔

"ویسے دلربا سچ مچ کی دلربا ہیں"۔ شہریار نے مکاری سے کہا اسامہ اسے تعریف سمجھے۔

"انسان جسے تلاش کرے وہ مل ہی جاتا ہے میرے یار"۔ شہریار نے پھر کریدا۔

"ہاں ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے"۔ اسامہ نے گاڑی کوٹھی کے گیٹ سے
اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں بتانا بھول گیا مجھے وہ دشمن جان مل گئی ہے"_ شہریار نے کرخت لہجے میں
بتایا۔

"ارے واقعی۔ کب کہاں یہاں ملتان میں"۔ اسامہ علی نے کمرے تک پہنچتے پہنچتے کئی
سوال کر ڈالے۔

"ابھی یہ نہیں بتانا جس دن اسے اجاڑ دوں گا اس دن بتاؤں گا"۔ شہریار کے اندر
جیسے آگ جل رہی تھی۔ ارے نہیں یار ایسے سفاک مت بنو اگر اتنا مرتے ہو تو طریقے سے اپنا
لو"۔ اسامہ علی بولے۔

"وہ اب پرائی ہو چکی ہے۔ سمجھتی ہے کہ کسی شریف کے کالر کا پھول بن کر رہے گی'
ہنہ احمق شہریار خان اسے برباد کر دے گا"۔ شہریار کے نفرت آمیز لفظوں پر اسامہ علی نے
حیرت سے دیکھا مگر وہ کر کچھ نہیں سکتے تھے سوائے افسوس کے کہ نجانے شہریار غلطی پر ہے یا وہ
اجنبی لڑکی۔

"او کے سی یو۔ میں چلتا ہوں کل ملیں گے"۔ شہریار خان نے سوچ میں ڈوبے ہوئے
اسامہ کو چونکایا اور لمبے لمبے ڈگ بھر کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اسامہ علی نے کپڑے تبدیل
کئے اور ہوسپٹل روانہ ہو گئے۔

رافعہ بیگم کی بھتیجی کی شادی تھی۔ آغاجی سمیت سب فیصل آباد گئے ہوئے تھے۔ مگر
اندر سے دلربا کی غصیلی آواز پر ان کے قدم رک گئے۔

"وہ غالبا" ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

"دیکھو دوست ایسے نہیں ہوتے"۔ اس کی ملتجی سی آواز تھی۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے"۔

"کیوں میری محبت کو پریشان کرتے ہو"۔ کھٹ سے ٹیلی فون بند ہوا اور ربا کی سسکی ابھری وہ بغیر دستک کے کمرے میں داخل ہوگئے۔

"آپ"۔ وہ سخت بوکھلا گئی۔ اس کی گھبراہٹ پر اسامہ الجھن کا شکار ہوگئے۔ انہیں ایک دم ہی دل میں کچھ اتھل پتھل ہوتی محسوس ہوئی۔

"کیا میں نہیں آسکتا"۔

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا"۔ وہ طریقے سے پلکیں صاف کر گئی۔

"آپ کچھ پریشان ہیں؟ انہوں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔

"آپ میری امانت بن کر پریشان تو نہیں ہیں"۔

"کیوں۔ آپ کا ساتھ تو نصیبوں والی کو مل سکتا تھا مگر مجھ بدنصیب پر قدرت نجانے کیوں مہربان ہوگئی"۔ وہ دھیمے سے بولی۔ "اس کی یہ بات ان کے دل سے شک کا کانٹا نکالنے میں کسی حد تک کامیاب ضرور ہوگئی مگر مکمل نہیں"۔

"ربا! میں نے دل کی گہرائیوں سے تمہیں چاہا ہے سو فیصد سونا ہے کوئی کھوٹ نہیں"۔ انہوں نے جذب سے اس کے شانے پکڑ کر اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے اس پار تک جھانکا۔ وہ پہلی بار بڑی ادا سے مسکرائی۔ پھر لمحہ بھر میں ڈھیر سارا خوف اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ جسے اسامہ علی نے واضح طور پر محسوس کیا مگر مصلحت کے تحت کچھ نہ پوچھ سکے۔

"نجانے آپ نے جانتے بوجھتے گندگی کی اس تصویر سے دل کیوں لگالیا؟" وہ روہانسی ہوگئی۔

"اس لئے کہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں' پیدا ہونے والا ہر بچہ معصوم ہوتا ہے۔ یہ ہم لوگ ہی ہوتے ہیں جو انہیں جیسے چاہیں ماحول میں چھوڑ دیتے ہیں"۔ اسامہ علی نرمی سے بولے۔

"مگر ہم جیسے لوگ دل لگی تو کرتے ہیں اپناتے نہیں کیونکہ ہمارے تعاقب میں رسوائیاں ان کے گھروں تک جا پہنچتی ہیں۔ اس وقت انہیں چین نہیں لینے دیتیں جب تک واپسی ان کا مقدر نہ بن جائے"۔ وہ کہیں دور کسی خوف کی دنیا سے بول رہی تھی۔

"کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بس آغاجی کے حوالے سے خود کو یاد رکھیں باقی کیا تھا؟ اسے بھول جائیں"۔ اسامہ نے پیار سے دیکھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے کی کسک بھول گئے۔

☆☆☆☆

کتنے ہی دن سبک روی سے گزر گئے۔ شہریار سے اسامہ علی کی تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ آج کل بہت ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ آج اسامہ علی کو ہوسپٹل میں دیر ہوگئی۔ تو شہریار ہوسپٹل پہنچ گیا۔ انہیں ساتھ لیا اور اصرار کیا کہ آغاجی کی طرف چلیں۔ اسامہ بھی کئی روز سے ان کی طرف نہیں گئے تھے۔ اس لئے "عروج پیلس" آگئے۔ ملازم نے بتایا کہ عروج بی بی اپنے کمرے میں ہیں۔ تو وہ دونوں عروج کے کمرے میں آگئے۔

"ہیلو"۔ اسامہ نے کہا۔

"ہیلو آیئے بیٹھئے"۔ عروج نے مسکرا کر انہیں کہا۔

"کیا حال ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"اچھا ہے آپ سنائیں؟"

"آغاجی کیسے ہیں؟"

"انہیں ہلکا سا بخار ہے اپنے کمرے میں ہیں"۔ عروج نے بتایا۔

"اوہ اچھا' میں دیکھ کر آتا ہوں آپ میرے دوست کو چائے پلوائیں"۔ اسامہ علی کہہ کر چلے گئے دراصل اس بہانے وہ ربا سے بھی ملنا چاہتے تھے۔ پہلے انہوں نے آغاجی کو چیک کیا۔ ان سے ہلکی سی گپ شپ کی پھر آرام کرنے کا مشورہ دے کر وہ دلربا سے ملنے چلے آئے کمرے میں داخل ہو کر وہ ٹھٹکے۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل پر سر ٹکائے ہچکیاں لے رہی تھی۔ ساتھ ساتھ بڑبڑا رہی تھی۔

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کیوں میری زندگی برباد کرنا چاہتے ہو؟" اسامہ علی چند ثانیے کھڑے رہے پھر بغیر کچھ کہے پلٹ آئے۔ عجلت میں شہریار کو ہمراہ لیا اور گھر چلے آئے۔ ذہن میں وہی خلش' وہی کسک بیدار ہوگئی۔ مضطرب سے سیدھے کمرے میں گھسے اور بیڈ پر لیٹ کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ شہریار سیٹی پر شوخ سے دھن بجاتا ہوا چلا گیا۔

اسامہ علی کو کسی کروٹ سکون نہیں آرہا تھا۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دلربا کسی اور کی محبت میں گرفتار ہے وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے کہیں میں نے انجانے میں یہ بھول تو نہیں کرلی" اسامہ علی' اپنی اندھی محبت میں تم شاید اس کی پسند نظرانداز کر گئے۔ " نہیں ایسا تھا تو وہ مجھے بتا سکتی تھی روک سکتی تھی۔ پھر ایسا کیوں نہیں کیا؟" وہ جھنجلا کر بولے۔

"میں ابھی پوچھوں گا ابھی_" وہ تیزی سے فون کی طرف لپکے اور نمبر ڈائل کیا۔ نمبر بزی تھا پھر ٹرائی کیا مگر بدستور نمبر بزی۔ تھا دوسرا نمبر ڈائل کیا تو عروج نے فون ریسیو کیا۔

"ہیلو"۔

"ہیلو ہاں خیریت"۔ عروج نے پوچھا کیونکہ کچھ دیر پہلے ہی تو وہ ان کی طرف سے گئے تھے۔

"دلربا سے ضروری بات کرنی تھی مگر اس کا نمبر"۔

"وہ شاید فون پر بات کر رہی ہے۔ عروج نے اس کی گھبراہٹ نوٹ کی۔ کس سے کچھ معلوم ہے تمہیں؟" انہیں نے تنک کر کہا۔

"کمال ہے اس میں معلوم رکھنے والی کون سی بات ہے اور پھر ویسے بھی وہ رباجی ہیں اس سے کون یہ پوچھے"۔ عروج نے یہ ہنس کر کہا۔

"خیر میں پوچھ سکتا ہوں مگر کیا کروں کہیں غلطی ضرور ہوگئی ہے،۔ وہ آہستہ سے بولے۔

"کیا کوئی مشکل پیش آئی ہے،۔ عروج نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں بھی اور نہیں بھی۔ خیر میں پھر فون کروں گا اللہ حافظ"۔ انہوں نے فون بند کیا اور دراز سے نیند کی گولی نکال کر کھائی اور لیٹ گئے اس سے بہتر حال کوئی نہیں تھا۔ اور واقع کچھ ہی دیر بعد دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔

ملتان کے قریب تقریباً بیس میل دور دیہات میں ملیریا کی وبا پھیل جانے کے سبب حکومت نے وہاں فری طبی امداد کیس سہولتیں فراہم کیں مگر ڈاکٹر اسامہ علی اپنے طور بھی وہاں فری کیمپ ضرور لگاتے تھے جہاں ایسے افتاد کی خبر ملتی۔ ڈاکٹرز' ڈسپنسرز کی ٹیم کے ساتھ وہ فوری طور پر وہاں چلے گئے۔ بغیر دلربا سے ملے۔ بلکہ کسی کو بھی انہوں نے اطلاع نہیں دی۔ دل کا

بوجھ بھی فرائض کی ادائیگی میں کہیں دب گیا۔ واپسی پر ہر بات چھوڑ کر وہ چلے گئے۔ وہاں انہیں پورا مہینہ لگ گیا۔ واپسی پر تھکن کے باعث وہ ایسے بستر پر گرے کہ بخار نے آلیا۔ دوائی کھا کر لیٹ گئے۔ رات گئے بخار کی حدت کچھ کم ہوئی تو انہوں نے اٹھ کر فون ملایا۔

"ہیلو____ہیلو"۔ وہ نقاہت سے بولے۔

"ہیلو"۔ دوسری طرف غفور کاکا کی مدھم آواز آئی۔

"ہاں کاکا' عروج بی بی سے بات کرائیں"۔

"جی وہ تو ہوسپٹل میں آغاجی کے پاس"۔ غفور کاکا کی رندھی ہوئی آواز میں دکھ تھا۔

"کیوں' کیا ہوا آغاجی کو کون سے ہوسپٹل"۔ وہ گھبراہٹ میں اوپر تلے کئی سوال کر گئے۔

"اسامہ بیٹا آغاجی کو ہفتہ پہلے ہارٹ اٹیک کا شدید دورہ پڑا۔ دل کے ایمرجنسی وارڈ میں اب کافی بہتر ہیں مگر مکمل صحت مند نہیں"۔ رافعہ بیگم جو کھانا لے کر ہوسپٹل جا رہی تھیں ٹیلی فون پر کاکا کو بات کرتا دیکھ کر خود بات کرنے لگیں۔

"اف میرے خدایا' ایسا کیوں ہوا مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟" وہ افسردگی سے بولے۔

"بس موقع ہی نہیں ملا۔ سب بہت پریشان تھے۔ خیر تسلی سے ہوسپٹل جاؤ"۔ رافعہ بیگم نے پیار سے نرمی سے دلاسہ دیا۔ فون بند کرنے کے بعد وہ ان کے بارے میں سوچ کر رہ گئیں۔ چاہنے کے باوجود اصل حقیقت بتانے کی رافعہ بیگم میں جرات نہیں ہوئی تھی۔ وہ پلو سے پلکیں صاف کر کے گاڑی کی طرف آگئیں۔

وہ بخار اور نقاہت سب بھول کر ہوسپٹل پہنچے۔ آغاجی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے انہوں نے سب سے پہلے ڈاکٹرز سے بات کی جب ذرا تسلی ہوئی تو وہ پھر کمرے میں پہنچے عروج کی سرخ سوجی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بہت روتی رہی ہے اور اب تک ٹھیک سے آرام بھی نہیں کیا ہے اسد خان بھی پریشان سے بیٹھے تھے۔ اسامہ علی نے ایک دم چونک کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ انہیں ربا نظر نہیں آئی۔

"ربا یہاں نہیں"۔ انہوں نے آہستہ سے عروج سے پوچھا عروج سے پہلے اسد خان درمیان میں بول پڑے۔

"بیٹا میں تھوڑی دیر کے لئے گھر جا رہا ہوں ذرا خیال رکھنا"۔

"انکل یہ کہنے کی بات ہے کیا؟" انہوں نے جواب دیا۔ اسد خان چلے گئے۔

"تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے' سب ٹھیک ہے' میں نے ڈاکٹرز سے تسلی کر لی ہے' انہوں نے عروج کو پھر روتا دیکھ کر کہا۔ اسی اثنا میں رافعہ بیگم آگئیں۔

"تم اسے سمجھاؤ' بلکہ کھانا کھلاؤ' اس نے سوائے چائے کے کچھ نہیں کھایا پیا"۔ رافعہ بیگم نے لنچ بکس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل' ہم دونوں کھائیں گے لیکن یہاں نہیں کینٹین جاکر"۔ اسامہ علی نے لنچ بکس اٹھایا اور ہونٹ کاٹتی عروج کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کا اشارہ کیا___ عروج کو مجبوراً" چلنا پڑا۔ "ویسے انکل بالکل ٹھیک تھے پھر یہ دورہ" چلتے ہوئے بولے۔

"صدمہ اگر غیر متوقع ہو تو جان چلی جاتی ہے آپ دورے کی بات کر رہے ہیں"۔ کینٹین میں بالکل ایک طرف میز پر بیٹھتے ہوئے وہ افسردگی سے بولی۔

"مثلاً "کون سا صدمہ؟" وہ حیرت زدہ سے بولے۔

"چھوڑیں اس بات کو آپ کی طبیعت بھی تو ٹھیک نہیں لگتی"۔ وہ بات بدلنے لگی۔

"ہاں تھکن اور بے آرامی سے بخار ہو گیا تھا لیکن تم بتاؤ کیا بات ہے؟ اور وہ ربا نظر نہیں آرہیں"۔ وہ پھر بے چینی سے بولے۔

"کھو جانے والی چیزیں نظر نہیں آتیں۔ آنکھیں کھوجتی کھوجتی دھندلا جاتی ہیں مگر کچھ نظر نہیں آتا"۔ عروج کی آنکھیں پھر جل تھل ہوگئیں۔

"عرج کیا' کیا' مطلب ہے تمہارا؟ صاف صاف بات کرو"۔

"رباجی' سراب تھیں' نظروں سے انہیں تلاش اب مت کریں' وہ نجانے کہاں چلی گئیں"۔ آغاجی کو یہ صدمہ دے گئیں"۔ عروج کے بھیگے ہوئے لفظوں نے اسامہ علی کو چکرا کے رکھ دیا۔ کرسی کی پشت پر سر نہ لگاتے تو عین ممکن تھا فرش پر جا گرتے۔ کچھ دیر کے لئے واقعی انہیں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس صدمے کی توقع تو انہیں بھی نہیں تھی۔

"کیوں کیوں عروج؟ ربا نے ایسا کیوں کیا؟ وہ جذباتی ہو گئے۔

"پتا نہیں شاید ہماری محبتوں میں کچھ کمی رہ گئی"۔ عروج گھگیا سی گئی۔ بلاشبہ وہ اسے بہنوں کی طرح چاہتی تھی۔

"ربا نے بے وفائی کی مگر کیوں؟" وہ سسک اٹھے۔

"جہاں جہاں ممکن تھا ہم نے تلاش کیا مگر ان کا کچھ پتا نہیں چلا"۔ عروج بے بسی سے بولی۔

"اف میرے خدا یہ کیا ہو گیا؟" مارے غم کے چہرہ زرد ہو گیا۔

؟منگنی کی انگوٹھی ان کے بستر پر رکھی تھی۔ عروج نے دکھ سے اس خوبصورت انسان کو دیکھا جس نے ٹوٹ کر ربا کو چاہا تھا۔

"عروج! میں گھر جا رہا ہوں کچھ دیر اور یہاں بیٹھا رہا تو دم گھٹ جائے گا"۔ لرزتے قدموں سے وہ بمشکل چل دیے۔ عروج نے بھی زیادہ پس و پیش نہیں کیا۔ خود آغاجی کے پاس چلی گئی اور وہ ہوسپٹل سے باہر آگئے۔

بخار نے اس شدت سے آلیا کہ وہ بے سدھ کئی روز پڑے رہے۔ ان کے ہوسپٹل سے ڈاکٹر یاور نے آکر انہیں چیک کیا۔ دوائی دی انجکشن لگایا۔ ملازم کو خیال رکھنے کی ہدایت کی۔ شام سے بخار پھر ذرا ہلکا ہوا تو انہوں نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر غلام محمد کو دیکھا۔

"شکر ہے اللہ پاک صاحب جی میں یخنی لے آتا ہوں"۔

"نہیں یہ بتاؤ کوئی آیا تو نہیں"۔ ان کے اندر یہ خوش فہمی تھی کہ شاید وہ انہیں ملنے ہی آئے' جانے کا بتانے آئے۔

"ڈاکٹر یاور صاحب آئے تھے' عروج بی بی آئی تھیں'

"عروج بی بی کچھ کہہ رہی تھیں"۔

"جی وہ کہہ رہی تھیں کہ صاحب سے کہنا خود کو سنبھالیں' میں رات پھر آؤں گی"۔

غلام محمد نے لفظ بہ لفظ بتایا۔

"ہنہ سنبھال کر رکھوں"۔ دل کا درد پھر زور سے جاگا۔

"صاحب جی' ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ یخنی پلا کر آپ کو پھر دوائی دینی ہے۔ خالی پیٹ نہیں یہ ایک ہفتے کی ڈاک اکٹھی ہو گئی ہے یہ دیکھ لیں میں اتنے میں لے کر آتا ہوں"۔ غلام محمد نے کافی سارے خطوط سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیئے۔

"فی الحال یخنی نہیں پانی پلاؤ اور چائے بنا کر لاؤ"۔ انہوں نے تکئے کے سہارے اٹھتے ہوئے ٹیک لگائی اور تمام خطوط اٹھا کر دیکھنے لگے۔ لمحہ بھر کو وہ چونکے دل زور سے دھڑکا وہ خط ربا کا ہی تھا۔ تیزی سے انہوں نے لفافہ چاک کیا اور بے چین نظریں سطروں پر پھسلنے لگیں۔

اسامہ علی صاحب

تسلیم عرض!

جس وقت یہ خط آپ کے ہاتھ میں ہو گا۔ اس وقت میں اپنی خوبصورت رنگین دنیا میں کسی کا دل بہلا رہی ہوں گی۔ آپ کو یقیناً بہت غصہ آئے گا۔ بہت برا بھلا کہیں گے مگر مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ بھی سارے مردوں کی طرح دل پھینک ہی نکلے' خوب محبت کا واویلا مچایا یہ بھول گئے کہ میں وہ روایتی لڑکی نہیں جو محبت کے بدلے میں شادی کے خواب بنتی آپ کی منگنی پر بلیوں اچھلتی۔ بلکہ میرا تعلق ایسے ماحول سے ہے جہاں دلوں سے بھاری قیمت کے بدلے کھیلا جاتا ہے لیکن کسی ایک کی انگوٹھی پہن کر پابند نہیں کیا جاتا۔

میں نے لاکھ کوشش کی کہ تم شادی کے ارادے سے باز آجاؤ مگر تم تو ٹھہرے میاں سچے مجنوں' سریش کی طرح چپک گئے۔ مجھے کچھ دنوں بعد تو جانا ہی تھا لیکن تمہاری محبت سے خوف کھا کر میں پہلے ہی واپس جا رہی ہوں۔ آئندہ کسی دلربا سے یہ توقع نہیں رکھنا کہ وہ صرف تمہاری دلربا بن کر رہے گی۔ ہماری دلربانہ ادائیں ہر روز نیا چہرہ دیکھتی ہیں۔ مجھے معاف کر دینا کہ ہماری سرشت میں ہی بیوفائی ہے۔

فقط۔ دلربا

"ہنہ' کمینی' ذلیل' آخر ربا سے دلربا کی طرف لوٹ ہی گئی' شدید حقارت سے انہوں نے خط پرزے پرزے کر دیا۔

"طوائف زادی ایک دفعہ شرافت کی زندگی بھی گزار کو دیکھتیں مگر نہیں تم اس قابل کہاں؟ تمہارے گندے وجود کی بھیانک اصلیت ہوتی ہی یہ ہے میں جان چکا تھا کہ تم کسی اور

سے بھی محبت کا کھیل کھیل رہی ہو مگر پھر بھی میں تمہیں گنگا جل سمجھا' یہ میری بھول ہی تھی۔ تم صرف بستر کی شکن دیتی ہو' روح کو طمانیت نہیں' تمہارے وجود ہوس کی خوراک مانگتے ہیں' محبت پیار' کی چاشنی نہیں' اچھا ہوا تم نے اصلیت دکھا دی آئندہ اسامہ علی تماش بینی تو کرے گا محبت نہیں۔ تمہارے گھنگروؤں کی جھنکار تو سنے گا مگر سسکیوں کی آواز نہیں۔ مجھے طوائف کا فلسفہ سمجھ آگیا ہے۔ سمجھ آگیا ہے۔ وہ دیوانوں کی طرح زور زور سے چلانے لگے۔ مگر اسی دوران دو موٹے موٹے آنسو ان کی پلکوں سے ٹوٹے اور محبت کے نقوش دھندلا سے گئے۔ انگلی میں پڑی انگوٹھی اتار کر دور پھینک دی۔

"اس طرح درد بڑھے گا کم نہیں ہو گا"۔ شہریار خان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور فرش پر پڑی انگوٹھی اٹھا کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔

"شہریار' میرے دوست اچھا ہوا تم آگئے' مجھے دوست کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی"۔ وہ تڑپ کر شہریار سے لپٹ گئے۔

"کم ان یار' یہ چھوکریاں تو آتی جاتی رہتی ہیں ان کے لئے اتنا ماتم مناسب نہیں"۔ شہر یار نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

"کاش وہ ایسا نہ کرتی"۔

"کیوں نہ کرتی اسے کرنا ہی تھا"۔ شہریار وثوق سے بولا۔

"کیوں؟"

"بھئی بیوفائی کرنا لڑکیوں کی عادت ہے مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آغا جی کی بیٹی گھر کیسے چھوڑ گئی"۔ شہریار نے نہایت عجیب انداز میں بات کی۔ اس سے پہلے کہ اسامہ کوئی جواب دیتے عروج آگئی۔

"کیسے ہیں آپ؟ عروج نے اسامہ علی کی حالت تشویش سے دیکھی۔

"زندہ ہوں تم بتاؤ آغا جی کیسے ہیں؟" وہ کرب سے بولا۔

"اب کافی بہتر ہیں کل ڈاکٹر نے گھر لے جانے کے لئے کہہ دیا ہے"۔

"اللہ انہیں سلامت رکھے"۔ اسامہ بولے۔

"اچھا یار' مجھے لاہور جانا ہے پھر ملیں گے"۔ شہریار نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا تم لاہور جا رہے ہو' مجھے تمہاری ضرورت ہے اور تمہارا کام؟"

"مائی ڈیر کام میرا مکمل ہو گیا اور تم انسان بنو انگڑائی لو اور اس کی یاد جھٹک دو۔ عورت کی محبت اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھے اور میں فون کرتا رہوں گا"۔ شہریار نے سگریٹ کے مرغولے میں انکی بات اڑا دی اور خدا حافظ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ہنہ کہتا ہے جھٹک دو مگر کیسے؟، وہ مضطرب سے بڑبڑائے۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ کے دوست اگر رباجی نے محبت کا پاس نہیں کیا تو پھر آپ خود کو تباہ کیوں کریں"۔ عروج نے کڑک لہجے میں کہا۔

"خدا کرے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود سے بھی نفرت کی جائے بلکہ سراپا محبت بن جائیے سب کے لئے"۔ عروج کے لرزتے لہجے میں نجانے کیا تھا کہ اسامہ علی نے چونک کر عروج کو دیکھا اور مفہوم میں الجھ گئے۔

زندگی کے معاملات شدید حادثے سے نکل کر معمول پر آ گئے۔ کچھ فرق ضرور پڑا تھا۔ آغاجی بالکل چپ چپ رہنے لگے تھے۔ عروج بھی خاموش سی ہو گئی تھی۔ اسامہ علی نے شدید نفرت سے محبت کو شکست دے دی تھی مگر پھر بھی کبھی کبھی سخت اداس اور بے چین ہو جاتے تھے۔ یہ انسانی زندگی کا اصول ہے کہ حادثات کے بعد سب کام معمول پر آ ہی جاتے ہیں۔ اسامہ علی اب بھی آغاجی سے ملنے کے لئے ان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے تقریباً روز ہی کچھ وقت نکال لیتے تھے۔

لیکن آج جب وہ شام آغاجی کو ملنے گئے تو آغاجی لان میں ہی بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی عروج رسالہ پڑھ رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر آغاجی نے عروج کو خصوصی آرڈر جاری کر دیا۔

"بیٹا پہلے اچھی سی چائے بھیجو' پھر رات کے کھانے پر عمدہ ڈشز بنواؤ اسامہ علی کھانا کھا کر جائیں گے"۔ عروج مسکرا کر چلی گئی۔ اسامہ ان کی محبت کے سامنے صرف گردن ہلا کر رہ گئے۔

"برخوردار ربا کے جانے سے میری صرف ایک بیٹی رہ گئی ہے مگر وہ بھی اداس افسردہ' میں اس کی خوشی پوری نہیں کر سکتا' اس کا مجھے قلق ہے"۔ آغاجی غمگین سے ہو گئے۔

"خوشی پوری ہو سکتی ہے آغاجی آپ حکم کریں"۔ انہوں نے بغیر سوچے ہی اتنی بڑی بات کہہ دی۔ آغاجی نے فکر انگیز لہجے میں پوچھا۔

"کیسے؟"

"میں کوشش کروں گا کہ زندگی کی ہر خوشی عروج پر نچھاور کر دوں میری انگوٹھی عروج کو پہنا دیجئے۔ اسامہ علی سالوں کا فاصلہ ایک ہی جست میں طے کر گئے۔ آغاجی کی آنکھیں تشکر سے بھر آئیں۔

"لیکن بیٹے محبت جس سے کی جائے اسے بھلایا"۔

"اسے بھلا کر ہی کہہ رہا ہوں"۔ اسامہ علی نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

"اے خدا ربا نے میری نیکی برباد کر دی' حق ادا نہیں کر سکا مجھے بخش دینا"۔ آغاجی نے رندھی ہوئی آواز میں اللہ کو مخاطب کیا۔

"پلیز آغاجی! کتاب کے اس ورق کو پھاڑ ڈالئے بس"۔ اسامہ علی نے آہستہ سے کہا۔

آغاجی نے ہولے سے گردن ہلا دی۔

☆☆☆☆

پھر کاتب تقدیر نے دیکھا کہ جو اس نے لکھا وہی ہوا۔ محبت کس سے کی اپنایا کسے؟ عروج خوبصورت سی شام ان کی زندگی میں شامل ہو گئی اور کاروبار ہستی مصروف عمل ہو گئی۔ عروج نے انہیں محبت کی باہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ اس کی محبت میں سب کچھ بھول گئے۔ کب صبح ہوتی کب شام ڈھلتی انہیں پتہ بھی نہ چلتا۔ عروج نے انہیں ذہنی طور پر اتنا پر سکون کر دیا تھا کہ انہوں نے ہوسپٹل کے ساتھ والا پلاٹ خرید کر ہسپتال کو مزید وسیع کر لیا۔ ہوسپٹل کی وسعت کے ساتھ ہی مصروفیت بھی حد درجہ بڑھ گئی۔ اس مصروفیت پر عروج کو غصہ آتا تھا۔ آج بھی اس نے بار بار صبح تاکید کی تھی کہ جلدی گھر آنا۔ مگر چاہنے کے باوجود وہ بہت لیٹ ہو گئے۔

"ہیلو مائی ڈیئر بیگم صاحبہ"۔ انہوں نے شرارت سے اسے باہوں میں جکڑ لیا۔ اس کا موڈ آف تھا۔ ساری تیاری ضائع ہو گئی تھی۔

"بات مت کریں مجھ سے۔" وہ باہوں کی قید سے آزاد ہو کر دور ہو گئی۔

"اتنا ستم' اس کمزور دل پر"۔ انہوں نے پھر سے قریب کر لیا۔

"سخت مکاری' جھوٹ' کوئی احساس نہیں' میں نے تیاری کی"۔ وہ تقریباً" رو دی۔

"ارے نہ نہ جان تمنا' ہم آپ کی تیاری کا پورا پورا ہرجانہ دیں گے" انہوں نے شوخی سے اس کے کان میں کہا تو وہ گلرنگ ہوگئی۔

"وہ جو آغاجی انتظار کر رہے ہوں گے"۔ اس نے منہ بسورا۔

"ابھی چلتے ہیں وہ اپنا گھر ہے چاہے جس وقت مرضی چلو"۔

"نہیں اب بہت دیر ہوگئی کل چلیں گے"۔ وہ خود ہی بولی۔

"آل رائٹ۔ اب آپ کھانا کھلوائیں بہت بھوک لگی ہوئی ہے"۔ وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بولے اور وہ خوشی خوشی باہر کچن کی طرف آگئی۔

"میری رپورٹس کا کیا ہوا؟" کھانے کے دوران اس نے پوچھا۔

"او' مائی گاڈ میرے بریف کیس میں ہیں' دیکھنے کی فرصت بھی نہیں ملی"۔ وہ شرمندگی سے ماتھا سہلاتے ہوئے بولے۔

"اب دیکھ لیجئے اپنی حالت"۔ عروج نے خفگی سے دیکھا۔

"ہم کھانا بعد میں کھائیں گے پہلے رپورٹیں دیکھیں گے"۔ یہ کہتے ہوئی وہ بنا اس کی بات سنے جلدی سے گئے اور کچھ ہی دیر میں بھاگتے ہوئے آئے اور اس کی کرسی پر جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"مطلب یقیناً" سمجھ میں آگیا ہو گا"۔ وہ مسرور سے بولے۔

"کیا مطلب بتایئے جلدی"۔ وہ تشویش سے بولی۔

"تو پھر ایسے سمجھئے"۔ انہوں نے کھینچ کر سینے سے لگالیا۔

"اوں ہنہ یہ کیا ہے"۔ وہ بری طرح شرمائی۔

"خوشخبری ہے تم اماں بننے والی ہو"۔ انہوں نے زور سے بھینچا اور چلا کر کہا تو وہ لجا کر کمرے کی طرف دوڑ گئی۔

زندگی میں تبدیلی آئے تقریباً" سال ہو چلا تھا۔ اپنی زندگی کے ماہ و سال کے بارے میں سوچتے ہوئے کئی جگہوں پر انہیں دلربا یاد آئی۔ بلکہ اس شدت سے یاد آئی کہ وہ دل کا درد بمشکل سنبھال سکے۔ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے آج کافی عرصے بعد مصروفیت کے لمحات میں انہیں سوچنے کا موقع ملا۔ زندگی بھی عجب گورکھ دھندا ہے۔ آدمی کیا چاہتا ہے کیا کرتا ہے؟ کیا سوچتا ہے" کیا بنتا ہے؟ نجانے کتنی دیر وہ دکھ سکھ کے پٹارے سے اپنی زندگی کے رنگ نکالتے کہ سسٹر نے کمرے میں داخل ہو کر گھبراہٹ میں انہیں پکارا۔

"ڈاکٹر صاحب آؤٹ ڈور میں ایک مریضہ خون کی الٹی کرنے کے باوجود نہ اسٹریچر پر لیٹتی ہے نہ علاج کے لئے رضامند ہے بس صرف آپ سے ملنا چاہتی ہے"۔

"کیا کون ہے یہ کیا بات ہوئی"۔ وہ بوکھلا کر اس کے ہمراہ آؤٹ ڈور کی طرف دوڑے ایک ہجوم تھا وہاں جمع۔

"ہٹو' سب لوگ ہٹیں"۔ انہوں نے چیخ کر سب کو پرے کیا اور مریضہ کے قریب زمین پر بیٹھ گئے۔

"تم"۔ حیرت سے فقط اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے پر غصہ عود آیا رگیں تن گئیں بلاشبہ وہ دلربا ہی تھی مگر ایسے حال میں خون کی الٹیاں کرتی ہوئی۔ بکھرے بال' زرد رنگت' اندر کو دھنسی آنکھیں' پھڑپھڑاتے خشک لب' جسم جیسے ایک پنجر

"ہاں ہاں میں دل' دلربا"۔ اس نے ان کے پیر پکڑ کر لمبی لمبی سانسوں کے درمیان کہا۔

"چھوڑ دو مجھے' میں تمہیں نہیں جانتا"۔ انہوں نے جھٹکے سے پیر چھڑائے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اپنے آفس واپس آگئے پورا وجود دھوئیں میں تحلیل ہو گیا تھا۔ اضطرابی کیفیت میں زور زور سے مکے دیوار پر مارنے لگے۔

"کیوں آئی ہو میری دنیا برباد کرنے کے بعد' مجھے تمہاری شکل نہیں دیکھنی"۔ ہزیانی انداز میں چلائے۔

"تمہیں دیکھنی پڑے گی' ملنا ہو گا اس مظلوم سے ڈاکٹر ہو جلاد نہیں"۔ ایک ادھیڑ عمر کمزور سی عورت نے کمرے میں داخل ہو کر انہیں جھنجھوڑ دیا۔

"کون ہیں آپ؟"

"اس بدنصیب کی ماں"۔

"کیوں لائی ہو اسے یہاں' وہ میری محبت کی دنیا اجاڑ کر مجھے دھوکے سے آشنا کر چکی ہے' تم نہیں جانتیں کہ وہ کون ہے۔ وہ طوائف زادی ہے اور وہ لوٹنا جانتی ہے۔ مجھے اس سے نہیں ملنا۔ چلی جائیں آپ"۔

"اتنی بڑی گالی مت دو وہ بے بس تو محبت کا دم بھرتے بھرتے اس حالت کو پہنچ گئی۔ تمہاری محبت کو دھوکے سے ناآشنا رکھنے کے لئے خود قربان ہوگئی۔ دھوکے کا مطلب پوچھنا ہے تو جاؤ اپنے دوست شہریار خان سے پوچھو۔ کیا دوست اس طرح لوٹتے ہیں۔ میری بچی خود سے لڑتے لڑتے راکھ ہوگئی"۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔

"شہریار خان' کیا مطلب؟" حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"ہاں شہریار خان' سفاک درندہ' جس سے بچانے کے لئے میں نے اپنی بچی اپنے سے الگ کی۔ اسے ایک مہربان نے چھت دی۔ تم نے محبت دی مگر اس نے جینا حرام کر دیا اور تم سب کی عزتیں بچانے کی خاطر وہ واپس اسی دنیا میں لوٹ گئی۔ جہاں روز مرتی تھی روز جیتی تھی اور آخر کو کینسر نے گھیر لیا۔ بولو کیا یہ دھوکہ ہے؟ ہم گندے تن ضرور کہلاتے ہیں مگر من کے اندر ہمارے وہی محبت کی تڑپ' عزت کی زندگی اور خواہش موجود ہوتی ہے۔ لیکن شہریار جیسے بھیڑیئے انہیں اسی جہنم میں پہنچا دیتے ہیں"۔ وہ عورت روتے روتے بے حال ہوگئی۔ اسامہ اب جس دکھ سے گزر رہے تھے اس میں افسوس اور ملامت کا عنصر زیادہ تھا۔ دوست سے اس طرز عمل کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

"ربا نے مجھے بتایا کیوں نہیں' کاش وہ مجھے بتا سکتی"۔ اشکوں نے صبر کا دامن چھوڑ دیا۔

"کیا بتاتی' ایک دوست کو دوست کے بارے میں' خود کو روگ لگالیا۔ جاؤ بیٹا اس نے ایک ایک سانس میں تمہارا نام لیا ہے۔ لاہور سے ____ وہ موت سے لڑتے لڑتے یہاں تک پہنچی ہے۔ اس سے مل لو' اسے اپنی شکل دکھادو۔ دکھادو"۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

اسامہ بجلی کی سی سرعت سے باہر نکلے۔ راستے میں ڈاکٹر معین قریشی نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

"رک جایئے ڈاکٹر اسامہ' افسوس کہ آپ کی مریضہ موت سے شکست کھا گئی' صبر کریں"۔

"نہیں نہیں"۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ کر بھاگے۔ برآمدے میں اسٹریچر پر ہمیشہ کی طرح چپ لگائے وہ سو چکی تھی۔ اس کے چہرے کی معصومیت بتا رہی تھی کہ وہ کتنا انہیں چاہتی تھی۔

"صبر کریں ڈاکٹر"۔ ڈاکٹر ذاکر نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کیسے صبر کروں؟ مجھے میرے دوست نے لوٹا' مجھے پیارے دوست نے برباد کیا۔ کیا دوست ایسے ہوتے ہیں۔ پروردگار' تو نے دوستی کے روپ میں جلاد کیوں بنا دیئے۔ دنیا میں اگر دوست بھی قابل اعتبار نہیں تو پھر تو ہی زمین پر آجا کہ تجھے دوست بنالیں۔ اپنا غمگسار جان لیں۔ میری دلربا نے اپنی وفا' پاکیزگی اور بھرم کی مثال پیش کی ہے۔ شہریار آؤ آکر اس کی عظمت کو سلام کرو' تم نے اسے کیچڑ میں گھسیٹا مگر کنول تو ہمیشہ کیچڑ میں ہی کھلتا ہے۔ اچھائی اور فطری پاکیزگی۔ کسی ماحول کی محتاج نہیں' گلاب چاہے بازار حسن میں ہو یا آغا جی کے جیسے بڑے شیش محل میں گلاب ہی رہتا ہے۔ تم نے محبت کی دوستی کی ہی توہین نہیں کی بلکہ پوری انسانیت کی تذلیل کی ہے' خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ وہ روتے روتے ڈاکٹر ذاکر کے بازوؤں میں جھول گئے۔ شاید بے ہوش ہوگئے تھے اور اس دکھ کے مقام پر بے ہوشی یقینی تھی۔

بڑی دیر تو نے کردی مری جان آتے آتے
میرے ہونٹ تھک گئے ہیں ترے گیت گاتے گاتے

☆☆ ☆☆☆ ☆☆

صدف

"پلیز صدف باجی ایسا مت کریں۔" روما کی آواز بھرا گئی۔

"روما' روما' میری بات سمجھنے کی کوشش کرو' میں غلطی پر نہیں۔" صیف نے پیاری بہن کو گلے سے لگالیا۔

"آپ غلط ہی تو کر رہی ہیں۔ بھلا زین بھائی کیا سوچیں گے؟"

"جانتی ہوں' مگر ان کی سوچیں اس مڑے تڑے فکر زدہ گھر کو نہیں بچاسکتیں۔" اس نے لمبی سانس بھر کے کہا۔ تو روما چلا پڑی۔

"مگر جانے دیں اس کو' مگر اپنا' زین بھائی کا کچھ خیال کریں۔"

"شور مت کرو روما' میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔" وہ تیزی سے بولی۔

"باجی! ابا اور اماں بھی آپ سے خفا ہیں۔" ننھے احمد نے بھی اسے اداس نظروں سے دیکھا۔ اٹیچی میں کپڑے رکھتے رکھتے وہ دوڑ کر احمد کے پاس گئی اور اسے سینے سے لگالیا۔

"احمد! تم چھوٹے ہو ذہن پر بوجھ مت ڈالو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کو اندازہ نہیں زین بھائی کتنا چاہتے ہیں آپ کو۔" روما تلخی سے بولی۔

لمحہ بھر کو اس کا دل پھڑپھڑایا مگر پھر سنبھل گئی۔ "سب اندازہ ہے مجھے' وقت اور حالات سب کچھ سکھادیتے ہیں' آج جو میں کرنے جارہی ہوں وہ وقت کا فیصلہ ہے۔"

"ایک مرتبہ غور کرلیں' ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔" روما نے آخری التجا کی۔

"اللہ کے واسطے مجھے تنہا چھوڑ دو۔ جاؤ اماں کے ساتھ مل کر سامان باندھ لو۔" وہ غصے سے بولی تو روما کے ہمراہ احمد بھی چپ چاپ باہر چلا گیا اور وہ کٹی ہوئی ڈال کی طرح پلنگ پر گر گئی۔

وہ جانتی تھی کہ اس کا یہ انتہائی قدم کم از کم اس کی زندگی سے سب بہاریں لے جائے گا۔ اس کے بچپن کا ساتھی زین ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے گا۔ محبت کے سارے دیپ بجھ جائیں گے۔ ارمانوں اور آرزوؤں کے پھول مرجھاجائیں گے۔ وہ سارے خواب جو ایک خوبرو حسین لڑکی دیکھتی ہے۔ سب خاک میں مل جائیں گے۔

"صدف یہی تیرا مقدر ہے۔ تو اسے جھٹلا نہیں سکتا۔" ذہن کی تاویل پر اس نے سختی سے ہونٹ سی لئے اور بیگ اٹھا کر کمرے پر سرسری نظر ڈال کر باہر نکل گئی۔

صحن میں بنے ایک طرف چولہے پر اماں سوکھی خشک روٹیاں پکا رہی تھیں۔ ہاتھ روٹیاں پکانے میں مصروف تھے مگر چہرہ ایک سوال بنا ہوا تھا۔ سوچ کی لکیریں پیشانی پر صاف نظر آرہی تھیں۔ دائیں طرف خاموش سی روما اور احمد دبکے کھڑے تھے اور ذرا سے فاصلے پر جھلنگے سے پلنگ پر ابامیاں لمبی' اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہے تھے۔ نہایت مغموم نظروں سے انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دوڑ کر ان کے قریب گئی اور پٹی پر بیٹھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں سے لگالیا۔ ابامیاں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"نہیں' نہیں' ابامیاں' بس اتنا جان لیں کہ مجھے آپ کی زندگی چاہئے ہر قیمت پر چاہئے۔" اس کے لبوں کی جنبش نے ابامیاں کو ایک بار پھر چپ کرا دیا جب کہ اماں بول پڑیں۔

"قسمت میں جو دکھ لکھے ہیں ان سے اس طرح بھاگنا بھلا۔"

"اماں! میں بھاگ نہیں رہی بلکہ بغاوت کر رہی ہوں میں اپنے ہاتھوں سے آپ سب کو سنوارنا' سجانا چاہتی ہوں' مجھے حوصلہ دیں۔" وہ مضبوط سے لہجے میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ بغاوت نہیں بزدلی ہے' کم ہمتی ہے۔" صحن میں آتے ہوئے زین نے کہا تو وہ لمحہ بھر کو سٹپٹا سی گئی اور نظریں چرانے لگی۔

"ہمت سے تو انسان آگ کا دریا بھی عبور کر جاتا ہے۔ بڑی سے بڑی فصیل گرا دیتا ہے' آؤ میرے ہاتھ میں ہاتھ دو' مل کر اس گھر کی خوشیاں حاصل کریں' تم پڑھی لکھی ہو' اور یہ راہ منتخب کی ہے۔"

"پلیز زین' مجھ سے یہ باتیں' سب کر چکے ہیں' تم کوئی اور بات کرو' میں جانتی ہوں کہ پسماندہ غریب گھر کی لڑکیاں پڑھ لکھ کر بھی زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتی ہیں۔ صرف دال اور روٹی

کے چکر میں زندگی گزر جاتی ہے۔ اس گھر کو ان سب کو بچانے کے لئے اتنی بڑی لاٹری کی ضرورت تھی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کو بولتی ہوئی زین کے بالکل قریب آگئی۔ اتنی قریب کہ اس کی سیاہ شکائتی آنکھوں کے حصار میں مقید سی ہوگئی۔

"میری طرف دیکھو' تمہیں وہ خواب میری آنکھوں میں روتے نظر آئیں گے۔"

"زین! جو بچپن سے اب تک خواب دیکھے تھے وہ بند آنکھوں کے خواب تھے۔ آنکھیں کھلی ہوں تو بھیانک حقیقتیں جینا حرام کر دیتی ہیں۔ ویسے بھی حقیقت سے نظر چرانا مجھے پسند نہیں۔" وہ اس کی آنکھوں کے حصار سے آزاد ہونے کی کوشش میں ذرا دور کھڑی ہوگئی۔

"لیکن جس راہ کا انتخاب تم نے کیا ہے یہ بھی تو تلخ بھیانک حقیقت ہے۔ جو ہے نہیں تم اسے محسوس کیوں کرتی ہو؟" زین کی درد بھری آواز نے اسے چونکا دیا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ' ایک انتہائی عمر رسیدہ اور بیمار شخص سے عمر بھر کا سنجوگ کتنے حوصلے و جرات کی بات تھی۔ جو سنہرے سپنے دیکھے تھے ان کی تعبیر اتنی بھیانک ہوگی یہ تو واقعی اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔ مگر وقت نے اس سے اٹل فیصلہ کرا لیا تھا۔

"زین' میری قربانی سے بہت سارے لوگوں کی اس سسکتی زندگی سے جان چھوٹ جائے گی۔ کسی ایک کو تو گھر بچانا چاہئے۔ اس نے بڑی تسلی سے کہا۔

"لیکن کیا یہ زیادتی نہیں کہ کسی کے پیسے سے زبردستی کا رشتہ جوڑ کر ہم سکھ خریدیں بولو' منافقت نہیں کیا یہ؟" زین کے دو دھاری لفظوں نے اسے گویا تڑپا کر رکھ دیا۔ دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔

"جو مرضی نام دو' اپنی خوشی سے بڑھ کر کسی کی خوشی نہیں ہوتی۔" وہ زہرخند سی بولی۔

"تو صدف تمہاری خوشی کیا یہی ہے مرزا عظمت کی شراکت' زندگی کا سودا" زین نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"نہیں' مجھے اپنی پرواہ نہیں رہی' شاید میری خوشی اسی میں ہو۔" وہ رخ موڑ کر بولی۔

"غلط' بلی کے خوف سے کبوتر آنکھیں بند ضرور کرلے مگر بلی کی موجودگی تو مسلمہ حقیقت ہے۔" زین نے طنزیہ کہا۔

"پلیز زین' اب بیکار ہیں ساری باتیں' مجھے یوں تنگ مت کرو۔" وہ منت آمیز لہجے میں بولی۔

"میرے بارے میں کیا حکم ہے مستقبل کی مسز مرزا عظمت بیگ؟" زین نے نہایت مدھم آواز میں پوچھا۔

"پلیز زین' مجھے اپنے دل کی محبتوں میں آباد رہنے دو' کیونکہ تمہاری نفرت مجھے مار ڈالے گی۔" وہ آنکھوں میں بے بسی لئے اس کے قریب آگئی۔

"ظالم ہو صدف' میری دنیا برباد کر کے بھی خیال ہے کہ آباد رہوگی' بھلا دل ہی نہ رہا تو کہاں رہوگی؟" وہ شکست خوردہ سا بولا۔

"نہیں' ایسا مت کہو' میں خود غرض ہوں' لیکن تمہاری محبتوں کے درمیان رہنا چاہتی ہوں' جسے چاہو اپنا لینا' مگر ایک گوشہ صدف بدنصیب کے لئے ضرور رکھنا' کہ میں شاید کبھی تھک کر سکون کے لئے تمہارے دل کے گوشہ عافیت میں آؤں۔" اس نے جھکی جھکی پلکوں کے سائے میں زین کو پابند محبت کرنا چاہا جب کہ وہ تو فقط اتنا کہہ سکا۔

"صدف! زین موت کے سوا ہر پل' ہر لمحہ تمہارے لئے جیئے گا' منتظر رہے گا' تم سے پہلے موت آگئی تو معاف کر دینا۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے سے نکل گیا اور اسے لمحوں میں بانٹ گیا۔ منتشر کر گیا۔ وہ جو ایک ہفتے سے خود کو سمیٹ سمیٹ کر اپنی مضبوطی اور ہمت کا امتحان لے رہی تھی' ایک دم بھربھری مٹی کی مانند بکھر کیسے گئی۔ چند ثانئے ڈبڈباتی آنکھوں سے وہ خالی دروازے کو گھورتی رہی پھر پلٹ کر روما سے بولی۔

"روما! خاص' خاص سامان پیک کر لو' شام کو گاڑی آئے گی' کوٹھی پہنچا دے گی۔" وہ سوالیہ نظروں سے اماں اور ابا میاں کو دیکھتی رہی کہ شاید ان دونوں میں سے کوئی کچھ کہے مگر وہ چپ تھے۔ گیٹ پر گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر وہ بیگ اٹھا کر آہستہ چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆ ☆

مئودب باوردی ڈرائیور نے جونہی کار کا دروازہ کھولا تو وہ پیچھے چھوڑ آنے والی بوسیدہ زندگی کے تلخ تجربات سے چونک کر مستقبل کے سنہرے چمکیلے شیش محل میں آگئی۔ نہایت باوقار انداز میں وہ سنگ مرمر کے فرش پر چلتی ہوئی نوکروں کی ایک فوج کے درمیان ایک سجے سجائے'

خوبصورت بیڈ روم تک پہنچی جو غالباً اسی لئے آراستہ ہوا تھا۔ جس کی ایک چیز بے مثل اور قیمتی تھی۔ اس کے دلکش حسین سراپے سے شرماتی ہوئی اس کی منتظر تھی۔ چاروں اطراف کا جائزہ لے کر اس نے پیچھے کھڑے باوردی ہاتھ باندھے ملازم سے پوچھا۔

"صاحب کو ہمارے آنے کا علم ہو چکا یا نہیں؟"

"جی وہ منتظر ہیں آپ کے۔ تیار ہو کر ان سے مل لیجئے۔"

"اچھا وہ میرا بیگ۔" اس نے بے خیالی میں کہا۔

"ضرورت کی تمام اشیاء یہاں موجود ہیں پھر بھی کچھ کمی ہو تو حکم کر دیجئے گا۔" ملازم نے گویا بیگ کو نظر انداز کر دیا اور وہ خفیف سی گردن ہلا کر رہ گئی۔ یہ بھول گئی تھی کہ وہ ماضی کی ہر چیز اس محل کے باہر چھوڑ آئی ہے۔ پھر بھلا پرانے بیگ اور کپڑوں کی کیا اہمیت۔

رات آٹھ بجے تو اس کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہونے والی تھی۔ وہ صدف سے مسز مرزا عظمت بننے والی تھی۔ وارڈ روب کا دروازہ کھولا تو نظر بے شمار قیمتی لباسوں پر پھسل کر لوٹ آئی۔ ایک کسک اٹھی اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ بالوں میں انگلیاں پھنسائے کرسی پر بیٹھ گئی۔ کمرے کی ہر چیز کو دیکھتی اور آنکھیں بند کر لیتی۔ یہ ہونا تھا' اس کا تو تصور بھی نہیں کیا تھا۔

پلکیں بند کر لینے سے' پلکوں کے اس پار گزری زندگی فراموش تو نہیں کی جا سکتی تھی' ابھی کل ہی کی تو بات تھی جب اس نے ٹیڑھی کبڑی کڑیوں کی چھت تلے آنکھیں کھولی تھیں۔ ایک چھوٹے معمولی کلرک کے گھر میں جیب کی تنگی کے باوجود اس کی ننھی مسکراہٹ کیلئے مضطرب اور بے چین ابا میاں اور اماں اپنی ہر جائز و ناجائز خواہش قربان کرنے لگے۔ مگر نئے قدموں کی چاپ بڑھنے کے ساتھ ساتھ جیب کا بوجھ بھی بڑھتا گیا۔ ایسے میں روما اور پھر احمد کی آمد ابا میاں کے مسائل میں مزید اضافہ کر گئے ان کی کمر عمر سے پہلے جھک گئی۔ چھوٹی عمر میں ہی وہ سوکھے مریل کھانسی کے بیمار نظر آنے لگے ان کو دیکھ کر کڑھنے والی اماں سوائے صبر اور لمبی آہوں کے کر بھی کیا سکتی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ چڑچڑاہٹ میں ان تینوں کی پٹائی کر ڈالتیں۔ مگر یہ ان کے مسائل کا حل تو نہیں تھا ----ان کے مسائل کا حل پیسے تھے' جو کہ کلرک مہیا نہیں کر پا رہا تھا۔

"بڑھتی ہوئی مہنگائی میں' بڑھتی ہوئی ضرورتوں میں سسک سسک کر زندگی گزر رہی تھی۔ صدف نے میٹرک کر لیا' روما نے مڈل' احمد نے پرائمری سکول چھوڑا تو ابا میاں کی فکر مزید بڑھ

گئی۔ صدف کا کالج میں داخلہ اہم مسئلہ تھا۔ جب کہ صدف کی ایک تکرار تھی کہ وہ کالج میں داخلہ ضرور لے گی۔ کیونکہ وہ زین سے پیچھے نہیں رہنا چاہتی تھی۔ بچپن سے اب تک زین کے برابر قدم سے قدم ملا کر چلی تھی۔ ایک ہی گلی میں چند گھر کے فاصلے پر زین اس کی تمام تر توجہ کا مرکز تھا۔ خالہ زاد تھا۔ اس مسئلے کے حل کے لئے وہی کام آسکتا تھا۔

وہ چپل پاؤں میں ڈال کر اسی کے پاس جا پہنچی۔ وہ پلنگ پر پڑا کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ وہ آندھی طوفان کی طرح داخل ہوئی اور کتاب جھپٹ کر دور پھینک دی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے صدف؟"

"جو مرضی سمجھ لو' میں سخت غصے میں ہوں۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو میں کیا کروں؟" وہ لاپرواہی سے کتاب اٹھا کر پھر مصروف ہو گیا۔

"زین' زین' پہلے میری بات سن لو۔" وہ چلائی۔

"آہستہ' بکو کیا بکواس کرنی ہے۔" اس نے چڑایا۔

"میں بکتی ہوں۔" وہ روہانسی سی ہو گئی۔

"اف توبہ ایک تو ہر وقت کا ساون بھادوں' میں عاجز آ گیا ہوں تم سے۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔

"کیا' کیا' مجھ سے عاجز ہو اور وہ کیا ہے؟" وہ زار و قطار رونے لگی۔

"بابا' چپ کرو' وہ کیا؟" وہ پریشان ہو گیا۔

"جو تم مجھے کہتے ہو۔" وہ روتے روتے بولی۔

"کیا کہتا ہوں۔" وہ انجان بن گیا۔

"یہی کہ صدف زین کی زندگی ہے۔" اس نے اس معصومیت سے کہا کہ وہ کھل کھلا کے ہنس دیا۔

"اچھا' اچھا' یہ ہاں یہ تو میں اب بھی کہتا ہوں۔" ایک دم ہی بے شمار جگنو اس کے آنکھوں میں جھلملا اٹھے۔ تو وہ لجا کر مسکرا دی۔

"اچھا اب میری بات سنو۔"

"ہاں سناؤ۔" وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"مجھے کالج میں ایڈمشن لینا ہے اور ابا میاں کے پاس----" وہ پھر رو دی۔

"میں سمجھ گیا' داخلہ مل جائے گا۔ مابدولت دلائیں گے۔" وہ سینہ ٹھونک کر بولا تو وہ خوشی میں چھلاوے کی مانند دوڑتی ہوئی گھر آ گئی۔

"پھر واقعی زین نے اسے کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ وہ بے انتہا خوش تھی۔ زین کے پاس ایک عدد پرانی سی موٹر سائیکل تھی۔ جس پر پہلے وہ خود کالج جاتا تھا اب اسے بھی ساتھ لے جاتا اور لے آتا۔ آنے جانے کا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا مگر دیگر مسائل اپنی جگہ منہ کھولے ہوئے تھے۔ اماں کی لٹھے کی شلوار' ململ کا دوپٹہ کتنے دن چلتا آخر کو جواب دے گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اماں سے کہا تو وہ غضب ناک انداز میں چلا اٹھیں۔

"کم بخت فرمائش کرتے شرم نہیں آتی' باپ کے پاس دوائی کیلئے پیسے نہیں اور تجھے کپڑوں کی پڑی ہے۔" وہ سہم سی گئی۔

"اماں لیکن میرے پاس کپڑے بھی تو نہیں ہیں۔"

"پھر مت جا' اب میں چوری کرنے سے تو رہی' شاہی خاندان میں پیدا ہوتیں' نصیب تو کالے ہیں چلی ہیں لوگوں کی برابری کرنے۔" اماں تو جیسے ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔ وہ ڈبڈباتی آنکھوں سے اٹھ کر صحن میں بچھے پلنگ پر لیٹ گئی۔ اماں کے لفظ دل میں برچھیوں کی طرح پیوست تھے۔ واقعی ہم سیاہ بخت ہیں' سب کہتے ہیں کہ میں بہت خوبصورت ہوں' مگر نصیب تو کالے سیاہ ہیں۔ ایک دم ہی اسے ڈھیر سارا رونا آ گیا۔

"اماں بھی ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ ابا میاں رات بھر کھانستے مگر مہنگی دوائی خریدنے سے قاصر تھے۔ گھر کا چولہا مشکل سے جلتا تھا۔ بھلا دوسری ضرورتیں کیسے پوری کرتے۔ روما اور احمد کے پاس بھی ایک ایک یونیفارم تھا وہ بھی گھسا پٹا۔ اسے خود سے نفرت سی ہونے لگی۔ "کیا زندگی ہے شرمندگی ہی شرمندگی۔"

"ٹک' ٹک۔" دروازے کے دستک نے ماضی سے اس کا رشتہ کچھ دیر کو توڑ دیا۔ اس نے بھیگی پلکیں صاف کیں اور آہستہ سے کہا۔

"آ جاؤ۔"

"بیگم صاحبہ! صاحب کہہ رہے ہیں کہ تیاری مکمل ہے تو بتائیں۔" ملازم نے پوچھا۔ تو اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے سات ہو چکے تھے۔ صرف آدھ گھنٹہ ہی تو باقی تھا' ابھی تیاری سے لے کر ہوٹل تک پہنچنا تھا۔ جہاں شہر کے امراء اور رئیس مرزا عظمت بیگ کی شادی میں شرکت کے لئے جمع ہو رہے تھے' بھاری بھرکم تحائف کے ہمراہ۔ ہنہ کتنی اہمیت ہے پیسے کی۔ اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"میری فیملی کوٹھی منتقل ہو گئی۔"

جی بیگم صاحبہ"۔ ملازم نے جواب دیا۔

"وہاں کسی چیز کی----؟"

"کوئی کمی نہیں' گاڑی اور ڈرائیور بھی کچھ دیر پہلے جا چکا ہے۔" ملازم نے اس کی بات سمجھ کر جواب دیا۔

"او کے میں تیار ہوتی ہوں۔"

"شہر کے سب سے بہترین بیوٹی پارلر سے بیوٹیشن آ چکے ہیں۔"

"میں غسل کرنے کے بعد بلاتی ہوں۔" اس نے کہا۔ ملازم کے جاتے ہی وہ باتھ روم میں گھس گئی۔

اٹالین طرز کے باتھ روم میں گھستے ہی اسے اپنے گھر کا غسل خانہ یاد آ گیا۔ اونچی نیچی اینٹوں کا فرش' ٹین کا دروازہ' غلیظ سی لوہے کی بالٹی اور ہینڈ پمپ اور اس کی جگہ یہ وسیع و عریض دودھیا سنگ مرمر کا غسل خانہ بیش قیمت دلفریب آرائش و زیبائش سے مزین خوبصورت قد آدم شیشے کے سامنے اس نے اپنا جائزہ لیا تو پہلی بار یہ یقین آیا کہ وہ واقعی بے حد دلکش سراپے کی مالک ہے' حسن و دلکشی کی اہمیت بھی شاید پیسے میں ہی پتہ چلتی ہے ورنہ غربت کی اندھی چکی میں حسن و جوانی پس کر ختم ہو جاتی ہے۔

اس نے بہت اطمینان سے غسل کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ برسوں کا تھکا دماغ ایک دم تروتازہ ہو گیا۔ بھیگے بدن کی لطیف سی مہک پہلی بار اس نے محسوس کی تھی۔ جوان متحرک جذبوں نے گدگدایا تو اس وقت زین چھم سے اس کے مدمقابل آ گیا۔ وہ شیشے میں اس کا وجیہ سراپا دیکھنے

لگی۔ یاقوتی لب مسکرائے اور پھر ذہن کے خلل پر افسردگی سے بند ہو گئے۔ سب کچھ پا کر ایک زین ہی کو تو کھو دیا تھا۔ جسم کی آرائش لے کر روح کی طمانیت کھو دی تھی۔

یہ حسن و دلکشی تو خود اس کے لئے بے معنی ہو چکی تھی۔ بس ایک بہروپ تھا جو بھر لیا تھا۔

اس کے اداس اور متفکر چہرے کو بیوٹیشن نے میک اپ کی دبیز تہوں میں چھپا دیا۔ اس کے کملائے کملائے روپ کو زیورات کی چمک دمک نے دو آتشہ بنا دیا۔ پھول سے نازک تن کو بے حد قیمتی اور خوبصورت لباس نے قیامت خیز کر دیا۔ وہ تو آسمان سے اتری کوئی ماورائی مخلوق ہی نظر آ رہی تھی۔ رنگ و روپ کا سیلاب تھا جو اس انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا۔ بانک پن ہی بانک پن تھا۔ جتنی اس کی تعریف لوگوں کی زبان پر تھی۔ اتنا ہی اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ مہمانوں کے درمیان اس کا سجیلا روپ وجہ حیرت بنا ہوا تھا۔

مرزا عظمت بیگ کی قسمت پر سب کو رشک آ رہا تھا۔ وہ شیروانی میں ملبوس فخریہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے تو تصور میں زین اسے گدگدانے لگتا' سب مہمان آ چکے تھے۔ صرف ابا میاں' اماں وغیرہ کا انتظار تھا۔ جیسے ہی وہ پہنچے تو ان کے بجھے بجھے چہروں پر اسے ایک ہی سوال نظر آیا۔ مگر وہ خاموش ہی رہی۔ ابا میاں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اماں کی پلکیں بھیگ گئیں۔ روما اور احمد بھی سہمے سہمے سے اس کے قریب آ گئے۔ روما تو سسک اٹھی۔

"پلیز صدف باجی' ایک مرتبہ سوچیں۔" روما کی آواز اس نے وہیں دبا دی اور آہستہ سے بولی۔

"روما! تمہارا مستقبل' ابا میاں کی صحت اسی میں ہے' اب ایسی باتیں مت کرو۔" اور روما کی آواز علق میں پھنس سی گئی۔ پھر نکاح بھی ہو گیا۔ کھانا بھی شروع ہو گیا۔ وہ مسز مرزا عظمت بیگ بھی بن گئی۔ اس نے زندگی میں دوڑتی بھاگتی مادہ پرست تہذیب میں شمولیت بھی اختیار کر لی۔ مگر دل اندر سے بری طرح تڑپ رہا تھا۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ طبیعت کی گھٹن سے گھبرا کر سب مہمانوں سے الگ تھلگ بیٹھتے ہی اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

دل کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بھاری بھرکم لباس نوچ پھینکے اور ہلکے پھلکے بوسیدہ سے کپڑوں میں دوڑ کر جائے اور زین کی بانہوں میں چھپ جائے جیسا کہ وہ ہمیشہ ہر پریشانی میں' ہر فکر میں اور ہر اداسی میں زین پر ہی اعتبار کرتی تھی۔ اسی سے دکھ سکھ کہتی تھی۔

اسے شدت سے وہ شام یاد آ گئی جب گھر میں وہ بالکل اکیلی تھی۔ ابا میاں' اماں' روما' احمد سب کسی شادی میں گئے تھے۔ اس کے امتحان شروع ہو گئے تھے' تیاری کی وجہ سے وہ گھر پر تھی۔ مگر فطرتاً "بزدل سی تھی' جوں جوں رات کا اندھیرا بڑھ رہا تھا اسے ڈر لگ رہا تھا۔ اماں' زین سے کہہ گئی تھیں کہ وہ اس کے پاس آ جائے مگر اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ سہمی سہمی سی پورے گھر میں پھر رہی تھی۔ چہرہ زرد تھا اور دل دھڑک رہا تھا۔ ایسے میں زین آ گیا تو وہ غصے سے منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

"ہیلو مائی کزن۔" وہ اس کی چوٹی کھینچتے ہوئے بولا۔ وہ چپ رہی۔

"اے' کیا بات ہے؟"

"مت بھولو' یہ گھر آنے کا وقت ہے۔"

"ہیں' ہیں' واہ رعب تو ایسے ڈال رہی ہو جیسے میری گھر والی ہو۔" وہ شرارت سے بولا۔

"ایسا ہی سمجھ لو"۔ وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"ارے جاؤ' تم ایسی گھر والی' اللہ توبہ مفت میں بھی نہ بناؤں۔" زین نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ زین گھبرا گیا اس کے رونے سے وہ پریشان ہو جاتا تھا۔

"اے' اے چپ' اچھا مذاق ختم۔"

"زین! مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔" وہ معصومیت سے بولی' اس کی سیاہ آنکھوں میں سچ اور معصومیت تھی زین کھو سا گیا۔

"میرے دل میں چھپ جاؤ' کوئی ڈر نہیں رہے گا۔" وہ مخمور سا ہو گیا۔

"سچ"۔ وہ جھوم اٹھی۔

"بالکل سچ' تمہارے لئے جہان میں جتنے دکھ' خوف' ڈر ہیں وہ میرے لئے چھوڑ کر میرے دل کی دنیا میں کھو جاؤ۔ کوئی گرم ہوا تمہیں چھو کر نہیں گزرے گی۔" وہ بڑے جذب کے عالم میں بولا۔

"تمہیں کیا معلوم میرے مقدر میں کیا لکھا ہے؟"

"بس خدا کرے کوئی دکھ نہ ہو۔" وہ خلوص سے اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔ اس کے گرم مضبوط ہاتھ میں اس کا مرمریں ہاتھ محفوظ تھا۔ وہ سرشار تھی۔ مگر جب تصور کی دنیا سے باہر آئی تو

چاروں طرف گرم ہوائیں تھیں' خوف تھا۔ گھبراہٹ تھی۔ مرزا عظمت بیگ کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا۔ وہ غور سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ شرمندہ سی بوکھلا کر کھڑی ہوگئی۔

"سب مہمان رخصت ہو چکے ہیں۔ چلئے گھر چلیں۔" مرزا صاحب نے کہا۔

"جی' جی' چلئے۔" وہ قدم سے قدم ملا کر چل دی۔

"آپ کے گھر والے ابھی گئے ہیں۔ آپ کے والد صاحب کی طبیعت کچھ اچھی نہیں تھی۔" مرزا صاحب نے بتایا۔

"آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا' کیا بہت خراب ہے؟" وہ یک دم پریشان ہوگئی۔

"نہیں' کچھ زیادہ نہیں تاہم میں نے اپنے فیملی ڈاکٹر احسان باری کو فون کر دیا ہے وہ روز چیک کر لیا کرے گا۔" مرزا صاحب نے تفصیل بیان کی۔ وہ خاموش ہوگئی۔ ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ان کے بیٹھتے ہی گاڑی سٹارٹ کر دی۔

سارے راستے اس کا ذہن ابا میاں کی بیماری میں الجھا رہا گھر پہنچ کر مرزا صاحب نے دونوں ہاتھوں سے اس کو شانوں سے پکڑ کر بغور جائزہ لیا اور متفکر سے بولے۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"جی' بالکل۔" وہ فوراً نظریں چرا گئی۔ انہوں نے بیڈ پر بٹھا دیا اور ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے ڈائمنڈ کا سیٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ سپاٹ سا چہرہ لئے سیٹ کو گھورتی رہی پھر آہستہ سے مرزا صاحب کی طرف دیکھتے ہی پلکیں موند لیں۔ دل و دماغ مرزا صاحب کے مخالف ہوگئے۔ پینسٹھ سالہ مرزا صاحب اس کے روبرو تھے اور اپنی قسمت پر نازاں تھے کہ جوانی میں شادی نہ بھی کی تو کوئی غم نہیں بڑھاپے میں چودھویں کا چاند ان کے پہلو میں تھا------ وہ مسرور تھے اپنی عمر کے پس منظر کو بھول کر اور تمام باتوں کو بھول کر اس کے لئے محبت ہی محبت سے سرشار' لیکن اس کی آنکھوں میں بیچارگی سی دیکھ کر وہ کچھ ملول سے ہوگئے۔ احساس کمتری سا جاگا جسے وہ نظرانداز کر گئے۔

"صدف! میں بہت خوش ہوں تمہیں پاکر' ساری خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا ایک بار حکم کر دینا۔" مگر یہ تو خود اس نے اپنے لئے پسند کیا تھا۔ اس میں بھلا مرزا صاحب کا کیا قصور؟ وہ تو بے چارے تنہائی کے ستائے ہوئے تھے' سب کچھ تھا مگر کوئی اپنا نہیں تھا۔

ذہنی ٹینشن اور ڈپریشن سے فالج کا اٹیک ہوا تو تین چار سال بستر سے لگے رہے بیماری نے ان کی صحت کافی متاثر کی تھی۔ پیسے کی ریل پیل کے باوجود وہ شاید ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ جبکہ صدف نے خود یہ خواہش کی تھی۔ مرد ذات' پکی عمر کا تنہائی کا ستایا ہوا' بھلا خوبرو جوان لڑکی کی اس پیشکش کو کیسے رد کر سکتا تھا۔ مرزا صاحب بھی رد نہ کر سکے اور کسی اہم کنٹریکٹ کی طرح یہ سمجھوتہ طے کر لیا۔ جیسا جیسا وہ کہتی گئی وہ کرتے گئے۔

مگر اب ایسا لگتا تھا کہ وہ کہنا کچھ چاہتے ہیں ان کے چہرے پر ایک سوال ہے صدف جو کڑے صبر آزما امتحان سے گزرنے کے لئے خود کو تیار کر چکی تھی ان کو کچھ مضطرب دیکھ کر آہستہ سے بولی۔

"تو آپ کو مل گیا' شوہر ہیں میرے' فرمایئے۔"

"ایک راز حقیقت بھی ہے اور شرمندگی بھی۔ تمہیں رازداں بنانا چاہتا ہوں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر سنجیدگی سے بولے تو وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"بلا جھجک بتایئے۔"

"صدف! مانتی ہو تمہارے اور میرے درمیان کتنا فاصلہ ہے' کتنا فرق ہے؟ اتنا فرق ہے کہ ہم مٹانا بھی چاہیں تو نہیں مٹا سکتے۔ تم چڑھتا سورج ہو اور میں ڈھلتی دھوپ تقسیم انعامات کی تقریب میں تمہیں گولڈ میڈل پہناتے ہوئے میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ نازک سی لڑکی دوسری ہی ملاقات میں نہایت بے باکی سے شادی کی بات کرے گی۔ یقین کرو اس رات میں سو نہیں سکا تھا۔ اپنی قوت سماعت پر مجھے شبہ سا ہونے لگا تھا۔ پھر مجھے تمہارا یہ مذاق اچھا لگا۔ لیکن تیسری ملاقات جتنی اتفاقی تھی اتنی ہی دلچسپ بھی تھی۔"

"تمہاری جرات اور بے باکی نے میرے شعور و لاشعور دونوں پر قبضہ کر لیا کیونکہ میری جوانی روپیہ کمانے کے چکر میں ضائع ہوگئی تھی اور اب بڑھتی عمر کے ساتھ ایک جیون ساتھی کی خواہش بڑھتی جا رہی تھی یہی وجہ تھی کہ میں اپنی تمام کوتاہیوں اور کمیوں کے باوجود راضی ہو گیا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری ضرورت میں نہیں' میرا روپیہ پیسہ تھا تم معاشی بوجھ سے اکتا کر ایک پینسٹھ سالہ آدمی سے شادی کے لئے اپنے ساتھ بھی ظالم ہوگئی تھیں۔ مگر میں نے جو کچھ کیا وہ کچھ زیادہ مخلصانہ نہیں۔ میری بھی خود غرضی شامل ہے۔ میں جانتا تھا کہ میں فالج کے بعد مکمل طور پر

میڈیکلی ان فٹ ہو چکا ہوں۔ مجھے کوئی حق نہیں کہ ایک جوان خوبرو لڑکی کے ارمانوں کو پامال کروں؟ مگر ہم دونوں اپنی اپنی غرض کے ہاتھوں مجبور ہو کے پامال ایک اگیری منٹ کر بیٹھے ہیں' میری غرض بہت پست ہے مجھے تمہارے جذبات سے نہیں کھیلنا چاہئے تھا۔" مرزا صاحب جتنا شرمندگی سے بول رہے تھے 'صدف کے اندر اتنا ہی احساس سکون بڑھتا جا رہا تھا۔

"مرزا صاحب! غرض کی دونوں شکلیں میرے سامنے تھیں اور میں نے جانتے بوجھتے اپنے جذبات کی قربانی دی ہے۔ آپ کا احساس شرمندگی نہیں ہونا چاہئے' کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔" وہ نہایت سنجیدگی سے بولی تو مرزا صاحب خاموشی سے چھت گھورنے لگے۔

"کیا ہمارے درمیان فصیل حائل رہے گی؟" مرزا صاحب نے پوچھا۔

"نہیں' ہم جسمانی رشتے کے بغیر بھی کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔ وہ آسانی سے بولی۔

"وہ کیسے؟" مرزا صاحب کو کچھ اندیشہ سا تھا۔

"ایک چھت کے نیچے دو جدا جدا سوچ رکھنے والے جس طرح رہتے ہیں۔ بالکل ویسے۔" صدف نے آہستہ آہستہ جیولری اتارنا شروع کر دی۔

"تاہم میں دنیا کا خوش قسمت انسان سمجھتا ہوں خود کو۔" مرزا صاحب سرشاری سے بولے۔

"پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا اور ڈریس تبدیل کرنے کی غرض سے باتھ روم میں گھس گئی۔

"نائٹی پہن کر اس نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ بالوں میں برش کرتے ہوئے وہ لان میں کھلنے والی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ مرزا صاحب بھی کپڑے تبدیل کر کے کمرے میں واپس آ گئے۔

اس کی سوچیں منتشر تھیں۔ خیالات پھر ماضی کی ان گلیوں میں بھٹک رہے تھے۔ مرزا صاحب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی۔

"آرام کر لو' کافی تھکی تھکی لگ رہی ہو۔" وہ خاموشی سے بال سمیٹ کر اپنے بیڈ کے ایک طرف لیٹ گئی۔ کمرے میں دو بیڈ بچھے ہوئے تھے۔ مرزا صاحب نے لائٹ آف کر دی۔

اب کمرے میں دو بکھرے ہوئے انسان ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اپنی سوچوں میں گھرے ہوئے تھے۔

"دونوں کچھ پرسکون بھی اور بہت زیادہ متفکر بھی۔ لیکن صدف کی فکر کرب انگیز' اور نہایت کٹھن تھی۔ آج اس نے سہاگ کا جوڑا پہنا تھا۔ نکاح نامے پر دستخط کے لئے یا پھر اگیری منٹ کے لئے۔ تاہم جس سہاگ کے جوڑے میں طمانیت اور سرشاری کے احساس کے علاوہ روح جکڑ بند ہو جائے۔ ذہن مضمحل ہو' احساسات مضطرب ہو جائیں وہ سہاگ کا جوڑا کیسے ہو سکتا ہے۔ سہاگ کے جوڑے میں دلہن کے ارمان خوشبوؤں کی طرح مہک رہے ہوتے ہیں۔ اس کا تو کوئی ارمان ہی نہ تھا۔ اس نے تو دکھاوے کے لئے بیش قیمت عروسی جوڑا زیب تن کیا تھا------ وہ اس احساس کو تو نہ پا سکی تھی جو ہر لڑکی دلہن بن کر پاتی ہے۔ محسوس کرتی ہے۔ کتنے تاب ناک خواب دیکھے تھے اس نے زین کے ساتھ' کیسے کیسے پروگرام ترتیب دیئے تھے' جب زین کی شرارت سے شادی کا ذکر چھیڑتا تو وہ بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو جاتی۔

کتنی دلفریب تاروں بھری رات تھی۔ چاند رات' اگلی صبح عید تھی۔ اماں نے اپنی حیثیت کے مطابق ان تینوں کے کپڑے سیئے تھے۔ مگر وہ بجھی بجھی سی تھی۔ کیونکہ ابا میاں کی طبیعت زیادہ خراب تھی' دوا کے پیسے نہیں تھے۔ لہٰذا نئے کپڑوں کی خوشی افسوس بن گئی تھی۔ ایسے میں روما مہندی کا پیالہ لئے بیٹھی تھی جبکہ وہ مسلسل سوچوں میں گھری صحن میں ٹہل رہی تھی۔ ایسے میں زین آ گیا وہ بہت خوش تھا' چاند رات میں محبت کرنے والوں کے دل کچھ زیادہ ہی دھڑکتے ہیں وہ صدف کے لئے سرخ اور سنہری کام والا سوٹ لایا تھا۔

"ہیلو صدف' چاند رات مبارک ہو۔" اس نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔

"یہ دیکھو چاند رات کا تحفہ۔" زین نے کپڑے پیکٹ سے نکالے اور دوپٹہ اس کے سر پر پھیلا دیا۔ وہ بری طرح لجا سی گئی۔

"یہ کیا سرخ رنگ' مجھے شرم آتی ہے۔"

"واہ بھئی ایک روز شرمانا تو ہے لیکن صرف میرے لئے۔" اس نے چھیڑا۔

"تمہارے لئے کیوں؟" اس نے بن کر پوچھا۔

’’اس لئے کہ خدا نے تمہیں صرف میرے لئے بنایا ہے ورنہ تمہاری ضرورت ہی کیا تھی۔ ‘‘وہ اسے چڑاتا ہوا بولا۔

’’بہت خوب تمہارے ایسے بھوت کے لئے یہ سنگ مرمر کی مورتی بنائی گئی ہے‘ منہ دھو رکھو۔‘‘ وہ اکڑ کر بولی۔

’’شکر ادا کیا کرو کہیں کسی بھوت کے پلے نہ بندھ جاؤ۔‘‘ وہ جواباً بولا تو وہ کھل کھلا کے ہنس دی۔

’’تو میں زہر کھالوں گی۔‘‘

’’وعدہ۔‘‘

’’صدف زین کے بنا کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔‘‘ وہ دھیرے سے بولی اور زین نے نظروں نظروں میں وعدے کی تصدیق کر کے اسے پیار بھری مسکان دی۔

’’لیکن زین‘ صدف زہر نہ کھا سکی۔ زندہ ہے تم سے جدا ہو کر۔ مگر قسم لے لو ایک پل کا سکھ نہیں‘ جتنی بے چین ہوں شاید ہی کوئی ہوا ہو۔‘‘ کئی آنسو پلکوں کی اوٹ سے بہہ نکلے اور سسکیوں کو حلق میں ہی گھونٹ ڈالا۔ رات بھر کربناک لمحوں میں جاگتی رہی‘ کروٹیں بدلتی رہی۔

☆ ☆ ☆ ☆

صبح وہ بستر سے اٹھ نہ سکی۔ ہلکا سا ٹمپریچر محسوس ہو رہا تھا پورے جسم میں درد تھا۔ مرزا صاحب نے اٹھانا چاہا مگر اس کی سرخ آنکھوں اور زرد چہرے پر رقم رات کی بے سکونی انہیں خاصا افسردہ کر گئی۔ فوری طور پر ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے انجکشن دیا۔ دوا دی اور ہلکا سا بخار کہہ کر بے فکر کر دیا۔ مگر مرزا صاحب اس کے بالکل قریب بیٹھے رہے۔ تمام کام معطل ہو گئے۔ بار بار وہ اس کی کلائی تھام کر دیکھتے۔ دوا دیتے آدھا گھنٹہ گزرا تو انہیں کچھ بخار اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اطمینان کا سانس لیا۔ دودھ اور اوولٹین منگوایا۔

’’صدف ----- صدف پلیز‘ اٹھو تھوڑا سا دودھ پی لو۔‘‘ مرزا صاحب کی آواز میں بے انتہا نرمی اور ٹھنڈک سی تھی۔ اس نے موندی موندی آنکھوں سے دیکھا اور پھر دودھ پینے کے لئے رضامند سی ہو گئی۔

مرزا صاحب نے نہایت احتیاط سے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور اپنے ہاتھ سے دودھ پلایا۔ ابھی وہ فارغ ہی ہوئے تھے کہ صدف کی اماں‘ روما اور احمد آ گئے۔ وہ اسے لینے آئے تھے گو اس کی شادی بڑے عجیب حالات میں ہوئی تھی اس سے بھی عجیب و غریب رسمیں ادا ہوئی تھیں۔ بہرحال مہکہ اگر ہو تو لڑکی کو لینے والے آتے ہی ہیں۔ اس کو اس طرح بستر پر دیکھ کر اماں اور روما نے متفکر ہو کر پوچھا۔

’’کیا ہوا‘ خیریت؟‘‘

’’جی بس صدف کو ہلکا سا بخار ہو گیا تھا اب بہتر ہے۔‘‘ مرزا صاحب نے جلدی سے بتایا۔

’’باجی! آپ ٹھیک تو ہیں؟‘‘ روما کی پھر بھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بہن کے سرہانے بیٹھی گئی۔

’’میں ٹھیک ہوں بس تھکاوٹ سی ہو گئی تھی۔‘‘ صدف نے سرسری طور پر ٹالنا چاہا۔ مگر اماں جہاندیدہ خاتون تھیں۔ انہیں بیٹی کے چہرے پر محبت کی اجڑی ہوئی داستان واضح نظر آ رہی تھی۔ انہیں تو اس کے رات بھر تڑپنے کا بھی اندازہ ہو گیا تھا۔ جونہی مرزا صاحب کمرے سے باہر گئے وہ مغموم سی بیٹی سے گلہ کر بیٹھیں۔

’’صدف! تو نے اچھا نہیں کیا۔ تو ہمیشہ کے لئے خود کو برباد کر لیا اور زین بھی تباہ ہو گیا‘‘

’’کیا کہہ رہی ہو اماں۔ دنیا چلتی رہتی ہے وقت سب کچھ فراموش کر دیتا ہے۔‘‘

کہاں چلتا ہے سب کچھ‘ زین بھائی کو تیز بخار نے آ لیا‘ آپ کو بھی بخار ہے اور ---- ؟‘‘

’’روما! زبان بند کرو‘ اب ان باتوں سے کیا حاصل؟ تم اب سب کچھ بھول جاؤ میں اپنا وجود پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ اب اس محل نما گھر میں مسز مرزا عظمت بیگ رہتی ہے۔‘‘ وہ بہت آہستہ سے بولی۔

’’آپ بھول جائیں‘ ہم سے ایسا نہیں ہو سکتا‘ ہم زین بھائی کی خیریت پوچھنے ابھی جائیں گے۔ روما تڑخ کر بولی تو وہ کچھ نہ کہہ سکی بس اداس سی اماں کو دیکھتی رہی۔

’’کچھ ہی دیر میں بے شمار کھانے پینے کی اشیاء سے سجی ٹرالی آ گئی۔

’’بیگم صاحبہ! کسی چیز کی طلب ہو تو بتائیں۔ ’’ملازم نے صدف سے پوچھا۔

’’نہیں‘ صاحب کہاں ہیں؟‘‘

"جی مہمان آئے ہیں ڈرائنگ روم میں ہیں۔"

"ان سے پوچھیں روما اور احمد کے ایڈمشن کا کیا ہوا؟" صدف کے کہنے پر ملازم گیا اور چند لمحوں بعد واپس آ گیا۔

"صاحب کہہ رہے ہیں کہ ایڈمیشن ہو چکا ہے' مکمل تفصیل مینیجر صاحب' روما بی بی کو گھر پہنچا دیں گے۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"گل نواز۔"

"ٹھیک ہے جاؤ' صاحب سے کہو کہ باہر جانے سے پہلے میرے پاس آئیں۔" صدف نے کہا اور اماں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ابا میاں کی طبیعت کیسی ہے۔"

کچھ بہتر ہے۔ سوئے ہوئے تھے۔" اماں نے بتایا۔

"ان کا پورا خیال رکھیں' کسی چیز کی کمی نہ رہے۔" اس نے تاکید کی۔

"لیکن وہ افسردہ ہیں۔" روما نے کہا۔

ٹھیک ہو جائیں گے' خود ہی' سوچو یہ لباس' رہن سہن' تمہاری تعلیم و تربیت کیسے ہو پاتی؟"

"سب چلتا ہے باجی آپ تو۔"

"روما! یہ حقیقت ہے کہ پیسے کے بغیر سب کچھ بیکار ہے۔" صدف نے کہا۔

"لیکن پیسے کے لئے یہ غلط راستہ تو ٹھیک نہیں۔"

"یہ غلط راستہ کیسے ہے؟" صدف چونکی۔"

"اپنے دل کا قرار تباہ کرنا' جسے دل نہ چاہے اسے اپنا بنانا اور اپنے پیاروں کو عمر بھر کا عذاب دینا۔" روما سسک اٹھی۔

"تم نہیں سمجھتیں میں بچپن سے زندگی کے تلخ عذاب سہتے سہتے تنگ آ چکی تھی ----- اب اگر میں بے قرار بھی ہوں تو کوئی غم نہیں تم لوگ تو زندگی کا بھرپور لطف اٹھا سکتے ہو۔"

"یہ غلط ہے' ہم اس زندگی میں گزارا کر سکتے تھے آپ کی یہ زندگی کٹھن ہو جائے گی' سب تنگیاں برداشت ہو جاتی ہیں' محبت کی بربادی جینے نہیں دیتی۔ آپ نے گھاٹے کا سودا کیا ہے' آپ کا دکھ ہم سب پر بھاری ہے' ایک روز جان جائیں گی۔"

روما بولتی چلی گئی۔ وہ آخر میں بے بسی سے مسکرا دی۔

"میری فکر نہ کرو۔ شاباش اپنا خیال رکھا کرو۔"

کچھ ہی دیر میں مرزا صاحب مہمانوں کو رخصت کر کے آ گئے اور سوالیہ نظروں سے صدف کی طرف دیکھا۔

"میں اماں کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

"لیکن بخار -------؟"

"فکر کی کوئی بات نہیں وہاں بھی وہی ڈاکٹر ہے جو یہاں تھا"۔ وہ اٹھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"تمہاری فکر کرنا تو ضروری ہے۔"

"آپ کی مرضی' تاہم آپ میری فکر سے آزاد ہیں"۔ کپڑے تبدیل کرنے کی غرض سے باتھ روم میں چلی گئی اور مرزا صاحب بغیر کچھ کہے باہر نکل گئے۔

"ہلکا سا لباس اور نہ ہونے کے برابر میک اپ کر کے وہ تیار تھی۔

"آپ بھی زین بھائی سے ملنے چل رہی ہیں نا۔" روما نے پوچھا تو وہ چونک کے رہ گئی۔

"نہ' نہیں' میں نہیں جا سکتی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ دل پر جبر کر کے بولی۔ یہ صاف جھوٹ تھا۔ حالانکہ دل کی کیفیت جو تھی وہ بیان سے باہر تھی کاش وہ تتلی بن کر اڑ جاتی اور زین کے پاس پہنچ جاتی۔ مگر ----- یہ راستہ تو وہ بند کر چکی تھی۔ اب وہ صرف صدف تو نہیں تھی۔ صدف مرزا عظمت بیگ تھی جو سمجھوتے کی چادر اوڑھ کر نئی دنیا میں آ چکی تھی۔

"یقین نہیں آتا کہ آپ ہی صدف ہیں۔" روما جل کر بولی۔

"تم یقین مت کرو۔" وہ ایک دم تلخ ہو گئی۔

"ٹھیک ہے ہم لوگ ان سے ملنے جا رہے ہیں' چلیں اماں۔" روما سوچ بچار میں گھری اماں سے مخاطب ہوئی۔

"آپ جائیں' میں ابا میاں کے پاس جارہی ہوں' جلدی آ جانا۔" اس نے کہا اور پرس اٹھا کر ان کے ہمراہ باہر نکل آئی۔

انہیں چھوڑ کر وہ ابا میاں کے پاس تو آ گئی مگر دل و دماغ گویا کہیں اور تھا۔ ابا میاں ابھی سوئے ہوئے تھے وہ بغیر جگائے روما کے کمرے میں آ گئی۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر زین کی مسکراتی تصویر اس کے دل کے اندر ہلچل مچا گئی۔ وہ ہر بات سے بے نیاز مسکرا رہا تھا۔ وہ آہستہ سے چل کر تصویر کے قریب پہنچی اور دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پھر خود بخود ٹپ ٹپ کئی آنسو زین کی مسکراہٹ پر قربان ہو گئے۔ جدائی کا تصور جان لیوا کیوں ہوتا جارہا تھا۔ جس عزم اور صبر کی سل اس نے سینے پر رکھی تھی وہ اس کو بری طرح پیس کیوں رہی تھی۔ دل و دماغ پر زین کا اتنا مضبوط قبضہ تھا کہ وہ خود کو آزاد کرانے میں بے بس ہوتی جارہی تھی' ابھی تو بہت کم وقت گزرا تھا۔ ایک طویل عمر باقی تھی۔ محبت پر ایثار' ہمیشہ کیلئے تسلط قائم کر چکا تھا۔ مگر پھر یہ بے چینی و اضطراب کیسا تھا؟ زین کو بخار تھا اور وہ اسے دیکھنے نہیں جا سکتی تھی۔ محض اس وجہ سے کہ وہ بھرم نہ ٹوٹ جائے جس کی پاس داری عمر بھر کرنی ہے۔ دھڑکتے دل سے اس نے تصویر رکھ دی اور منہ دھونے کی غرض سے باتھ روم میں داخل ہو گئی۔

واپسی پر روما بجھی بجھی سی تھی' احمد بھی اداس تھا اور اماں تو ویسے ہی خاموش ہو گئی تھیں۔ وہ زین کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی تھی مگر خود پوچھنے کی جرات کہاں تھی۔ اس اضطراب میں دن ڈھل گیا۔ شام ہوتے ہی مرزا صاحب اسے لینے آ گئے۔ وہ ابا میاں سے مل کر ان کے ہمراہ آ گئی۔ راستے بھر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ مرزا صاحب گاہے بگاہے اس کا جائزہ لیتے رہے۔ مگر پوچھ نہیں سکے۔

گھر پہنچ کر آہستہ سے بولے۔ "اگر مناسب سمجھو تو تیار ہو جاؤ' میرے دوست اکبر نے ڈنر کا اہتمام کیا ہے۔" ان کے لہجے میں حکم نہیں گزارش سی تھی نہایت عاجزانہ۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں گردن ہلانے لگی۔

پھر سبز اور نارنجی باڈر والی قوس قزح جیسی ساڑھی میں سراپا حسن بن کر ہم رنگ موتیوں کے سیٹ کے ساتھ عمدگی سے میک اپ کر کے وہ مرزا صاحب کے ہمراہ جونہی اکبر صاحب کے گھر پہنچی تو ہر طرف دھڑکنوں کا شور سنائی دینے لگا۔ ہر آنکھ میں رشک تھا اور ہر زبان پر داد۔ ہر جوان

دل اس کی بدمست چال پر قربان ہوتا ہوا قریب چلا آیا۔ وہ عجیب سی گھٹن کا شکار ہونے لگی جبکہ مرزا صاحب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

"مرزا صاحب! کاش ہم بھی اتنے خوش نصیب ہوتے۔" سیٹھ عنایت نے کہا تو ہینڈسم سے نوجوان چڑ گئے۔

"کیا ہم جوان خوبرو مر گئے جو بوڑھے ہی خوش نصیب ہوتے۔" اس پر ایک قہقہہ سا بلند ہوا۔ ادھیڑ عمر اشخاص شرمندہ سے ہو گئے۔ مرزا صاحب کے چہرے پر فخریہ مسکان تھی۔ جب کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ ہر چہرہ برا لگنے لگا۔ ذہن بوجھ تلے دب سا گیا' تب بغیر کھانا کھائے ہی وہ مرزا صاحب سے معذرت کروا کے گھر آ گئی۔ مرزا صاحب کچھ خاموش سے ہو گئے۔ اس کا موڈ آف تھا وہ بھلا کیا بات کرتے۔ سلیپنگ سوٹ پہن کر وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گئے۔ وہ لیٹنے کی بجائے پہلے کھڑکی میں کھڑی ہوئی۔ پھر سبک روی سے چلتی ہوئی باہر لان میں آ گئی۔

تاحد نظر چٹکی ہوئی دودھیا چاندنی تھی ہلکی ہلکی سرسراتی ہوا تھی۔ ہوا کے سنگ پھولوں کی اٹکھیلیاں تھیں۔ خوشبو شریر سے انداز میں سانسوں سے الجھ رہی تھی۔ اسے سب اچھا تو بہت لگا' لیکن جب انسان اندر سے ہی افسردہ اور غیر مطمئن ہو تو بھلا باہر کا سکون اور طمانیت کیسے محسوس کرے انسان کے اندر اور باہر کا موسم کبھی کبھار ہی ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر تو باہر اور اندر میں ضد سی ہوتی ہے۔ صدف کے ساتھ بھی تو ایسا ہی تھا' وہ باہر کی ہر خوشی پا کر بھی اس قدر مضمحل اور بجھی بجھی سی کیوں تھی؟ ظاہری خوشی نے اس کے اندر سرشاری کیوں نہیں پیدا کی تھی؟ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ اس نے غلط فیصلہ کر لیا تھا اور صرف زین کی جدائی نے اسے ٹکڑوں میں بانٹ دیا تھا۔ "کیا زین تم مجھے اس طرح اذیت دو گے؟ کیا میں تمہاری جدائی کی اذیت اس طرح سہوں گی؟ میرا فیصلہ کیا اتنا کمزور ہے؟ تمہیں دانستہ نظروں سے اوجھل کیا ہے' مگر تم تو شہ رگ سے بھی قریب آ گئے ہو؟ میں نے تمہیں بھولنے کا فن کیوں نہیں پایا؟ سب کچھ میری دسترس میں ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں' سارے جسم و جاں میں تشنگی سی کیوں ہے؟" وہ سوچوں کے جزیرے میں الجھ سی گئی۔

پھراس کا دل چاہنے لگا کہ پلک جھپکنے میں وہ زین کے پاس جائے اور اس کی امرت میں ڈوبی باتیں سن کر بے قرار روح کو سکون پہنچائے اور پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پورچ تک پہنچی اور ڈرائیور کو کوارٹر سے بلا کر زین کی گلیوں میں پہنچ گئی۔

اس کے گرم ہاتھ کو چھوا تو اس نے چونک کر ہاتھ کھینچ لیا اور مخمور سرخ آنکھوں سے دیکھا۔

"زین------- زین کیسے ہو؟" وہ کچھ سنبھل کر بولی۔

"تم اس وقت یہاں؟" اس نے تعجب سے کہا تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"زین! تم سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔" اس نے اعتراف کیا۔

"صدف نہیں، مجھ سے دور رہنا ضروری ہو گیا ہے۔" وہ چھت کو گھورتے ہوئے بولا۔

"جانتی ہوں مگر------؟"

"مگر مجھے آزمائش میں ڈالنا چاہتی ہو۔"

"آزمائش تو میری ہو رہی ہے زین، تمہارا احساس مجھے اذیت پہنچا رہا ہے۔" وہ سسک اٹھی۔

"پلیز صدف، جو جراتمندانہ قدم اٹھا چکی ہو اس پر قائم رہو۔ وفا کو بدنام مت کرو؟" زین نے اس کی بھیگی پلکوں سے نظر چراتے ہوئے ڈوبتے دل سے سہارا دیا۔

"زین! تمہارے احساس کی چکا چوند نے میری ہستی کو حصار میں لے لیا ہے۔" وہ اعتراف کر رہی تھی۔ محبت کا سچا، سچا اعتراف۔

"ایسا ہی ہوتا ہے صدف، محبت ہی تو خریدی نہیں جا سکتی، تم نے محبت کے راستے میں ببول خود اگائے ہیں، مجھے کیا بتاتی ہو؟"

"میرے خدا، میں کیا کروں؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"صدف! ابھی تو پہلی سیڑھی پر ہو اور شوریدہ سر طوفانوں کی زد میں کیوں آ گئی ہو؟"

"طنز کرنے لگے ہو، مدد تو نہیں مانگی۔" وہ چڑ سی گئی۔

"صدف، محبت پر شک مت کرو، مجھے پاس وفا ہے۔ تم صدف، نہیں مسز مرزا عظمت بیگ ہو، میں امین بننا تو پسند کروں گا لیکن خیانت کرنے والا نہیں، اور میرے پاس مدد کیلئے ہے ہی کیا؟" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"پھر مجھے بتاؤ کہ میں بے سکون کیوں ہوں؟"

"خود سے پوچھو، لیکن فائدہ کچھ نہیں اب تمہیں وقت اور حالات سے سمجھوتہ کرنا ہے، جاؤ پلیز مجھے تنہا چھوڑ دو جاؤ صدف بہت رات ہو چکی ہے جاؤ۔" وہ تھکے ہوئے انداز میں بمشکل کروٹ لے کر پلکوں میں آئی نمی چھپا سکا اور وہ بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی گاڑی تک پہنچی اور پھر اپنے بیڈ روم تک۔ جہاں مرزا صاحب کی جاگتی بند آنکھوں میں ملال تھا، ایک ہی سوال تھا کہ "کیا وہ مجرم ہیں کسی کے ارمانوں کے؟" مگر یہ پوچھتے کس سے؟ وہ تو بیڈ کے دوسرے کنارے کروٹ لئے تھے اور وہ ان سے بے خبر تھی۔

"صاحب کو بلاؤ۔" ناشتے کی میز پر اس نے ملازم سے کہا۔

"جی صاحب فیکٹری جا چکے ہیں۔" ملازم کے جواب پر وہ پرسکون سی رہی، بلکہ دلی طور پر اس نے اطمینان محسوس کیا، ان سے سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، رات بھی اگر وہ جاگ رہے ہوتے تو وہ بھلا کیا جواب دیتی؟ لیکن یہ تو سراسر اس کی کم علمی تھی ورنہ وہ تو جاگ ہی رہے تھے۔ ایک بات چائے کا سپ لیتے ہوئے اس نے شدت سے محسوس کی کہ وہ مرزا صاحب کی ذات کو شاید نظرانداز کر چکی ہے۔ "ہنہہ، تو تم نے انہیں سمجھا ہی کب تھا، وہ تو کاغذوں میں زندہ ہیں ورنہ تمہارے لئے ان کی کیا اہمیت، صدف بیگم تم بہت بڑی خود غرض ہو۔ بہت بڑی۔ ایک معصوم انسان کی تنہائی بانٹنے کی بجائے تم نے اسے اور زیادہ تنہائی ہی تو دی ہے۔ بولو کیا تم خود غرض اور سفاک نہیں؟"

"نہیں، نہیں یہ جھوٹ ہے، میری خود غرضی یہ ہے کہ میں نے جیون ہار دیا، اپنے خونی رشتوں کے لئے، میں نے مرزا عظمت صاحب سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں بے قصور ہوں۔ مگر میں کیا کروں میرا دل بس میں نہیں۔ میں کیا کروں؟" وہ ہذیانی انداز میں چیختی چلاتی ناشتہ چھوڑ کر اپنے بیڈ روم کی طرف دوڑ گئی۔ ملازم سخت پریشانی میں کھڑا رہ گیا۔

اس کے ذہنی انتشار نے اتنا کام کیا کہ شام کو وہ اچھی طرح تیار ہوئی اور لان میں چائے پر مرزا صاحب کی منتظر تھی۔ یہ تبدیلی مرزا صاحب کے لئے وقتی اطمینان تو تھی مگر مستقل نہیں، کیونکہ وہ اپنا قصور بھی جانتے تھے اور صدف کی مجبوری بھی، انہیں یہ ملال تھا کہ جلدی میں انجانے میں وہ ایک بہت بڑی غلطی کر بیٹھے ہیں، جس سے بیوی کی توجہ اور محبت کی بجائے، ایک

اذیت، خاموشی اور گھٹن ہی ملی ہے۔ اس سے تو وہ پہلے بہتر تھے۔ تنہائی کی برفیلی فضائیں۔ حسب ضرورت تازہ ہوا سانس میں اتار تو لیتے تھے اور اب یہ چند دن ناگوار حبس زدہ تنہائی میں بدترین محسوس ہوئے تھے۔ خوبصورت لمحوں کے تعاقب میں خالی دامن رہ گیا تھا۔ باہر کی دنیا ان پر رشک کرنے لگی تھی اور وہ خوش نصیب ہوتے ہوئے بھی بدنصیب **شخص تھے۔ ایسے شخص** جن کے نصیب میں اپنی بیوی کا پیار ہی نہیں تھا۔

"کیسے ہیں آپ؟" پہلی بار اس کے لبوں نے جنبش کی، مرزا صاحب روبرو صرف مسکرا کے اثبات میں گردن ہلا سکے۔ دھنک رنگ ساڑھی میں اس کا سادہ مگر دلفریب حسن انہیں مضطرب سا کر گیا۔ احساس نارسائی ملول سا کر گیا۔

"چائے لیجئے۔" اس نے کپ بڑھایا۔

"شکریہ۔" وہ قدرے سنبھل سے گئے تھے۔

"آپ کے پاس کچھ وقت ہے؟" اس نے مہربان نظروں سے دیکھا۔

"بہت وقت ہے، ایک وقت ہی تو ہے جس میں تنہائی کاٹتی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

صدف نظر چرا گئی۔

"تنہائی بانٹنے کی کوشش کروں گی۔"

"صدف! مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں، تنہائی کہہ کر نہیں بانٹی جاتی، تاہم میں اب بھلا تنہا کہاں ہوں؟" مرزا صاحب خوش دلی سے بولے اور ہلکے سے مسکرا کر اس نے گویا یقین دلایا۔

"آپ کپڑے تبدیل کر لیں، پہلے ابا میاں کی خیریت معلوم کریں گے۔" پھر چائنیز، پھر لانگ ڈرائیو۔" مرزا صاحب ایک دم مسرور اور شادمان سے ہو گئے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ آہستہ سے جواب دے سکے۔ جونہی وہ اندر گئے اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا اور چھم سے زین اس کے قریب آ گیا۔ اس کی مہکتی زلفوں کو ناک سے لگاتے ہوئے بولا۔

"جان، جانوں، جانم، سانس روک لوں یہ مشک مجھ میں سما جائے بولو۔" اور وہ مخمور سی ہو گئی۔ "بولو نا، زندگی یہ حسین سائے میرے لئے ہیں۔" وہ چونک اٹھی۔ زین بھلا وہاں کہاں؟ کیا

میرا وہم تھا؟" زین میرے پاس تھا۔" وہ افسردہ سی ہو گئی۔ چہرے پر حزن ہی حزن چھا گیا۔ بے چین سی ٹہلنے لگی۔ مرزا صاحب نے بغور اس کا جائزہ لیا۔

"چلیں۔"

"جی ہاں، چلئے۔" وہ پلو سنبھالتی ہوئی چل پڑی۔

ابا میاں کی طبیعت کچھ بہتر نہیں تھی۔ وہ ان کے قریب بیٹھی تو انہوں نے گردن دوسری طرف موڑ لی۔ صدف دکھی ہو گئی۔ کچھ کہنا فضول تھا، ابا میاں اس سے خفا تھے۔ اس لئے اس نے مرزا صاحب سے ڈاکٹر کی تبدیلی یا پھر ہسپتال میں ایڈمٹ کے لئے کہا۔ کافی دیر وہ وہاں بیٹھی ابا میاں کو دیکھتی رہی۔ پھر روما نے آ کر چائے کی تیاری کی اطلاع دی تو سب ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ صدف پیچھے تھی۔ روما نے موقع غنیمت جانا اور اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

"زین بھائی سے ملنے چلی جائیں، وہ بیمار ہیں۔"

"نہیں روما، میں نہیں جا سکتی۔" وہ صاف جھوٹ بول گئی۔

"اماں گئی تھیں، انہیں بدستور بخار ہے۔" روما نے پھر بتایا۔

"میرے جانے سے بخار کم تو نہیں ہو جائے گا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"ختم ہو جائے گا۔"

"پاگل ہو تم، مجھ سے ایسی باتیں مت کیا کرو۔"

"جانتی ہیں ابا میاں کو کتنا قلق ہے اس بات کا۔"

"روما، روما کیسے اپنے ہو تم لوگ، میرے احساسات و جذبات سے کھیلتے ہو، مجھے کچوکے لگاتے ہو، کیا میں انسان نہیں؟ کیا میرے اندر دل نہیں؟ کیا زین میرے دل و دماغ کا مالک نہیں؟ مگر میں نے سب کچھ تم لوگوں کے لئے کیا ہے، دیکھو گھوم پھر کے اس گھر کو دیکھو اپنے جسم پر سجے لباس کو دیکھو، اور وہ سب دیکھو جس کی تمنا میں لوگ مر تو جاتے ہیں پر پا نہیں سکتے۔ لڑکیاں آرزو لئے قبر میں اتر جاتی ہیں، میں نے تمہیں اچھا روشن مستقبل دینا چاہا ہے۔ ابا میاں نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے کہ میں انہیں مرنے دیتی۔ بہتر علاج اور دیکھ بھال سے میں نے انہیں بچانا چاہا ہے۔ روما میری قربانی رائیگاں مت جانے دو۔" وہ جنونی انداز میں بول کر کمرے سے باہر نکل گئی اور روما بہن کے دکھ پر افسردہ سی ہو گئی------

وہاں سے واپسی پر چائنیز کے سامنے مرزا صاحب نے گاڑی روک لی کھانا کھانے کے دوران وہ بالکل خاموش اور سنجیدہ رہی۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی انہوں نے پوچھا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟"

"بس گھر چلیئے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"رین بو میں بہت اچھی انگلش مووی لگی ہے۔" مرزا صاحب نے رائے دی۔ تو وہ جھنجھلا اٹھی۔

"یہ عمر ہے آپ کی" کہہ کر وہ گویا خود ہی نادم سی ہوگئی۔ مرزا صاحب شرمندہ سے رحم طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اسے واقعی افسوس ہوا کہ بھلا کیا کہہ دیا افسوس اور شرمندگی کے ختم کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی تھا کہ وہ کھلے دل سے معذرت کرتی۔

"آئم سوری، بس میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"چلو گھر چلیں۔" وہ نہایت متانت سے بولے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ پورے راستے وہ خاموش رہے۔ صدف کو شدید افسوس تھا۔ وہ بھی خود کو ملامت ہی کر رہی تھی۔ لیکن دانستہ طور پر تو وہ یہ سب نہیں کہنا چاہتی تھی بلکہ غیر دانستہ طور پر بیزار سی ہو جاتی تھی۔ اب تک مرزا صاحب اسے دور بہت دور ہی نظر آتے تھے۔ فاصلہ مٹتا بھی کیسے' دلوں کی دوری حائل تھی جو صدیوں پر محیط ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان ایک خلیج تھی۔ جسے پاٹنا دونوں کے بس میں نہیں تھا۔ دلوں کے ساتھ ساتھ جسم بھی تو ایک دوسرے سے نا آشنا ہی تھے۔ کہنے اور سوچنے کی حد تک تو وہ اس کی اور تشنگی کو نظرانداز کئے ہوئے تھی' مگر اندر کی بے چینی اور خلش کیسے ہلچل مچاتی تھی' یہ وہی جانتی تھی۔ نرم گداز مخملیں بستر پر رات رات بھر کروٹیں بدلتی تھی اس نے ہر احساس کی قربانی دے دی تھی۔ مگر قربانی رائیگاں جاتی نظر آرہی تھی۔ کوئی بھی تو اس سے خوش نہیں تھا۔ سب ناراض تھے۔ عیش و عشرت کی زندگی پاکر بھی بے چین اور مضطرب تھے یہ احساس زیادہ جان لیوا تھا۔ اس میں الجھ کر وہ مرزا صاحب سے بیزار ہو جاتی۔ اس وقت بھی وہ افسردہ سی تھی اس لئے چڑ سی گئی۔ تاہم پشیمان سی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆

موسموں کا تیزی سے بدلنا بالکل فطری عمل ہے۔ دنوں میں موسم اپنا احساس چھوڑ کر گزر جاتے ہیں۔ آج کل موسم بہار تھا۔ لیکن برائے نام ہر طرف بہار کی خوش رنگ ہریالی اور شادابی تھی چار سو پھول ہی پھول تھے۔ اگر وہ پہلے سے زیادہ بے چین پریشان اور مضطرب تھی اس کے اندر باہر ایک جیسا موسم تھا' حبس اور کرب کا۔ اس کی دنیا مکمل اداس اور ویران تھی۔ کبھی کبھار خوشگوار احساس کیلئے زین کو دیکھنے جاتی تو اور مضمحل ہو کر آتی۔ وہ بہت خاموش اور سنجیدہ ہو چکا تھا۔ اسے دل پر جبر کر کے واپس لوٹا دیتا اور پھر وہ قید تنہائی میں مقید ہو جاتی۔ ابا میاں اور اماں کی خاموشی' روما اور احمد کی سوالیہ نظریں پریشان کرتی تھیں۔ اس لئے وہاں جانا چھوڑ دیا اور کہیں وہ جانا چاہتی ہی نہیں تھی۔ اگر کہیں چلی بھی جاتی یا پھر کوئی ملنے چلا آتا تو وہ بیزار ہو کر کمرے میں آجاتی۔

آج بھی مرزا صاحب کے گہرے دوست امتیاز علی کے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ کیک کٹنے کے بعد مسز امتیاز نے ننھے ارتضیٰ کو اسے پکڑا دیا۔ گول مٹول ہمکتا ہوا ارتضیٰ اسے بہت پیارا لگا۔ بلکہ ارتضیٰ نے اس کی مکمل توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔ ہمک' ہمک کے ہنسنے لگا۔ صدف بہت دنوں بعد مسکرائی تھی۔ مرزا صاحب نے بغور نوٹ کیا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ پریشان متفکر سی نظر آنے لگی۔ بے چینی زیادہ بڑھی تو اس نے چلنے کے لئے کہہ دیا۔ مرزا صاحب خاموشی سے اسے گھر لے آئے۔ گھر آکر وہ تو اسٹڈی روم میں گھس گئے اور کپڑے تبدیل کر کے صدف نے ٹیپ کا بٹن دبا دیا۔ اس کی من پسند غزل کا سحر طاری ہوگیا۔ بند پلکوں سے ایک ایک لفظ اس پر جادو سا کرنے لگا۔

یہ کس بندھن میں الجھایا ہے تو نے زندگی مجھ کو
جو توڑا بھی نہیں جاتا ' نبھایا بھی نہیں جاتا !

کتنے ہی ستارے ٹوٹے اور پلکوں میں اٹک گئے۔ کئی بار اس نے غزل ریورس کر' کر کے سنی۔ جب رات کے سائے گہرے ہونے لگے تو ٹیپ آف کر کے بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس کے پہلو میں میٹھا میٹھا درد بیدار ہوا۔ ننھا ارتضیٰ اپنی معصومیت سمیت اسے یاد آگیا۔ اسے بانہوں میں بھرنے کے لئے وہ بے تاب ہوگئی۔ مگر یہ اس کی سوچ تھی۔ ارتضیٰ تو اپنی ماں کے پاس تھا۔" ہنہ 'پگلی ہو تم' وہ تمہارا کون ہے؟" ایک دم ہی اپنے اوپر ڈھیر ساری ہنسی آگئی۔ ایسی ہنسی جس سے آنکھیں نمکین ہوگئیں۔

"صدف"۔

"جی۔" وہ آنکھیں صاف کر کے بولی۔

"آپ کا گیسٹ ڈرائنگ روم میں منتظر ہے۔" مرزا صاحب نے روانی میں کہا اور باتھ روم میں گھس گئے اور وہ سوچ بچار میں سلیپر کھینچتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ زین کی غیر متوقع آمد پر وہ بوکھلا سی گئی۔ وہ زرد، زرد سی رنگت لئے سوچوں میں گم تھا۔

"زین تم، یہاں، خوش نصیبی سمجھوں یا؟"

"یہ مانو یا نہ مانو خوش نصیبی تم سے روٹھ چکی ہے، میرے آنے سے اس کو منسوب کرنا صرف بیوقوفی ہے۔" زین نے نہایت مدھم لہجے میں کہا۔

"ایسا لگتا ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"نہیں، خفا نہیں ہوں متفکر ہوں۔"

"بولو کیا بات ہے؟"

"تمہارے آئندہ مستقبل سے۔"

"کیوں کیا ہوا مجھے؟ ٹھیک تو ہوں میں۔" وہ زور سے ہنس کر بولی تو زین اس بکھری بکھری سی صدف کو دیکھ کے رہ گیا۔

"خدا کرے تم خوش رہو، بہرحال میں شہر چھوڑنے سے پہلے ملنا چاہتا تھا۔"

"کیا، تم، تم کہاں جا رہے ہو مجھے چھوڑ کر؟" وہ دیوانی سی ہو گئی۔

"پلیز صدف، جس چھت کے نیچے کھڑی ہو اس کے وقار کا خیال رکھا کرو۔ میں صرف ملنے آیا ہوں، نوکری کی مجبوری ہے جانا پڑے گا۔"

"زین تم بے وفا ہو۔" وہ سسک اٹھی۔

"خاموش، پھر یہ گالی مت دینا، تمہارے دیئے ہوئے زہر کو بوند بوند پی رہا ہوں، پھر بھی میں ہی بے وفا ہوں، کتنی ظالم ہو تم۔" وہ غصے کو قابو کرتے ہوئے بولا۔

"تو پھر تم مت جاؤ، میں کہتی ہوں۔"

"ایسا ممکن نہیں، صدف حقیقت سے اب نظریں مت چراؤ زین کی محبت پاک باز اور بے لوث ہے، مرزا صاحب کی عزت، میری عزت ہے مگر تم پتہ نہیں کیوں اپنے ہی فیصلوں کی پابند نہیں ہو۔" زین بری طرح الجھ سا گیا۔

"پھر میں کیا کروں؟ تم سب مجھ سے ناراض ہو، اور میں اپنے آپ سے بھی خفا ہوں۔"

"ٹھیک کہتی ہو کیونکہ زندگی کے سکھ اس انداز میں حاصل کرنا ہمیشہ کی ایک بھول ہے۔ اس کے علاوہ تو کچھ نہیں۔" زین نے مسکرا کر اس کی رم جھم آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ پھر چند لمحے دیکھتا ہی رہا۔

"اب مجھے اجازت دو، زندگی کے کسی موڑ پر تقدیر میں ہوا تو ملیں گے۔" وہ سرگوشی میں بولا تو وہ ہچکی حلق میں دبا گئی۔ زین چلا گیا اور وہ اس کے وجود کی خوشبو اردگرد محسوس کرتی رہ گئی۔

"کمرے میں پہنچی تو لائٹ آف تھی ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے مرزا صاحب کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس نے لحہ بھر **ٹھٹھک** کر دیکھا اور پھر اپنے بیڈ کے دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گئی۔ مگر وقفے وقفے سے مرزا صاحب کی مضطرب کروٹیں وہ محسوس کرتی رہی۔ خود تو جاگتی ہی تھی لیکن آج تو وہ بھی نیند سے دور تھے۔ وہ کچھ جاننا بھی چاہتی تھی، کچھ سننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ذہن بری طرح تھک گیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر وہ بڑبڑائی۔ "یا اللہ کیا ماجرا؟" مگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ رات گزر گئی۔ فجر کی اذان کے ساتھ جاں گسل رات ختم ہو گئی۔ وہ نماز کے لئے اٹھی مگر مرزا صاحب سوئے رہے۔ وہ باتھ روم سے وضو کر کے بھی آ گئی مگر مرزا صاحب نے کوئی حرکت نہیں کی۔ دل میں عجیب سا خیال آیا لپک کر انہیں ہلایا مگر وہ تو برف ہو چکے تھے۔ ہر جذبے اور حرارت سے عاری سرد اور کہر میں ڈوبی رات کی طرح۔ وہ خوفزدہ سی چلا اٹھی۔

"اٹھئے، مرزا صاحب اٹھئے، نہیں ---- نہیں۔" حواس باختہ، تھر تھر کانپتی ہوئی وہ کمرے سے باہر بھاگی۔ ملازم کوارٹروں سے نکل آئے اس کی دیوانوں جیسی حالت دیکھ کر وہ سب بیڈ روم کی طرف بھاگے اور وہ وہیں برآمدے کے فرش پر بے ہوش سی گر گئی۔

یہ اٹل حقیقت تھی کہ سمجھوتے کی کڑی دھوپ سے نکل کر مرزا صاحب آسودگی کی نیند جا سوئے تھے ---- وہ روز، روز کے احساس جرم سے خود بھی آزاد ہو گئے تھے اور اسے بھی ہمیشہ کے

لئے آزاد کر گئے تھے دل کا درد دل میں دبائے بند آنکھوں سے ایک احساس محرومی لئے وہ چلے
گئے۔صدف کی زندگی مزید اجیرن ہوگئی۔ خلش سی بیکل کرنے لگی' دل وہ دماغ سے ایک ہی آواز
سنائی دینے لگی۔ ''تم قاتل ہو' اپنے شوہر کی' تم نے اذیت دے کر اسے ختم کیا ہے' تمہارے دیئے
ہوئے درد نے اس کی جان لے لی۔

''نہیں' نہیں' میں نے ایسا نہیں کیا؟'' وہ بری طرح سسک اٹھی۔'' یہ سچ ہے تمہارے
ساتھ نے اس محروم شخص کو تنہائی' محرومی اور کرب کے علاوہ دیا ہی کیا ہے؟'' کیا شوہر کے ساتھ
ایسا ہی کیا جاتا ہے؟ اس کے حقوق اس طرح پورے کیئے جاتے ہیں' تم ریا کار مطلبی ہو' تم نے لالچ
میں رشتہ جوڑا اور ایک معصوم انسان کو مار ڈالا۔ چاروں اطراف سے ایک ہی آواز اسے تڑپانے
لگی اور وہ روما کے کاندھے پر سر رکھ کر پھوٹ' پھوٹ کے رو دی۔ روما کو تو جیسے چپ لگ گئی تھی۔
اماں پریشان تھیں اور ابا میاں کی طبیعت تو ویسے بھی سخت خراب تھی۔

زندگی ایسے موڑ پر آگئی تھی کہ زور و زر سب بیکار نظر آتے تھے۔ سسکیاں اس کے اندر دم
توڑ چکی تھیں۔ لبوں پر مکمل خاموشی تھی۔ اپنے آپ سے بھی بیزار ہو چکی تھی۔ کوٹھی کے ہر گوشے
سے مرزا صاحب کی صورت دکھائی دیتی تھی۔ ضمیر کی خلش نے جینا دوبھر کر دیا تھا۔ کوئی اس کا
پرسان حال نہیں تھا۔ اماں اور روما تو ابا میاں میں اتنی مصروف تھیں کہ انہیں اپنا ہوش نہیں تھا۔
روز جو تھوڑی سی فرصت ملتی تو وہ اسے ملنے چلی آتیں۔

عدت کے دن تو ویسے ہی کسی عورت کے لئے بدترین دن ہوتے ہیں۔ وہ اماں کی گود میں
سر رکھ کر چند لمحے سکھ کے گزار لیتی۔ ان کے جاتے ہی پھر بے چینی اور بے بسی کا عالم شروع ہو
جاتا۔ ہر چیز یہاں تک کہ درودیوار بھی اسے طنزیہ نظروں سے گھورتے ہوئے نظر آتے اور وہ
چلانے لگتی۔ میں نے کچھ نہیں کیا' مجھے جینے دو' میرا دم نکل جائے گا۔'' اس طرح کی کیفیت دن
میں کئی بار ہوتی۔ ملازم کمرے کے باہر اکٹھے ہوتے اور پھر ملول سے کام کاج میں لگ جاتے---
انہیں کیا معلوم کہ بیگم صاحبہ کو کس بات کا غم ہے؟ کونسا دکھ ہے جو کھائے جا رہا ہے؟

دکھ بھی تو چن چن کے اس نے خود اکٹھے کیئے تھے۔ شیش محل میں قید تنہائی تو اس کی منتخب
شدہ تھی۔ اب دکھوں کا مداوا کون کرے؟ دکھ تو بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

اس وقت تو بھونچکا پھٹی پھٹی آنکھوں سے صرف دیکھتی رہ گی جب ابا میاں ہسپتال پہنچنے سے
پہلے زندگی کی بازی ہار گئے اور کوئی کچھ نہ کر سکا' روپیہ پیسہ سب دھرا کا دھرا رہ گیا۔ نہ اس کے
پاس تسلی تھی اور نہ حوصلہ۔ وہ ہونق بنی سن رہی تھی۔ مجبوری نے ابا میاں کو آخری بار
دیکھنے بھی نہیں دیا۔ اسے پیسہ بھی بے وقعت نظر آنے لگا۔ ابا میاں کو بچانے کے لئے تو اس نے
جیون ہارا تھا۔ اماں نے اسے سینے سے بھینچ کر چمکارتے ہوئے ایک ایک زخم ہرا کر دیا۔

''دیکھ صدف اوپر والے کی مرضی' اس نے جو دکھ سکھ بانٹ دیئے ہیں وہ اس کی رضا اور
بہتری سمجھ کر قبول کرنا چاہئے۔ مگر تم نے سکھ خریدنے کے لئے اپنا آپ ہار دیا۔ دیکھو موت پیسے کی
اونچی دیوار پھلانگ کر بھی تمہارے ابا میاں کو لے گئی۔ موت زندگی خوشی غمی سب کچھ قدرت
والے نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے' جس کو جو دیا ہے۔ شکر ادا کرے۔ بھلا اس طرح مانگنے سے کچھ
ملا ہے--- معصوم زین کا دل دکھا کر اچھا نہیں کیا تم نے۔'' اماں کی آنکھوں سے رم جھم جاری
تھی۔

''اماں! میں نے یہ سب کس لئے کیا؟'' وہ سسک اٹھی۔

''تو پھر روک لیتیں اپنے ابا میاں کو' مرزا صاحب کو' پیسے اور اچھے علاج کے باوجود وہ کیوں
چلے گئے۔ یہ صرف تمہاری کم فہمی ہے' ورنہ جتنی زندگی انسان لکھوا کر لایا ہے وہ پوری کرتا ہے'
تمہارے خیال میں صرف پیسے سے تعلیم مکمل ہوتی ہے۔ مانتی ہوں پیسے کی اہمیت ہے مگر غوب
گھرانوں سے بھی اچھے تعلیم یافتہ لوگ نکلے ہیں' تم نے زندگی کی تمام حقیقتیں پیسے سے منسوب
کر دی تھیں بولو' کیا رہا' وہ کچھ نہ رہا جس کے لئے تم نے یہ کٹھنائیاں منتخب کیں۔''

''اماں! کاش میری قربانی رائیگاں نہ جاتی؟''

''بیٹا! انسان بے بس ہے' یہ جان کر ہمیں اپنے رب کا شکر گزار ہونا چاہئے' زندگی کے دکھ
بھی مل بانٹ کر سکھ سے گزارنے چاہئیں۔ اماں نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟'' وہ پھر رو دی۔

''صبر کرو۔''

''اماں! آپ سب میرے پاس یہاں آجائیں ورنہ میں اکیلی۔''

''اچھا اچھا اب چپ کرو ہم تمہارے پاس ہیں۔'' اماں نے دلاسہ دیا۔

"گزرتے دنوں میں اس نے دل کے سکون کے لئے ایک بہت بڑی رقم معذور بچوں کے لئے مخصوص کر دی۔ اماں وغیرہ کو اپنے پاس بلا کر وہ کوٹھی معذوروں کے سکول میں بدل دی۔ گزارنے کے لائق پیسہ اپنے لئے رکھا۔ باقی سب فلاحی کاموں میں خرچ کر دیا۔ ذہن کا بوجھ کافی حد تک کم ہوا۔ سب کچھ بانٹ کر خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ ایسے میں وہ بالکل پہلے والی صدف بن گئی تھی۔ اب تو صرف ایک بے قراری تھی کہ کہیں سے زین آ جائے اور وہ اس سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگ لے مگر اس کا تو کوئی پتہ نشان نہیں تھا--- نہ ہی اس نے کبھی خط لکھا اور نہ ہی کوئی ٹیلی فون کیا۔ اسے کبھی کبھی خیال آتا کہ وہ ناراض ہے یا پھر اپنی دنیا میں مصروف۔ مگر دل کی سرزنش پر وہ پھر مطمئن ہو جاتی۔ بس رہ رہ کر وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بے کل سی پورے گھر میں پھرتی۔ اماں اور روما اس کی کیفیت جانتی تھیں۔ روما کو ترس آیا تو زین کا پتہ دے دیا۔ پتہ پا کر وہ اس قدر مسرور تھی کہ دل زور' زور سے دھڑک رہا تھا۔ کاغذ قلم سنبھال کر اس سے مخاطب ہو گئی۔ گلا رندھ گیا آنکھیں بھیگ گئیں۔

"زین!"

"سدا سلامت رہو!

تمہاری مجرم' قصوروار اپنے کئے پر نادم ہے تمام سزائیں بھگت چکی ہے۔ ضمیر کی خلش مجھے جینے نہیں دیتی' میں سب کی مجرم ہوں' ابا میاں کی' مرزا صاحب کی خصوصاً تمہاری۔ جانے والے میرے لئے عمر بھر کی ندامت اور شرمندگی چھوڑ گئے ہیں' مجھے اللہ معاف کرے مگر آکر دیکھو میں کتنی بے کل اور ادھوری ہوں۔ زین مجھے سمیٹ لو' میری خطا بخش دو۔ لوٹ آؤ اپنی صدف کیلئے پلیز-----"

صدف

خط کو گئے بھی کئی روز گزر گئے۔ مگر جواب نہ آیا اس کے اندر جو اضطراب اور بے قراری تھی وہ سکون نہیں لینے دیتی تھی۔ سوچ بچار نے سر میں درد کر دیا تھا۔ صبح سے وہ بستر پر دوائی کھا کر پڑی تھی۔ پورے گھر میں سناٹا تھا۔ احمد سکول میں تھا۔ روما کالج میں' اماں حسب معمول کچن میں۔ وہ بڑی دیر سے لیٹی تھی۔ تنگ آکر باہر آگئی۔ اسی وقت پوسٹ مین ایک رجسٹری لفافہ دے

گیا' چوکیدار نے اس سے آکر دستخط کرائے اور لفافہ تھما دیا۔ رجسٹری اسی کے نام تھی۔ اس نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا اور کمرے میں آکر پڑھنا شروع کیا۔

صدف!

تمہارے زین کے دل کی بگیہ بھی تم جیسے پھول کی منتظر ہے' اس پھول کے آ جانے سے میرا گلشن مکمل ہو جائے گا۔ آؤ' اور میرا جیون معطر کر دو منتظر

تمہارا

زین

کتنے ہی اشک اس کے رخسار بھگو گئے۔ مارے خوشی کے وہ چھلاوے کی مانند کچن کی طرف دوڑی تا کہ اماں کو بتا سکے کہ اس نے ہمیشہ کا سکھ پھر سے پا لیا ہے۔ زین نے اس کی خطا معاف کر دی ہے۔ وہ اس شیش محل سے نکل کر زین کا چھوٹا سا آنگن مہکانے جا رہی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

بارش میری سہیلی

"رحمو! میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔ تم ڈاکٹر کو فون کر کے بلاؤ"۔ یہ کہہ کر منتظر حسن نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور کوٹ اٹھا کر دفتر سے باہر نکل آئے۔

"مس انجم! ڈرائیور سے کہئے گاڑی نکالے"۔ وہ بڑی عجلت میں تھے' سخت متفکر نظر آ رہے تھے۔

"سر! احمد بخش آپ کی گاڑی ورکشاپ لے گیا ہے۔" مس انجم نے کہا۔

"اوہو"۔ خیر میں چلتا ہوں۔ شاید میں آج نہ آسکوں۔ اگر کوئی خاص بات ہو تو گھر پر ٹیلی فون کر دینا" انہوں نے ہدایت دی اور تیزی سے باہر نکل آئے۔ ان کی ذہنی کیفیت اس وقت بہت خراب تھی۔ ان کے عزیز از جان دادی جان جنہیں وہ بی جی کہتے تھے سخت علیل ہو گئی تھیں۔ وہ اڑ کر گھر پہنچنا چاہتے تھے۔ انہوں نے سڑک پر نکل کے چاروں طرف ٹیکسی کے لئے نظر دوڑائی۔ لیکن بے سود۔ ایک منی بس آتی دکھائی دی تو انہوں نے اسی کو ہاتھ دے دیا۔ اور اس کے رکتے ہی وہ اس میں سوار ہوگئے۔ آج تک جنہوں نے بس تو کجا کسی دوسرے کی گاڑی میں بھی سفر نہیں کیا تھا۔ اب بس میں بیٹھ گئے تھے۔ بات دراصل مقصد کی ہوتی ہے۔ پیش نظر بڑا مقصد ہو تو انسان کسی بات کی پرواہ نہیں کرتا۔ یہی حال اس وقت منتظر حسن کا تھا۔ ایک ٹیکسٹائل مل' ایک آئل مل اور دو جیننگ فیکٹریاں ان کی ملکیت تھیں شہر بھر میں ان کا چرچہ تھا۔ روپیہ پیسہ' نوکر چاکر' خوبصورت بنگلہ شہر کے وسط میں تھا۔ جب کہ وہ ٹیکسٹائل میں زیادہ تر بیٹھتے تھے۔ شہر سے باہر کئی میل پر ٹیکسٹائل مل واقع تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں ٹیکسی کا ملنا ناممکن تھا۔ گاڑی تو وہ گھر پر ٹیلی فون کر کے دوسری بھی منگوا سکتے تھے لیکن ___ کم سے کم وقت میں وہ اپنی پیاری بی جی کے پاس پہنچنا چاہتے تھے۔ ان کا تھا ہی کون صرف بی جی ___ ماں باپ حادثے کی نظر اس وقت ہوگئے جب وہ سات آٹھ برس کے ہوں گے۔ ایسے میں بی جی کی شفقت اور محبت نے ہی انہیں پالا۔ ماں باپ کی جدائی نے انہیں انتہائی خاموش۔ اپنی ذات میں بند رہنے والا شخص بنا دیا تھا۔ بہت کم وہ اپنے اسٹاف کے لوگوں سے بات کرتے تھے۔

خوبصورت سرخی مائل ہونٹ ہمیشہ سختی سے بھینچے رہتے تھے۔ کالج سے یونیورسٹی تک لڑکیاں ان کی ایک نظر کے لئے تڑپتی تھیں۔ لیکن انہوں نے کبھی بغور تو کیا سرسری طور پر بھی کسی طرف نہیں دیکھا۔ سخت گیر اور سفاک کے ناموں سے مشہور تھے۔ لیکن انہیں اگر کوئی ہنسنے بولنے پر مجبور کرتا تھا تو وہ صرف بی جی کی ذات تھی۔ وقت اگر وہ نکالتے تھے تو صرف بی جی کے لئے۔ پہروں ان کے قدموں سے لگے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے۔ بڑھاپے کی وجہ سے بی جی اکثر بیمار ہو جاتیں۔ ایسے میں وہ ان کے سرہانے سب کام چھوڑ کر بیٹھ جاتے۔ ڈاکٹر پہ ڈاکٹر تبدیل ہوتا۔ دوائیوں اور پھلوں سے میز بھری ہوتی۔ بی جی ان کی پیشانی چوم کر فقط اتنا کہتیں۔

"میرے چاند اتنا پریشان نہ ہوا کرو"۔

آج بی جی کی طبیعت پھر خراب ہوگئی تھی۔ اسی لئے وہ حد سے گھبرائے ہوئے تھے۔ مگر بس تھی کہ ہر اسٹاپ پر رک رہی تھی۔ وہ سخت پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ کار کے ذریعے گھر تک پہنچنے کا سفر صرف دس منٹ کا تھا۔ لیکن پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ اور ابھی بہت فاصلہ تھا۔ وہ بے چینی سے پیشانی پر ہاتھ پھیر رہے تھے کہ بس کے جھٹکے کے ساتھ ایک گھڑا ان کے سر پر آگرا۔ اور لڑھک کر زمین پر گر گیا ایک سیکنڈ کو تو انہیں چکر سا آگیا۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے اپنے قیمتی کالے سوٹ کا بگڑا حال دیکھ کر آؤ دیکھا نہ تاؤ گھوم کر تھپڑ رسید کر دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ تھپڑ کھانے والی لڑکی ہے۔ ساری بس حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ سب کو لڑکی پر ترس آنے لگا تھا۔ بس کے مسافروں کی اجازت ہی سے وہ گھڑے سمیت بس میں سوار ہوگئی تھی۔ ورنہ گھڑا لے کر بس میں سفر کون کرنے دیتا۔

"بابو جی! کیوں مارا ہے کیوں میری باجی کو۔" لڑکی کی ٹانگوں سے لگے سات آٹھ سالہ بچے نے ملتجیانہ انداز میں ان سے سوال کیا۔ وہ جواب نہیں دینا چاہتے تھے کہ بچہ پھر بولا۔

"آپ تو آنکھوں والے ہیں۔ یہ تو دیکھ نہیں سکتیں"۔ بچے کی آواز رندھی ہوئی تھی انہیں شاک سا لگا۔ پلٹ کر دیکھا' لڑکی کی آنکھیں اپنی بے بسی پر برس رہیں تھیں۔ خوبصورت جھیل جیسی آنکھوں سے آنسو لڑھک کر اس کے صبیح رخساروں پر پھیل رہے تھے۔ شکایتی انداز میں گلابی ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ یہ نہ کہنے پر بھی سراپا شکایت نظر آ رہی تھی۔

اف' یہ میں نے کیا کیا؟ وہ دل ہی دل میں کہہ کر رہ گئے۔ بے اختیار اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا______ رنج و ملال سے ٹوٹے ہوئے گھڑے کو دیکھا۔ جو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ان کے ظلم کی داستان سنا رہا تھا______ وہ **طبعاً**" تند خو نہیں تھے۔ کچھ گھبراہٹ اور کچھ گھڑے کی چوٹ کا ردعمل تھا کہ وہ دیکھے بغیر ہاتھ اٹھا بیٹھے۔ ندامت کے احساس سے پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی______ ایک مرتبہ پھر انہوں نے دکھ بھری نظروں سے ان بہن بھائیوں کی طرف دیکھا۔ لڑکی بلاشبہ بہت حسین تھی۔ لیکن کپڑوں کی حالت اور چہروں کی اداسی بتا رہی تھی کہ وہ بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اسی لمحے بس رک گئی۔ وہ لڑکی اور بچہ دونوں اتر گئے۔ اگلے ہی اسٹاپ پر وہ بھی اتر گئے۔ گھر کا فاصلہ ابھی خاصا تھا۔ ایک ٹیکسی قریب آکر رکی اور وہ بغیر کچھ کہے بیٹھ گئے۔ ڈرائیور کے پوچھنے پر انہوں نے ایڈریس سمجھایا۔ اور خود انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے پیشانی کے وسط کو تھام کر شرمندگی کے سمندر میں غوطے کھانے لگے۔ بی جی کی فکر بھی کچھ دیر کو ان سے دور ہوگئی تھی۔

"منتظر ولاز"۔ کے سامنے ٹیکسی جھٹکے سے رکی تو وہ چونک کر نیچے اترے۔ پیسے ڈرائیور کو دے کر بھاگتے ہوئے بی جی کے کمرے میں داخل ہوگئے۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بلڈ پریشر ہائی ہوگیا تھا۔ میں نے دوا دے دی ہے۔ انجکشن بھی لگا دیا ہے۔ آرام کی ضرورت ہے۔ اگر پھر طبیعت خراب ہو تو ٹیلی فون کر دیجئے گا" ڈاکٹر صاحب نے تسلی دی۔

"تھنک یو ڈاکٹر صاحب"۔ انہوں نے سکون کی سانس لے کر کہا اور ڈاکٹر صاحب کو رخصت کرنے کے لئے باہر تک آئے۔ ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد بی جی کے سرہانے بیٹھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آنکھوں سے لگانے لگے۔ کہ بی جی نے آنکھیں کھول دیں۔

"ارے چاند کب سے بیٹھے ہو؟"

"بولئے نہیں بی جی۔ آرام سے لیٹی رہئے۔ میں آپ کے قریب بیٹھا رہوں گا"۔ انہوں نے پیار سے دیکھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کھانا کھالو' آرام کرو"۔ بی جی کا دل بھی تو ان کے نام سے دھڑکتا تھا۔

"بھوک بالکل نہیں ہے۔"

کیسے نہیں ہے۔ میں نے اپنے چندا کے لئے **نرگسی** کوفتے پکائے ہیں" انہوں نے ہلکی سی ڈانٹ اور پیار سے کہا۔

"کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کام مت کیا کریں۔ نوکر کس لئے ہیں" انہیں غصہ آگیا۔

"سب کام تو نوکر ہی کرتے ہیں۔ لیکن بھئی کھانے میں مجھے کسی کا اعتبار نہیں۔ نوکر چاکر کھانے میں لاپرواہی سے کام لیتے ہیں۔ حفظان صحت کا خیال بالکل نہیں رکھتے۔" انہوں نے پست آواز میں کہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تمہیں اتنا ہی خیال ہے تو ہماری بہو لے آؤ۔ پھر آرام کریں گے"۔ انہوں نے ان کی بات کاٹ کر سرزنش کی۔

"اچھا! اس وقت آپ آرام کریں۔ بہو والا موضوع ادھار رہا پھر کسی وقت بات کریں گے"۔ بی جی ہمیشہ گھما پھرا کر بات اسی موضوع پر لے آتی تھیں۔ اور انہیں جان چھڑانا مشکل ہو جاتی تھی۔ شادی سے انکار کی کوئی وجہ انہیں بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پھر بھی وہ نہ جانے کیوں ذہنی طور پر شادی کے لئے رضامند نہیں ہوتے تھے۔

"کیا سوچنے لگے ہو؟" بی جی نے چونکایا۔

"کچھ نہیں۔ میں کھانا کھاتا ہوں۔ آپ آرام کریں"۔ انہوں نے بی جی کا کمبل درست کرتے ہوئے کہا۔

"کھانا تم میرے سامنے کھاؤ گے"۔ بی جی نے محبت سے کہا اور ساتھ ہی **رحمو** کو آواز دے کر قریب بلایا اور کھانا لانے کو کہا۔

"بی جی۔ آپ کا بس چلے ناں تو مجھے گود میں چھپائے بیٹھی رہیں کچھ نہ کرنے دیں"۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"میرا اک ہی تو چاند ہے۔ تیرے لئے ہی زندگی کی دعا مانگتی ہوں"۔ بی جی نے محبت پاش نظروں سے ان کی بلائیں لے ڈالیں۔

رحیمو کھانا لے آیا تھا۔ انہوں نے بی جی کے سامنے کھانا کھانا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ تعریفیں جاری رہیں۔ بی جی باتیں کرتے کرتے غنودگی سی محسوس کرنے لگیں تھیں' جب انہوں نے کھانا ختم کیا تو وہ سو چکی تھیں۔ پیار سے ان کی پیشانی کو چوما اور رحیمو کو ان کے کمرے میں بٹھا کر خود کپڑے تبدیل کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں آ گئے۔

آج خاصی سردی تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے ہیٹر آن کیا۔ اور دروازہ بند کر کے باتھ روم میں کپڑے تبدیل کرنے کے لئے چلے گئے۔ کپڑے تبدیل کر کے باہر آئے تو کمرہ خاصا گرم ہو چکا تھا۔ کچھ تھکاوٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کمر سیدھی کرنے کو بستر پر دراز ہو گئے۔ لیکن لیٹتے ہی اپنے ہاتھ پر جو نظر پڑی تو وہ منظر یاد آ گیا جب ایک نابینا لڑکی کے چہرے پر انہوں نے طمانچہ جڑ دیا تھا۔ احساس ندامت پھر عود کر آیا تھا۔ احساس جرم کروٹیں لینے لگا تھا۔ بی جی کی باتوں میں دھیان بٹ گیا تھا۔ لیکن تنہائی پاتے ہی سخت مضطرب ہو گئے۔ معصوم اور جھلمل کرتی آنکھیں کمرے میں چاروں طرف محسوس ہونے لگیں "اف میرے خدا یہ کیا کر دیا میں نے 'بے ضرر' معذور وجود کو کتنی بڑی اذیت پہنچی ہوگی۔ اور نہ جانے کیا سوچتی ہوگی وہ؟ کوستی ہوگی مجھے' بد دعائیں دیتی ہوگی' مجھے معاف کر دینا اجنبی لڑکی! مجھ سے زیادتی ہوگئی وہ اس لڑکی سے تصور ہی تصور میں معافی مانگنے لگے لیکن وہ کیسے مجھے معاف کرے گی۔ مجھ سے تو اتنا بھی نہیں ہوا کہ اس سے اسی وقت معذرت کر لیتا۔ کم از کم بچے کو کچھ پیسے دے کر نیا گھڑا خریدنے کو کہہ دیتا۔ پتہ نہیں کس مشکل سے گزر کر انہوں نے وہ گھڑا خریدا ہو گا۔ کتنی شدید ضرورت ہوگی۔ ان جیسی حالت کے لوگوں کے لئے تو مٹی کا گھڑا بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بے چین ہو کر وہ اٹھے اور کمرے میں ٹہلنے لگے۔ لیکن وہ اب کیا کر سکتے تھے وہ تو ان کا پتہ بھی نہیں جانتے تھے کہ جا کر معذرت کر لیتے اور ذہن کو اس کرب سے آزاد کر لیتے۔ کاش وہ مجھے کہیں مل جائیں میں معافی مانگ سکوں۔

☆☆☆☆

"ارے کلمونہی تو کیوں نہ مرگئی۔ کسی ٹرک کے نیچے آگئی ہوتی"۔ اصغری بیگم نے اسے دوہتڑوں سے پیٹ ڈالا۔

"چھوڑ دو چاچی' باجی نے جان کر نہیں گرایا"۔ بہن کو پٹتا دیکھ کر رشید چلانے لگا۔

"ارے بہن کے چہیتے پھر لے آ نیا گھڑا خرید کر" اصغری بیگم نے ایک چانٹا اس کے بھی جڑ دیا۔

"چچی! مجھے مار لو' رشید کو ہاتھ نہ لگاؤ" سکھی نے جھپٹ کر رشید کو سینے سے لگا لیا۔

؟ ہنہ! بڑی محبت ہے دونوں کو' کم بختوں نے حرام کا پیسہ سمجھ رکھا ہے۔ دو دن کھانا نہیں ملے گا تب دیکھوں گی تمہیں" اصغری بیگم نے خونخوار نظروں سے انہیں گھورا۔

"چاچی! نوکری ملے گی تو گھڑا لے آوں گی تو فکر نہ کر"۔ سکھی بھائی کی بھوک کا خیال کر کے اصغری بیگم کے پیروں میں بیٹھ گئی۔

"ہو نہہ! نوکری ______ اری تجھ اندھی کم نصیب کو کون نوکری دے گا؟" انہوں نے لات مار کر سکھی کو دور پھینک دیا۔ ٹیڑھے' اونچے' نیچے فرش کی ایک نوکدار اینٹ اس کی کنپٹی سے اوپر والے حصے میں زخم بنا گئی خون کی لکیر اس کے چہرے پر پھیلی تو رشید لپک کر بہن کے پاس پہنچا۔

"اٹھ باجی ------ تیرے تو خون نکل آیا" ---- وہ سہارا دے کر اسے اٹھانے لگا۔۔ بمشکل ہمت کر کے وہ اٹھی اور رشید کے ساتھ کمرے میں آگئی۔-- پلنگ پر بٹھا کر رشید نے اپنی قمیص کا دامن پھاڑا اور اس کا چہرہ صاف کرنے لگا۔۔ اس نے بے اختیار رشید کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لئے۔۔

"باجی ________ باجی! ہم اتنے بد نصیب کیوں ہیں؟" رشید سسک اٹھا۔

"نہ' نہ میرے بھیا' ایسی باتیں نہیں کرتے' تو کیوں پریشان ہوتا ہے" سکھی تڑپ اٹھی۔ شدت غم سے اس کی آنکھیں بھی مزید برسنے لگیں۔۔

"میں کب بڑا ہو جاؤں گا۔۔ کب تمہارا علاج کرا سکوں گا" اس نے بہن کی بے نور آنکھوں کو اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔۔۔

"بہت جلد۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ میں اپنی آنکھوں کی وجہ سے فکر مند نہیں ہوں" آواز رندھی ہوئی تھی ______ کلیجہ کٹ رہا تھا۔ لیکن رشید کو تسلی کی ضرورت تھی۔۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نصیب میں لکھے اندھیرے کبھی نہیں چھٹے' مقصد کی سیاسی کبھی نہیں دھلتی۔ پھر بھلا چاچی سے کیا گلہ؟ بلکہ چاچی کا تو احسان تھا ان پر کہ انہیں گھر میں پناہ دی ہوئی

تھی۔۔ چھ سال سے وہ ان کی کفالت کر رہی تھیں۔۔ لوگوں کے گھروں میں کام کاج کر کے جو لاتی تھیں وہ ان کے ساتھ کھا رہے تھے۔ اب ان کی عمر کا تقاضا اتنا کام کرنے کا نہیں تھا۔ اسی لئے وہ چڑ چڑی ہوگئی تھیں ______ بیوہ تھیں' بے اولاد تھیں۔ اسی وجہ سے شاید اب تک انہیں برداشت کر چکی تھیں۔ یہی احسان ان کا کچھ کم نہیں تھا۔ کیونکہ بھری دنیا میں ان دونوں کا کوئی نہیں تھا۔ اگر وہ پناہ نہ دیتیں تو کہاں جاتے؟ ماں باپ کچھ بھی تو نہیں چھوڑ گئے تھے ان کے لئے' یہاں تک ایک جھونپڑا بھی نہیں' یہ تو چاچی نے لوگوں سے کہہ سن کر کچی بستی میں کچا سا ایک کمرے کا مکان بنالیا تھا۔۔ جو حکومت نے ان کے نام کر دیا تھا۔ ورنہ شاید یہ پناہ بھی نہ ملتی۔۔ اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔۔ ایک دن روٹی کھا کر دو روز بھوکا رہنا پڑتا تھا وہ تو گذارہ کر لیتی تھی۔ لیکن مسئلہ تو رشید کا تھا اس کے لئے وہ جیتی تھی۔ چاچی نے کہہ دیا تھا کہ کچھ کرو تو کھالو ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ ______ اسی غرض سے رشید کا ہاتھ پکڑ کر کچی بستی سے باہر نکل آتی کہ کسی گھر میں' کسی کوٹھی میں کوئی کام مل جائے' آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن ہر کام کر سکتی تھی۔

آج بھی ساتھ والی حمیدہ نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر احمد کی کوٹھی میں ملازم کی ضرورت ہے۔۔ وہ وہیں جا رہی تھیں کہ اصغری بیگم نے اپنے میلے سے ڈوپٹے کے پلو سے پانچ روپے کا مڑا ہوا سا نوٹ نکال کر اسے دیا کہ آتے ہوئے نیا گھڑا لیتی آنا' پانی پینے کی دقت ہو رہی ہے"۔ یہ اس کی بد نصیبی تھی کہ ڈاکٹر احمد کی بیوی نے بھی انہیں جواب دے دیا اور گھڑا بھی ٹوٹ گیا۔ یہاں تک کہ تقدیر نے ایک اجنبی کے ہاتھوں سے اس کی بے بسی کا مذاق بھی اڑا دیا اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ہاتھ اپنے رخسار پر پھیر کر تھپڑ کا احساس کرنے لگی۔ دکھ اور شرمندگی کے احساس نے جگر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ______ رشید اس کی گود میں سر رکھے سو چکا تھا۔ اس نے اسے سیدھا کر کے لٹایا اور خود بھی زخم پر خالی پٹی باندھ کر اس کے برابر لیٹ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ آج چاچی انہیں روٹی نہیں دے گی۔ اس لئے رشید کا سو جانا اچھا تھا۔ اس نے رشید کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر کہیں بھی بد نصیب نہیں لکھا تھا۔ پھر وہ زندگی کی سختیاں کیوں جھیل رہا تھا۔

اے کاتب تقدیر! میرے وجود پر تو سیاہی پھیری تھی۔ میرے بھائی کو بھی میرا شریک بنا دیا" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کافی دیر بعد اسے سکون سا ملا تو نیند کی دیوی مہربان ہو کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لے گئی۔

ساری رات بھوک کی وجہ سے وہ کروٹیں بدلتی رہی' یہی حال رشید کا تھا۔ ٹھیک سے سویا وہ بھی نہیں تھا۔ بھن کی وجہ سے آنکھیں بند کئے کروٹیں بدلتا رہا۔ سکھی کو دکھ زیادہ بھائی کا ہی ہو رہا تھا۔ لیکن مجبور تھی کیا کر سکتی تھی۔ بے دھیانی میں سر تکئے پر زخم کی طرف سے ٹک جاتا۔ تو اس کی ہلکی سے چیخ نکل جاتی۔ ساری رات اسی بے چینی میں گزر گئی۔

فجر کی اذان ہوئی تو اصغری بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں اور سیدھی اس کی طرف آئیں۔ پلنگ سے نیچے جھولتی گھنے بالوں کی چٹیا پکڑ کر جھٹکے سے کھینچی اور کہنے لگیں۔

"اٹھ جا مہارانی۔ پانی بھر لے پھر نل چلا جائے گا۔ وہ بڑبڑا کر بیٹھ گئی اور ہاتھ سے سر سہلانے لگی۔ بال کھنچنے سے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ چاچی تھوڑی دیر باہر چلتی پھرتی محسوس ہوئیں پھر دروازہ کھول کر وہ باہر چلی گئیں۔ وہ سمجھ گئی کہ چاچی کوٹھی کے کام پر چلی گئی۔ اس نے سلیپر کھینچ کر پہنے۔ اور خود بھی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی۔ باہر صحن میں آگئی۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ چکرا کر گر جائے گی' بہت زیادہ گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ بمشکل اس نے ٹونٹی کھولی' پانی آ رہا تھا۔ پھر وہ بالٹی بھر بھر کر باورچی خانے میں رکھے لوہے کے ڈرم میں ڈالنے لگی۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ مزید اگر ایک بالٹی بھی اٹھائی تو فرش پر ڈھیر ہو جائے گی شکست خوردہ باورچی خانے میں بیٹھ گئی۔ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر آٹے کے کنستر میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن وہ بالکل خالی تھا۔ جلدی سے اس نے باورچی خانے میں موجود ہر ڈبے۔ ہر دیگچی سب دیکھ ڈالیں۔ لیکن کسی میں کچھ نہ ملا' پھر اس نے بے بسی سے سوچا۔ بھلا گھر میں ہے ہی کیا جو میں ڈھونڈ رہی ہوں' ساتھ ہی ڈھیروں نمکین پانی اس کے من میں اتر گیا اس خیال سے شاید اس سے ہی بھوک میں کچھ کمی ہو جائے' اور واقعی ہمیشہ کی طرح ہمت یکجا کر کے وہ رات کے برتن اٹھا کر دھونے لگی کہ رشید آنکھیں ملتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔

"رشید! ہاتھ منہ دھو لو بھیا"۔ سکھی نے آہستہ سے کہا۔

”کس لئے باجی مجھے کون سا ناشتہ کرنا ہے“۔ رشید نے کہا اور ایک لمحے کو برتن دھوتے دھوتے اس کے ہاتھ رک گئے۔

”چاچی تھوڑی دیر تک کوٹھی سے کچھ لے کر آئیں گی پھر ہم کھائیں گے“۔ اس نے ڈھارس بندھائی۔

”رہنے دو باجی، چاچی کا بس چلے تو ہمارے ٹکڑے کر کے کھا جائے“ وہ زہر خند سے بولا۔

”ایسی باتیں نہیں کرتے۔ چاچی ہماری دشمن تو نہیں ہیں“ اس نے کہا

”اور دشمن کیسے ہوتے ہیں۔ تیرے سر کو پھاڑ دیا۔ رات بھر ہم بھوکے سوئے۔ بول اس سے بڑی بھی کوئی دشمنی ہوتی ہے“ رشید تلخی سے ہنس کر بولا سکھی کا دل کٹ کر رہ گیا۔

”رشید سب سے بڑی دشمنی تو تقدیر کو ہم سے تھی اور رہے گی“۔ وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔ رشید آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باہر چلا گیا اور صحن سے لگے نیم کے درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ ہمیشہ ہی وہ جب بھوکا یا پریشان ہوتا تو درخت کے نیچے بیٹھ جاتا اور گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔

کتنا اچھا ہوتا کہ ہم بھی امی ابا کے ساتھ مرگئے ہوتے کم از کم اس مردوں جیسی زندگی سے تو نجات ملتی۔ جہاں خدا کے پاس میری آنکھوں کے لئے روشنی نہیں تھی تو اتنا بڑا وجود بنا کر لوگوں کے راستے میں کیوں چھوڑ دیا کہ جو چاہے ٹھوکر لگائے اور گزر جائے“۔ برتنوں سے فارغ ہو کر وہ وہیں بیٹھی سوچنے لگی کہ ساتھ والی حمیدہ آگئی۔

”ارے سکھی! یہ تیرے سر کو کیا ہوا؟“ حمیدہ ہی تو واحد سہارا تھی جو اس کے دکھ سکھ میں کام آجایا کرتی تھی۔

”ک.... کچھ نہیں حمیدہ، بے بسی کا نشان ہے“ وہ دکھ سے مسکرائی۔

”پھر چاچی کو دورہ پڑا ہوگا“ حمیدہ دکھ سے بولی۔

”پرانی بات ہے۔ خیر تو بتا کیسے آئی تھی۔“ اس نے بات ٹالنے کو کہا۔

”میں تو یہی پوچھنے آئی تھی کہ کل کیا بنا؟“

بس بننا کیا تھا۔ اندھے، بیکار لوگ کسی کا کیا فائدہ کر سکتے ہیں“۔ وہ بولی۔

پھر بھی کچھ پتہ تو چلے۔“ حمیدہ کے کہنے پر اس نے کل والی ساری روداد اسے سنا ڈالی جسے سن کر وہ غصے سے بولی۔

”شرم نہ آئی اس سیٹھ کی اولاد کو کم از کم تمہاری معذوری کو ہی دیکھ لیتا۔“

”چھوڑ حمیدہ، میری معذوری کو تو خدا ہی دیکھ لے تو کافی۔ پتہ نہیں کہ اس بیچارے کو کتنی چوٹ لگی ہو؟“

”بیچارہ وہ تھا یا تم؟ غیرت سے زمین میں کیوں نہ گڑ گیا کم بخت کہیں گا“ حمیدہ نفرت سے بولی۔

”ایسے نہیں کہتے۔ اس نے ٹھیک ہی کیا مجھ پر آخر ترس کیوں کھاتا وہ؟“ وہ لمبی سانس لے کر بولی۔

”میں ہوتی تو خوب ذلیل کرتی اسے کہ خدا کرے تو بھی اندھا ہو جائے۔

”نہ، نہ حمیدہ۔ ایسے مت بول۔“ ہاتھ کے اشارے سے اس نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”تجھے کیوں اس سے ہمدردی ہو رہی ہے“ حمیدہ چڑ گئی۔

”ہمدردی کی بات نہیں ہے حمیدہ۔ اللہ اس کی آنکھیں سلامت رکھے۔ جس کرب سے انسان خود گزرتا ہے اسے وہ کرب دوسروں کو نہیں دینا چاہئے۔ میں سمجھتی ہوں کہ معذوری کا دکھ کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔ پھر میں اس کو یہ بد دعا کیوں دوں؟ وہ بھی کسی کا بیٹا ہو گا۔ کسی کا بھائی ہو گا؟“ سکھی ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولتی رہی۔ لیکن حمیدہ نے دکھی ہوتے ہوئے فقط اتنا کہا۔

”پتہ نہیں تو اتنی صابر کیوں ہے؟“

یہی تو میرا اوڑھنا بچھونا ہے“۔ وہ مسکرائی۔

”پھر اب کیا کرنا ہے“ حمیدہ نے بات بدلی۔

”کرنا کیا ہے تم بتاؤ؟“

”شہر میں ایک کوٹھی ہے۔ ابا کا دوست اس کوٹھی میں چوکیدار ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ مالکن کو اپنی دیکھ بھال کے لئے ملازمہ چاہئے“۔

"لیکن حمیدہ میں ان کے معیار پر پوری نہیں اتروں گی"

"تم ان سے کہہ دینا کہ دو چار روز تمہارا کام دیکھ لیں۔ پھر ٹھیک لگے تو رکھ لیں ورنہ ______"

"ورنہ صبر تو ہے ہی ہمارے ساتھ' اس نے بات کاٹی۔

"جی ہاں! کل تم رشید کو لے کر وہاں چلی جانا۔ میں فارغ ہوئی تو تمہارے ساتھ چلی چلوں گی"۔

"یہ ٹھیک ہے۔ کیونکہ تم میرے ساتھ ہوگی تو مجھے گھبراہٹ نہیں ہوگی"۔ وہ خوشی سے بولی۔

"کل میں آجاؤں گی" حمیدہ اٹھ کر باہر آگئی' رشید کو اداس بیٹھا دیکھ کر وہ اس کے قریب چلی آئی۔

"کیا بات ہے رشید۔ تم نے ناشتہ نہیں کیا؟" اس نے ہمیشہ کی طرح پہچان لیا تھا۔

"نہیں" رشید نے بولنا چاہا۔

"میں تمہارے لئے ناشتہ بنا کر لاتی ہوں" وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ رشید اٹھ کر نل کے پاس گیا اور منہ دھونے لگا۔

☆☆☆☆

"اری سکھی! یہ تو سپنوں کا محل دکھے ہے" حمیدہ کی آنکھیں حیرت سے چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔

"کاش تو دیکھ سکتی۔ اف اتنا حسین گھر میں نے نہیں دیکھا" حمیدہ گیٹ پر کھڑی ہی بولے چلی جا رہی تھی۔

"میں کیا جانو خوبصورتی کیا ہوتی ہے؟ حسین کیسے کہتے ہیں؟" سکھی کے لفظ تھے یا ناکام حسرتیں؟ حمیدہ خاموش ہو گئی۔ اسے احساس بھی نہیں رہا کہ سکھی دیکھ نہیں سکتی۔ وہ تو اپنی ترنگ میں بولتی چلی گئی تھی۔

پگلی! تو جتنی حسین ہے ناں' اتنا یہ محل بھی نہیں۔ بس تو جھونپڑے میں پیدا ہوگئی"۔

"بہلاوے مت دیا کرو۔ حسین لوگوں کی تقدیر حسین ہوتی ہے" وہ طنز سے بولی۔

"ہو سکتا ہے کہ تو ایسے ہی کسی محل میں راج کرے کوئی شہزادہ تجھے پسند کر لے"۔

حمیدہ نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے پیار سے سرگوشی کی۔

"مجھے تیری باتیں بے وقوفی کی علامت لگتی ہیں" وہ ہنس رہی تھی۔

"قسم سے ایسے میں جب تم پھول برسا رہی ہو ______ اور کوئی شہزادہ اپنا دل ہار بیٹھے" حمیدہ نے اس کی بات کا بالکل برا نہیں مانا تھا۔

اچھا' اچھا بابا۔ اب تیری گاڑی یہیں رکی رہی گی یا اندر بھی چلو گی"۔ سکھی نے اسے کہا۔

"ارے ہاں مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا"۔ حمیدہ نے بڑا سا گیٹ عبور کرنا چاہا تو بڑی بڑی مونچھوں والے چوکیدار نے موٹا سا ڈانڈا ان کے آگے کر کے راستہ روک دیا۔

"تم کون اے' کدھر جاتا ہے؟" اس کی گونجدار آواز سے سکھی لرز گئی۔

"وہ' وہ ______ میں ______ میں حمیدہ ہوں چاچا' الٰہی بخش کی بیٹی۔ حمیدہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

"اپنا کچی بستی والا" چوکیدار نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل" حمیدہ خوش ہوگئی۔

"تم ادھر کس طرح ______؟"

وہ ابا بتا رہے تھا کہ تمہاری مالکن کو ملازمہ چاہیے' حمیدہ نے کہا۔

"او۔ میں بھول گیا۔ میں نے ہی بولا تھا اس کو۔ چوکیدار بابا ہنستے ہوئے بولا۔ پھر ہم اندر جائیں؟ حمیدہ نے پوچھا۔

"ہاں' ہاں۔ آؤ ام اندر لے چلیں" وہ ان کے ساتھ چل پڑا۔

سکھی کا ہاتھ تھام کر حمیدہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ ادھر ادھر دیکھنے کا سلسلہ جاری تھا۔ کھلا سرسبز لان دیکھنے کے قابل تھا۔ سبزہ ختم ہوا تو سنگ مرمر کا چکنا خوبصورت فرش شروع ہو گیا' راہداریاں عبور کرتے ہوئے وہ ایک کمرے کے آگے رک گئیں۔ چوکیدار بابا اس کمرے

میں ہی گئے تھے۔ انہیں ہاتھ کے اشارے سے باہر روک گئے تھے۔ ان دونوں کا دل ضرورت
سے زیادہ دھڑک رہا تھا۔

"ایمان سے' اس پریوں کے محل میں لگتا ہے تیری کمی ہے" حمیدہ نے اس کے کان میں
سرگوشی کی۔

"چل ہٹ پگلی" سکھی نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"خدا کرے تیرا کام بن جائے" حمیدہ نے صدق دل سے کہا۔ ---- سکھی نے
ہولے سے آمین کیا۔ اتنے میں چوکیدار بابا نے انہیں اندر جانے کو کہا اور خود باہر چلے گئے۔

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے" حمیدہ نے ٹھنڈے پڑتے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔

"گھبرانے کی کیا بات ہے۔ کھا تو نہیں جائیں گے"۔ سکھی جیسے اللہ نے صبر اور ہمت کی
دولت سے مالا مال کیا ہوا تھا۔ بڑے تحمل سے بولی۔ اور اسے ٹھوکا دیا کہ اندر چلو۔ مشکل تمام
وہ دونوں اندر پہنچیں۔

"آؤ۔ اندر آجاؤ" بیڈ پر سہارے سے بیٹھی بزرگ شفیق سی خاتون نے خلوص سے
کہا۔

"جی جی' السلام علیکم"۔ اتفاق سے ان دونوں نے ایک ساتھ ہی کہا۔

"وعلیکم السلام۔ آؤ میرے قریب بیٹھو" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔
حمیدہ سکھی کو سہارا دے کر بٹھانے لگی تو وہ ایک دم تشویش سے بولیں۔

"کیا یہ ______؟"

"جی مالک ______ یہ بیچاری دیکھ نہیں سکتی" حمیدہ نے سکھی کو بٹھا کر ان کا
مطلب سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ" بی جی آہ بھر کر رہ گئیں۔

"مالکن! یہ میری پیاری سہیلی ہے۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی ہے۔ ماں باپ بچپن میں مر
گئے تھے۔ ظالم چاچی کے پاس رہتے ہیں۔ وہ بہت ظلم کرتی ہے۔ آپ اگر اسے کام دے دیں تو
اللہ آپ کو اجر دے گا" حمیدہ ایک سانس میں بغیر رکے بولتی چلی گئی' ایسا لگتا تھا جیسے اس نے یہ
ساری تقریر حفظ کر رکھی ہو۔ بی جی نے دکھ سے سکھی کی طرف دیکھا۔ اور پھر آسمان کی طرف

دیکھ کر سوچنے لگیں" رنگ روپ سب بھر کے روشنی سے کیوں محروم رکھا ______؟
اوپر سے ماں باپ کی شفقت سے بھی محروم کر دیا۔ تیری باتیں تو ہی جانتا ہے۔"

"مالکن! کیا سکھی کو ملازم رکھ لیں گی آپ" حمیدہ بے چین تھیں۔ وہ چونکیں۔

"سکھی نام ہے اس کا" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی!" پہلی مرتبہ سکھی نے خود جواب دیا۔ بی جی نے محسوس کیا اس کی آواز بھی
مترنم اور جھرنوں جیسی سنائی دیتی تھی ایک دم ڈھیر سارا رحم ان کے اندر اتر آیا۔ انہوں
نے بے چین اور بے تاب لڑکیوں کی طرف دیکھا اور پھر فیصلہ کر لیا۔

"مالکن! ملازمہ آپ کی دیکھ بھال کے لئے ہوگی ناں؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"ہاں! ویسے بہت سے نوکر ہیں۔ لیکن میرا پوتا بضد ہے کہ ایک ملازمہ ہر وقت
میرے قریب رہے۔ میری دیکھ بھال کرے۔ اس کی ضد کے آگے میں بے بس ہو جاتی ہوں۔
ان کی بوڑھی آنکھوں میں محبت اور ممتا کے شفیق رنگ ابھر آئے تھے۔

"وہ جی' آپ کا پوتا ______" حمیدہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ بی جی اس کا مطلب
سمجھ گئیں۔

"یہ اتنا بڑا گھر دیکھ رہی ہو۔ اس میں صرف میں اور میرا پوتا ہیں یا پھر نوکر چاکر"۔ وہ
بولیں۔

"آپ کی کوئی اولاد نہیں ہے؟" سکھی نے پوچھا۔

"نہیں بیٹی' بس ایک بیٹا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی حادثے میں فوت ہو گئے تھے۔ صرف
اب چاند ہی سب کچھ ہے" ان کی آنکھوں سے پانی تیرنے لگا۔

"تبھی وہ آپ سے بہت پیار کرتے ہیں" حمیدہ بولی۔

"ہاں بہت زیادہ اس کا بس چلے تو میری پٹی سے لگا رہے' بڑی مشکل سے پندرہ دن
کے لئے ملک سے باہر گیا ہے۔ دفتر کا ضروری کام تھا۔ سختی سے ہدایت کر کے گیا تھا کہ فوراً
ملازمہ رکھ لوں۔ اس کی بات ماننی پڑتی ہے" بی جی نے تفصیلاً کہا۔

"خوش قسمت ہیں جی آپ" سکھی زیر لب بڑبڑائی۔

"تمہاری نوکری پکی ہے۔ یہ ساتھ والا کمرہ میں صاف کروا دیتی ہوں۔ بھائی سمیت یہیں رہنا پڑے گا"۔ بی جی نے کہا' تو حمیدہ نے خوشی سے اس کا ہاتھ زور سے دبایا۔

"مبارک ہو سکھی" حمیدہ خوشی سے بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔

"شکریہ مالکن" سکھی نے بی جی کا شکریہ ادا کیا۔

"کوئی شکریئے والی بات نہیں۔ تم میرا کام کرو گی' اور اس کے بدلے میں چاند ساری دولت دے سکتا ہے بی جی بات بات میں اپنے پوتے کی تعریفیں کرنے لگتی تھیں۔

"ٹھیک ہے جی سکھی کل سے آجائے گی" حمیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے تنخواہ تو سن لو" بی جی نے کہا۔

"آپ جو دیں گی منظور ہے" سکھی جو دل ہی دل میں ان کے اخلاق کے معترف ہو چکی تھی۔ بڑے اطمینان سے بولی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس اندھی کو کون ملازمت دے گا۔ مگر ان کی مہربان اور شفیق شخصیت نے احساس دلایا تھا۔ کہ بڑے گھروں میں رہنے والوں کے دل تنگ نہیں ہوتے بلکہ کچھ کھلے اور وسیع ظرف والے بھی ہوتے ہیں۔

کل سے کیوں؟ ڈرائیور تمہارے ساتھ جائے گا اور تم بھائی کو لے کر فوراً "آجاؤ" بی جی نے حکمانہ انداز میں کہا جس میں شفقت کا عنصر زیادہ تھا۔

"بہت بہت مہربانی۔ اب آسانی سے میں اور ابا گوجرے جا سکیں گے۔ ورنہ سکھی میں دل اٹکا رہتا"۔ حمیدہ وفور مسرت سے سرشار ہو کر بولی۔

"بے فکر رہو______ سکھی اب ہمارے پاس رہے گی"۔ بی جی نے جواب دیا۔ پھر انہوں نے ڈرائیور کو کمرے میں بلوا کر ان کے ساتھ جانے کی ہدایت کی۔

"واپسی پر سکھی کے قدم زمین پر نہیں ٹکتے تھے سانسیں بے ترتیب سی ہو گئی تھیں۔ مسرت سے اس کی پلکیں بھیگ گئیں تھیں اس کی آنکھوں کو تو ہمیشہ سے برسنے کی عادت تھی اب تک دکھوں اور مشکلات میں برستی تھیں۔ آج تھوڑی سی خوشی ملی تو پھر چھلک پڑیں۔

"ارے پگلی تو اب کیوں رو رہی ہے؟" حمیدہ نے اپنے پلو سے اس کی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"ویسے ہی بس خوشی میں۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"خدا کرے اب تو کبھی نہ روئے۔ بہت اچھی عورت ہیں مالکن"۔ حمیدہ خوش آئند تصور سے آنکھیں بند کرتی ہوئی بولی۔

"لمبی سی سیاہ کار ان کی کچی اور گندھی بستی میں داخل ہوئی تو چاروں طرف چہ مہ گوئیاں شروع ہو گئیں۔ کار میں بیٹھی سکھی اور حمیدہ صاف پہچانی جا رہی تھیں۔ اس لئے ہر انگلی دانت تلے دبی تھی۔ جھٹکے سے گاڑی سکھی کے دروازے پر رکی تو سب سے پہلے حمیدہ اتری اور پھر سکھی' حمیدہ نے ڈرائیور کو تھوڑا انتظار کرنے کے لئے کہا۔ اور دونوں اندر داخل ہو گئیں۔

"چاچی' چاچی سن"۔ سکھی خوشی سے بے خیالی میں چلانے لگی۔

"کیا بات ہے باجی" رشید بہن کو خوش دیکھ کر بولا۔

"رشید' رشید اللہ نے ہماری سن لی۔ چاچی کہاں ہے؟" وہ رشید کے برابر بیٹھ کر اسے گلے سے لگا کر بولی۔

"کیا کہہ رہی ہے تو؟" رشید کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

"ارے رشید' اب تو محل میں رہے گا سکھی مالکن سے کہہ کر تجھے اچھے سے اسکول میں داخل کرا دے گی" حمیدہ نے اسے بتایا۔

"واقعی! پھر کھانا بھی تینوں وقت ملے گا؟" رشید معصومیت سے بولا۔ سکھی اور حمیدہ دکھ سے مسکرا دیں۔ انسان صرف بھوک کے ہاتھوں ہی تو بے بس ہو جاتا ہے۔ یہ پیٹ کی آگ کیسے کیسے گل کھلاتی ہے۔

"ہاں' رشید تو کبھی بھوکا نہیں رہے گا"۔ سکھی نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"نہ' نہ باجی چپ ہو جا کہیں اللہ میاں کو ہماری کوئی بات بری نہ لگ جائے"۔ رشید نے سہم کر بہن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وقت اور حالات نے اسے کتنا حساس بنا دیا تھا کہ وہ سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔

"نہیں رشید' اللہ ہی تو انسانوں کا سب سے بڑا مہربان ہے سکھی نے اسے دلاسہ دیا۔

"چاچی نظر نہیں آ رہی ہے؟" حمیدہ نے چارو طرف نظریں دوڑائیں۔

"چاچی چلی گئیں"۔ رشید کو تھوڑی دیر پہلے کی بات یاد آگئی۔

"کہاں ـــــــــــ؟"

"اپنے بھائی کے پاس گاؤں" رشید کا گلا رندھ گیا۔

"کیوں ـــــــــ کس لئے؟" سکھی نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ کہتی تھی' حرام خورو' میں گاؤں جا رہی ہوں یہ مکان میں نے ٹھیکیدار کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ وہ تمہیں خود نکال باہر کرے گا"۔ رشید نے چاچی کے انداز میں بتایا۔

"اف میرے خدا"۔ سکھی نے دکھ سے سر تھام لیا۔

"پھر کیا ہوا سکھی' اللہ بے سہاروں کے سہارے بناتا ہے" حمیدہ نے سمجھایا۔

"حمیدہ! پتہ نہیں یہ جیون کہاں اور کیسے گزرے گا' دھڑکا سا ہی لگا رہتا ہے"۔ سکھی نے طویل سرد آہ بھری۔

"اب کا ہے کا ڈر' تم سامان اٹھاؤ اور اللہ کا نام لے کر جاؤ"۔ حمیدہ کہتی ہوئی کمرے میں گئی۔ اور ایک بکس جو سکھی کا تھا باہر اٹھا لائی۔

"رشید! یہ سامان بھی بیچ دیا گیا؟" حمیدہ نے پلنگ اور پانی کے ڈرم کچن کے برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔ چاچی کا بھائی کل لے جائے گا"۔ وہ منمنایا۔

"چلو اٹھو سکھی' دیر ہو رہی ہے"۔ حمیدہ نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔ وہ شکست خوردہ سے قدموں سے چل پڑی۔ رشید سب سے پہلے باہر نکلا۔ حمیدہ نے رک کر سکھی سے پوچھا۔

"تیرا کوئی اور سامان یا چیز وغیرہ تو نہیں رہ گئی؟"

"نہیں حمیدہ' یہی کل اثاثہ ہے یا پھر تقدیر کی سیاہی ہے جو ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ وہ متانت سے بولی۔

"باجی! ہم اس گاڑی میں جائیں گے" رشید نے سکھی سے پوچھا اور خوشی سے ہاتھ پھیر پھیر کر گاڑی کو دیکھنے لگا۔

"ہاں رشید' بیٹھو"۔ حمیدہ نے اسے دروازہ کھول کر بٹھایا۔

"حمیدہ' میں مر کر بھی تمہارا احسان نہیں بھول سکتی"۔ سکھی نے محبت سے چور انداز میں کہا اور اس کا ہاتھ آنکھوں سے لگا لیا۔

"چل ہٹ تو میری سہیلی بھی ہے اور بہن بھی۔" حمیدہ نے بمشکل بوجھل آواز پر قابو پایا۔

"تو جانے سے پہلے ملنے آئے گی ناں؟" سکھی نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ ابا کے ساتھ آؤں گی۔ تو اپنا اور رشید کا خیال رکھنا"۔ یہ کہتے کہتے حمیدہ سسک اٹھی۔ سکھی جو ضبط کا دامن تھامنے کی کوشش کر رہی تھی خود بھی رو دی۔ بڑا درد ناک لمحہ تھا۔ حمیدہ نے بڑی مشکل سے ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔

"خدا حافظ سکھی۔ خدا حافظ رشید۔ حمیدہ نے ہاتھ ہلایا۔ سکھی نے بھی ہاتھ ہلایا۔

"گاڑی تیزی سے مڑ گئی۔ حمیدہ دیر تک کھڑی ہاتھ ہلاتی رہی۔ اور اس کی کامیابی کے لئے زیر لب دعائیں دیتی رہی۔

☆☆☆☆

بی جی کی ہدایت پر اس کا کمرہ صاف ہو چکا تھا۔ بی جی کے ساتھ والا کمرہ تھا۔ ایک دروازہ ان کے کمرے میں کھلتا تھا' دوسرا باہر برآمدے میں۔ دروازوں پر نفیس قسم کے پردے پڑے تھے۔ ڈبل بیڈ ایک ڈریسنگ ٹیبل' کپڑوں کی الماری اس کے کمرے میں تھیں۔ رشید خوش ہو کر ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ سکھی نے اپنے اور رشید کے کپڑے الماری میں رکھ دیئے۔ بی جی نے اس کا ٹوٹا ہوا بکس اسٹور میں ڈلوا دیا۔

"باجی! غسل خانے میں فوارہ بھی لگا ہے"۔ رشید غسل خانے سے چلایا۔ سکھی اس کی معصومیت پر مسکرا کر رہ گئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اتنی پرسکون اور مطمئن تھی' بستر پر جو لیٹی تو رشید کے جگانے پر شام ڈھلے اٹھی۔

"باجی! مالکن بلا رہی ہیں"۔ رشید بولا۔

"اچھا"۔ وہ چپل پاؤں میں ڈال کر بی جی کے پاس پہنچ گئی۔

"سو رہی تھیں شاید"۔ بی جی نے اس کی سوئی ہوئی گلابی آنکھوں کو دیکھا۔ جن سے خمار ٹوٹ رہا تھا۔

"جی! زندگی میں پہلی بار سکون سے سوئی ہوں" وہ مسکرائی۔

"شاد رہو"۔ بی جی نے دعا دی۔

"آپ حکم کریں کس لئے یاد فرمایا۔" سکھی نے انہیں یاد دلایا۔

"ارے کیا حکم کروں" انہوں نے قریب کھڑی سکھی کا ہاتھ پکڑا اور بستر پر بٹھالیا۔ وہ کل سے آپ کے سارے کام میں کروں گی" سکھی بولی۔

"کام تو میرا چاند بڑھا دیتا ہے۔ اور زیادہ کرتا بھی خود ہے۔ ویسے تو میں تنگ آجاتی ہوں" بی جی ہنس ہنس کر بتانے لگیں۔

"لیکن اب تو ان کی موجودگی میں بھی یہ میری ذمے داری ہے"۔ سکھی کو اپنا کام اور فرض یاد تھا۔

"میں جوڑوں کے درد کی وجہ سے مشکل میں تھی لیکن یہ کچھ دن سے بلڈ پریشر بھی ہو گیا' اب تو چاند نے اپنی قسم دے کر بستر اور کمرے کا کر کے رکھ دیا ہے"۔ بی جی کو اپنے پوتے کے ذکر سے اہم کوئی اور ذکر نہیں تھا"۔ اس کا اندازہ سکھی لگا چکی تھی۔ اب وہ منتظر تھی ان کے پوتے کی۔ جو بی جی کے بقول اپنی مثال آپ ہے۔ آج تو اس کا پہلا دن تھا یہاں۔ بلکہ آدھا دن جو اس نے سو کر گزارا تھا۔

"بی جی! پھر بھی آپ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"بس بیٹی جو رحمو میرے کام کرتا ہے وہ تم کر دیا کرو' تم اسی سے تفصیل معلوم کر لینا"۔ بی جی نے بات ٹال سی دی۔

"ٹھیک ہے میں ابھی پوچھ لیتی ہوں"۔ وہ اٹھنے کو تھی۔ کہ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر بیٹھنے کو کہا۔

"ابھی تو تم آئی ہو۔ پوچھ لینا۔ تم یہ بتاؤ اداس تو نہیں ہو رہیں۔ تمہارا بھائی خوش تو ہے"۔ بی جی اندازے سے کہیں زیادہ مہربان اور ہمدرد ثابت ہو رہی تھیں۔

"جی! ہم نے دوسری زندگی پائی ہے بہت خوش ہیں"۔ اس کے لب کپکپانے لگے روم روم شکریہ ادا کر رہا تھا۔

"بے فکر ہو کر رہو' اللہ بہتر کرتا ہے" انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ اور وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

عجیب انداز سے وقت کا دھارا بہہ نکلا تھا۔ کہ ان دونوں کی زندگی پھولوں کی مانند مسکرا اٹھی تھی۔ رشید کے معصوم اور اب تک چھپے ہوئے جذبے سر ابھار رہے تھے۔ اور تقدیر انہیں پورا کر رہی تھی۔ اچھا کھانا' تفریح' عمدہ لباس۔ صرف کمی تھی تعلیم کی جو بی جی کے بقول ان کا پوتا آکر پوری کرا دے گا۔ رشید کو اچھے سے سکول میں داخلہ مل سکتا تھا' یہی خیال سکھی کی خوشی کا باعث تھا۔ چار دن ہی میں وہ گلرنگ ہوگئی تھی زرد زرد رنگ سرخ و سفید ہوگئی تھی۔ رخسار دہکے دہکے سے' مسکراتی آنکھیں' یہ سب دیکھ کر بی جی حسرت اس کی بے نوری کے متعلق سوچنے لگتیں۔ "کاش ______ کاش تم ان ستاروں میں چمک بھی رکھتیں تو شاید" اس سے آگے وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگتیں۔

اس نے خود کو گھر کا فرد تصور کرتے ہوئے مکمل ایڈ جسٹ کر لیا تھا۔ صبح سویرے نماز سے فارغ ہو کر وہ بی جی کو جگاتی۔ انہیں سہارا دے کر باتھ روم تک پہنچاتی' پھر انہیں آہستہ آہستہ چلا کر لان تک لاتی۔ تھوری دیر تک وہ اس کے ساتھ چل قدمی کرتیں۔ جو ڈاکٹرز کے بقول بہت ضروری تھیں۔ بستر پر لیٹے لیٹے تو ان کے جوڑ جڑ سے گئے تھے۔ پھر وہ انہیں ناشتہ کراتی۔ اور دس بجے کے قریب دھوپ میں بٹھا کر ان کے سر میں مالش کرتی۔ جوس پلاتی پھر دوپہر کو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابقت کھانا کھلا کر انہیں آرام کرنے کو کہتی۔

اسی طرح کے معمولات سے سارا دن گزر جاتا۔ رات جب وہ بستر پر لیٹتی تو تھکاوٹ سے آنکھیں خود بخود بند ہونے لگتیں۔ ایسے میں رشید بھی کوئی بات کرتا تو وہ ہوں' ہاں کے سوا کچھ جواب نہ دے پاتی۔ بائیس سال کے بعد اسے نیند کے معنی معلوم ہوئے تھے۔

"لیکن آج تو وہ کچھ اس طرح گھوڑے بیچ کر سوئی تھی کہ بی جی اسے آوازیں دیتی رہیں لیکن اس نے نہیں سنیں پھر بی جی کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ رحمو نے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کر کے بلایا۔ ڈاکٹر چلا بھی گیا لیکن اسے کچھ پتہ نہیں چلا۔ یہیں سے اس کی بد نصیبی کی کہانی پھر شروع ہوگئی۔ اتفاق سے بی جی کے پوتے اچانک ہی کام ختم کر کے آگئے۔ رات کو ان کی اچانک آمد' رحمو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھر ساری رات وہ ان کے پاس رہے۔ اسے تو

صبح پتہ چلا۔ اس نے بی جی کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ٹھٹھک کر اپنے قدم روک لئے اور اپنے ذکر پر پردے سے لگ گئی۔

مجھے بی جی سے اس غلطی کی توقع نہیں تھی میں نے صحت مند ملازمہ رکھنے کو کہا تھا نہ کہ خود محتاج لوگوں کی نگہداشت کریں۔ حد ہو گئی"۔ اندر سے سخت غصے اور جھنجلاہٹ میں بی جی کے پوتے کے آواز آرہی تھی۔ بی جی تو دوائی کے زیر اثر نیم غنودگی میں تھیں البتہ رحمو کی کم بختی آئی ہوئی تھی۔ سکھی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"وہ جی۔۔۔۔۔وہ سارا کام ٹھیک ٹھاک کر لیتی ہیں۔ آپ بی جی سے پوچھ لیجئے گا"

رحمو مارے بوکھلاہٹ کے بول بھی نہیں پار رہا تھا۔

"خاک کر لیتی ہیں اتنی بے خبر سوتی رہیں' اگر ہم بروقت نہ پہنچ پاتے تو بی جی شاید ہم سے روٹھ گئی ہوتیں"۔ ان کی گونجدار آواز سکھی کو شرمندگی سے زمین میں گاڑ گئی۔ اف میرے خدا"۔۔ وہ دکھ سے نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔

"فوراً" ان محترمہ کو فارغ کرو' یہ یتیم خانہ نہیں۔ میں خود کسی ملازمہ کا یا نرس کا بندوبست کر لوں گا"۔ یہ احکامات جاری کر کے وہ بالکل اس کے قریب سے گزر کر باہر نکل گئے۔ اور وہ چونک کر جاتے ہوئے خوشبو کے جھونکے کو محسوس کر کے پردے سے الگ ہو گئی۔ لرزتی ٹانگوں سے وہ بمشکل بیڈ تک جا سکی۔ قصور تو اس کا تھا۔ لیکن تحقیر و تضحیک کا یہ انداز اسے ٹکڑے ٹکڑے کر گیا۔ پھر بادل آئے اور وہ سسک اٹھی۔ تھوڑی دیر وہ بیٹھی روتی رہی۔ لیکن جیسے ہی آنسو خشک ہوئے۔ صبر اور حوصلہ اس میں پہلے کی طرح آموجود ہوا۔ اس سے پہلے کہ رحمو کر اسے بتاتا' وہ بہتر سمجھتی تھی کہ خاموشی سے یہاں سے چلی جائے' اسی خیال کے تحت اس نے الماری سے اپنے ساتھ لائے ہوئے کپڑے دوپٹے میں باندھے اپنے پرانے سلیپر پہنے اور رشید کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ ابھی تک سویا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے باجی؟" تیری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں"۔ رشید نے آنکھیں کھولتے ہی چونک کر پوچھا۔

"ک.....ک......کچھ نہیں تم اٹھو کپڑے تبدیل کر لو ہمیں جانا ہے" ٹکڑے ٹکڑے دل کو سنبھال کر وہ بڑے حوصلے سے بولی۔

"کہاں" رشید نے حیرانی سے پوچھا۔

"جہاں خدا لے جائے' زمیں چھوٹی نہیں ہے"۔ وہ یہ کہہ کر اسے وہی پرانے کپڑے دینے لگی جو وہ پہن کر آیا تھا۔ آپ بھی وہی ململ کا دوپٹہ' کاٹن کا وہی سوٹ نکال کر پہن لیا۔ وہ بے ضمیر نہیں تھی۔ اتنی تحقیر سے بھرپور جملے سن کر بھی برداشت کر لیتی۔ زندگی نے ہر قدم پر اسے دکھ دیئے تھے۔ لیکن ہر بار اس نے اعلیٰ حوصلگی سے وہ سارے دکھ برداشت کئے تھے۔ اور وہ دکھ آنسوؤں کے ذریعے اس کی آنکھوں سے بہہ جاتے تھے۔ آج کا دکھ کوئی نیا نہیں تھا۔ بلکہ یہ دکھ دینے والا بھی نیا نہیں۔ دوسری بار اس نے وہی مدھر خوشبو اپنے قریب محسوس کی تھی۔ لہٰذا....دکھ کس بات کا....؟

رشید نے بہن سے کوئی اور سوال نہیں کیا۔ خاموشی سے اس کے ساتھ چل دیا۔ شاید وہ بھی ہر بات سمجھتا تھا۔ یا پھر اسے پہلے ہی اندازہ تھا کہ وہ محلوں میں رہنے والے نصیب لے کر نہیں پیدا ہوئے۔ بہن کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر وہ چلتا جا رہا تھا۔ سکھی کو آج حمیدہ بری طرح یاد آرہی تھی۔ وہی تو اس کا واحد سہارا تھی۔ جو دو روز پہلے اس کو مل کر یہاں سے جا چکی تھی۔ "کاش حمیدہ تم اس وقت ہوتیں تو میں تم سے پوچھتی کہ بتاؤ محلوں میں رہنے والے سب بڑے دل کے مالک کیوں نہیں ہوتے؟" لیکن اس میں حمیدہ کا بھی کیا قصو؟ بی جی کی محبت اسے یاد آگئی کتنی شفیق اور مہرباں تھیں' جانے سے پہلے اس کا دل چاہا کہ ان سے مل کر جانا چاہیے۔ لیکن وہ انہیں دکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے خاموشی سے چل دی تھی۔ اتفاق سے چوکیدار بابا بھی گیٹ پر نہیں تھے۔

قدم انجانی سڑکوں پر رواں دواں تھے' رشید اس کی انگلی تھامے سڑک کراس کراتا۔ دونوں خاموش تھے البتہ سوچیں یکساں تھیں۔ نئی منزل کا دونوں میں سے کسی کو علم نہیں تھا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ رشید کی ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔ بمشکل انہیں گھسیٹ رہا تھا۔ بھوک بھی شدت سے جاگ اٹھی تھی۔ قدموں کی لڑکھڑاہٹ محسوس کر کے سکھی رک گئی۔ اور رشید سے پوچھنے لگی۔

"رشید! کیا بات ہے چلا نہیں جا رہا______؟"

"نہیں باجی۔ ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ بھوک بہت لگی ہے"۔ اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ وہ تڑپ اٹھی۔ ایک پیسہ پاس نہیں تھا۔ اندھی ضرور تھی لیکن پیارے بھائی کے چہرے پر پھیلی زردی محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی تکلیف کا اندازہ لگا سکتی تھی۔

"رشید! تھوڑا سا صبر کر لو۔ خدا تمہیں بھوکا نہیں رکھے گا"۔ اتنا کہتے ہوئے کتنے ہی قطرے اس کے حلق کو تر کر گئے۔

"باجی! نہ رو۔ میں چل سکتا ہوں مجھے بھوک نہیں لگی"۔ رشید بات کی سنگینی کا احساس کر کے تیزی سے بولا۔ وہ بھوک کا احساس مٹا کر ایک دم ہی تیز چلنے لگا______ سکھی نے دکھ سے اپنے آنسو صاف کئے اور چل پڑی۔

"شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ لیکن وہ دونوں مسلسل چل رہے تھے۔ بھوک نے بے حال کر دیا تھا ٹانگوں کی لڑکھڑاہٹ نے روکا بھی بہت۔ لیکن صبر اور حوصلے نے رکنے نہیں دیا' ہاں اب فکر دامن گیر تھی کہ رات سر پر آچکی ہے کہاں گزرے گی' پورا شہر اجنبی تھا اور پورا ہی شہر گھوم چکے تھے۔

اب وہ ریلوے اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔

رشید! رات کو کیا ہو گا؟

"باجی! گاڑی کے سامنے آجاتے ہیں' پھر نہ ہم ہوں گے اور نہ یہ مشکلیں" رشید آنسوؤں میں ڈوب ہی گیا' اور پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔ سکھی کے لئے مشکل ہو گیا کہ کسی طرح اسے چپ کرائے۔ بچہ تھا۔ عمر سے بڑے اور کڑے امتحانوں سے کب تک خاموشی سے گزرتا۔ صبر ٹوٹا اور ذہن نے تلخی سے سوچا کہ اس زندگی سے کیا حاصل؟

"رشید' رشید' میرے بھائی' میں تیرے ساتھ ہوں چپ ہو جا"۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں چپ کرا رہی تھی۔

"تیری فکر نہ ہوتی تو کب کا ٹرک کے نیچے آگیا ہوتا______" وہ روتا ہوا بولا۔

"چلو پھر پہلے مجھے دھکا دو اور پھر خود بھی مرجاؤ"۔ وہ خود پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی تھی۔

مغرب کی اذان ہو گئی۔ ملگجے اجالے میں ان کی برستی آنکھیں بوڑھے کریم بخش ٹانگے والے کو نظر آگئیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ خدا کو ان پر ترس آگیا۔ وہ ٹانگہ ان کے قریب لے آیا۔ اور نیچے اتر کر محبت سے بولا۔

"کیا بات ہے بیٹی کیوں رو رہی ہو؟" سکھی اتنی شفیق اور مہربان سی آواز پر چونکی رشید نے بھی بھیگی آنکھوں سے دیکھا۔

"جی' کچھ نہیں۔ تقدیر کی سیاہی دھونا چاہتے تھے' لیکن شاید دھل نہیں سکتی"۔ سکھی نے جواب دیا۔

"بیٹا! بات کیا ہوئی۔ گھر والوں سے بچھڑ گئے ہو یا پھر غلط اسٹیشن پر اتر گئے ہو؟" کریم بخش بابا نے چمکارتے ہوئے رشید کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"نہیں بابا' بس زمین تنگ ہو گئی ہے"۔ سکھی نے بھیگی بھیگی پلکیں صاف کیں۔

اوہ تمہیں جانا کہاں ہے؟" "کریم بخش بابا کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"یہی تو معلوم نہیں"۔ رشید نے کہا۔

تمہارا کوئی گھر نہیں؟" انہوں نے دکھ سے پوچھا۔

"نہیں ہے۔ رات ہو گئی ہے پتہ نہیں کیا کریں"۔ سکھی نے آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے بیٹا مجھے پوری بات بتاؤ مجھے اپنے ابا کی جگہ سمجھو"۔ رحیم بخش بابا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تب اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ اپنی پوری زندگی کھول کر رکھ دی۔ وہ تاسف سے ہاتھ ملنے لگے۔

بیٹی! اگر وہ شخص رحم کھالیتا تو کیا ہو جاتا"۔

"کیوں بابا' کون لگتی تھی میں اس کی؟" وہ طنزیہ ہنس کر بولی۔

"کھیر (خیر) تم میرے ساتھ چلو' گریب (غریب) جرور (ضرور) ہیں لیکن تمہیں چھت ملے گی"۔ انہوں نے اسے ٹھیک سے دوپٹہ اوڑھایا۔ آنسو خشک کئے اور شانوں پر ہاتھ رکھ کر چلنے کا اشارہ کیا۔

"مگر ______ یہ ہزاروں سوال اس کی زبان پر آکر ٹھہر گئے خدشات ذہن میں ہلچل مچا کر رہ گئے۔

"اگر مگر چھوڑ بیٹا۔ رات کا وکھت (وقت) ہے، جوان جہان کہاں ماری ماری پھرے گی"۔ انہوں نے اپنے اندر کے خدشات کو بھی پرے دھکیل کر اس سے کہا۔ کیونکہ اس وقت رحم اور ہمدردی کا یہی تقاضہ تھا۔ ورنہ غربت سے لڑنے والی تیز کڑوی کسیلی ان کی بیوی جو طوفان سر پر اٹھائے گی اسے وہ سمجھتے تھے۔

بابا! مجھے اور باجی کو روٹی بھی ملے گی؟" رشید کے لبوں پر امید نے ایک مرتبہ پھر مسکراہٹ بکھیر دی۔ اس کی معصومانہ بات پر بابا نے رشید کے گال تھپتھپائے۔ اور اثبات میں جواب دیا۔

پھر سکھی اور رشید، بابا کے ٹانگے میں بیٹھ گئے، جیسے ہی بابا نے گھوڑے کی لگام تھام کر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ دوڑنے لگا تیزی سے سرسراتی ہوئی ہوا اس کے قریب سے گزرتی۔ تو اس کے ذہن میں بھی طوفان اٹھنے لگے۔ "نہ جانے اب قسمت کیا کھیل دکھانے کے لئے لے جا رہی ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔ پھر گزری ہوئی ہر ہر بات اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ ہچکولے کھاتے کھاتے ٹانگے میں اس کا بے قیمت وجود بھی ہچکولے کھا رہا تھا۔ جب کہ رشید بچہ تھا سب بھول کر ایک مرتبہ پھر مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆☆

صبح سے منتظر حسن، بی جی کے سرہانے بیٹھے تھے۔ جیسے ہی انہیں ہوش آیا تو وہ بڑبڑانے لگیں۔ "سکھی ___ سکھی _____ سکھی ____"۔ وہ غور سے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن بڑبڑاہٹ میں یہی لفظ سمجھ آ رہے تھے۔

"سکھی، سکھی بیٹی ___ پ _____ پا _____ پانی ___" ان کا حلق شاید خشک ہو رہا تھا۔ منتظر حسن تیزی سے پانی کے گلاس کی طرف بڑھے، اور بی جی کا سر ایک بازو سے اوپر کر کے دوسرے ہاتھ سے گلاس ان کے منہ سے لگا دیا۔ انہوں نے چند گھونٹ بھرے تو جیسے ہوش آیا اور بولنے کی قوت بحال ہوئی۔ انہوں نے نیم وا آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔

"چاند! تو، تو کب آیا؟" وہ خوشی سے انہیں دیکھتی ہوئی بولیں۔

"رات ___ رات بی جی جب آپ بے ہوش تھیں"۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"اطلاع ___ اطلاع تو دیتے"۔ وہ بڑی مشکل سے بول پا رہی تھیں۔

"موقعہ ہی نہیں ملا۔ میں نے سوچا فوراً" جانا چاہیے۔ میری بی جی کی طبیعت ٹھیک نہیں" وہ خوشدلی سے بولے۔

"پاگل! میری فکر ہی لگی رہی ہوگی۔" وہ دھیرے سے ان کے گال پر چپت لگاتی ہوئی بولیں۔

"تو اور کیا ___ یہاں بھلا تھا ہی کون آپ کا خیال رکھنے کو؟"

"ارے نہیں، اس مرتبہ میں اکیلی نہیں تھی۔ سکھی تھی میرے پاس"۔ وہ مسکراتی ہوئی بتانے لگیں۔

یہ سکھی کون ہے؟ آپ تھوڑی دیر پہلے بڑبڑا رہی تھیں"۔ وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگے۔

"تم ملازمہ کا نہیں کہہ گئے تھے۔ میں نے _____"

"اوہ، اچھا۔ وہ محترمہ _____ سکھی نام رکھتی تھیں" انہوں نے بی جی کی بات کاٹ کر کہا۔

"ٹھہرو۔ میں ملواتی ہوں"۔ بی جی نے کہا۔

"چھوڑیں بی جی، وہ کیسی ملازمہ تھی، دیکھ سکتی نہیں تھی۔ آپ کی دیکھ بھال کیسے کر سکتی تھی"۔

"تم اسے سے ملو گے تو قائل ہو جاؤ گے۔ آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتی مگر ہر کام میں ماہر اور بہت سادہ پیاری سی ہے"۔ بی جی اپنی ترنگ میں کہے جا رہی تھیں۔ منتظر حسن سوچ میں پڑ گئے کہ بی جی کو کس طرح یہ بتا سکیں گے کہ ان کی وجہ سے آپ کی ملازمہ خاص جا چکی ہیں۔ یہی فکر انہیں دامن گیر ہو گئی۔

"رحیمو، ارے رحیمو!" بی جی نے قدرے توقف کے بعد رحیمو کو پکارا۔ وہ تیزی سے آ کے ان کے قریب کھڑا ہو گیا۔

"سنو، سکھی کو بلاؤ" انہوں نے رحیمو کو کہا۔ رحیمو نے چونک کر منتظر حسن کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا جواب دوں؟

"وہ جی۔ وہ تو چلی گئیں" رحیمو نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگیں۔ گویا انہیں اس کی عقل پر شبہ ہونے لگا ہو کہ وہ کیا بک رہا ہے؟

"بی جی، اس ملازمہ کو ہم نے نکال دیا ہے؟"۔ وہ دھیرے سے بولے۔ کیوں کہ یہ جواب تو انہیں دینا ہی تھا۔ ساتھ ہی بی جی کی نظروں کا زاویہ بھی بدل گیا۔

"کیا___ چاند تم نے___ لیکن کیوں___؟" کئی سوال ان کی زبان کی نوک پر آکر دم توڑ گئے۔ اور دل دکھ سے بھر گیا، وہ بغور بی جی کی بدلتی حالت کا جائزہ لے رہے تھے۔

"بی جی! وہ میں نے ایک ملازمہ کا بندوبست کر لیا ہے، وہ موزوں نہیں تھی"۔ انہوں نے ان کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی۔

"مگر چندا، وہ ملازمہ سے زیادہ اچھی لڑکی بھی تھی۔ تم نے آتے ہی یہ فیصلہ کیوں کر ڈالا؟" بی جی گلوگیر لہجے میں بولیں، ان کی نظروں میں اس کا معصوم کتابی چہرہ گھومنے لگا۔ "نہ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہوگی۔ اور معاشرے کے بھیڑیئے۔ اف میرے خدا تو امان میں رکھنا"۔ وہ صرف دعا دے کر رہ گئیں۔ اور وہ ندامت سے نظریں جھکا کر بیٹھ گئے۔

"برا کیا چاند، نہ جانے وہ کہاں ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہوگی۔ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اس کا، اور وہ معصوم رشید بھوک سے نڈھال ہو رہا ہو گا"۔ بی جی سخت رنجیدہ ہو رہی تھیں۔ منتظر حسن اٹھ کر ٹہلنے لگے۔

"چھوڑیں بی جی، ایسے لوگ تو اس دنیا میں بہت ہیں۔ آپ کس کس کو پناہ دیں گی۔" انہوں نے دل کی گھٹن کو دباتے ہوئے کہا۔ حالانکہ کوئی اضطراب ان کے اندر بھی کروٹیں لے رہا تھا۔

"رحیمو! ہم سے ملوایا تو ہوتا"۔ انہوں نے شاکی نظروں سے رحیمو کو دیکھا۔

"وہ جی، وہ کسی سے مل کر نہیں گئیں۔ ان کے تو کپڑے بھی جوں کے توں رکھے ہیں اپنے پرانے کپڑے لے گئی ہیں"۔ رحیمو نے تفصیل بتائی۔

"دیکھا تم نے کتنی خودی تھی، اس میں، غیرت مند تھی وہ، اس لئے تو مجھے اس کی فکر ہے۔ ورنہ میں خوب سمجھتی ہوں اچھے اور برے کردار کی لڑکیوں کو"۔ انہوں نے منتظر حسن سے کہا۔ وہ دل ہی دل میں اس بات کے قائل ہو گئے۔

"تم جاؤ، رحیمو سارے کپڑے نکال کر لاؤ۔ سب رکھے ہوں گے جو ہم نے لے کر دیئے تھے"۔ رحیمو ان کے حکم پر گیا اور تھوڑی دیر میں کپڑے سمیٹ کر لے آیا۔ کپڑے اس نے بی جی کے قریب رکھے اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پوسٹ کارڈ سائز فوٹو بھی بی جی کی طرف بڑھایا۔

"یہ جلدی میں شاید فوٹو بھی اپنا بھول گئی ہیں" رحیمو نے بتایا تو بی جی آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔

"لو دیکھو، اس کے چہرے پر حسرت و بے بسی اور معصومیت کے سوا تمہیں کچھ نظر نہیں آئے گا"۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے فوٹو منتظر حسن کی طرف بڑھایا تو وہ چکرا کر رہ گئے۔ دل میں جیسے پھڑپھڑا کے باہر نکل آئے گا۔ کچھ عرصہ پہلے کی خلش جیسے جاگ اٹھی ہو، ان کے لب کانپ کر رہ گئے۔ پہلے کے جرم کی کسک ابھی مٹی نہیں تھی کہ اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مٹھی میں فوٹو دبا کر تیزی سے باہر نکل آئے گاڑی نکالی اور سڑکوں پر چاروں طرف اسے تلاش کرنے لگے"۔ اے اچھی اور معصوم لڑکی میرے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر دو، مجھے صرف ایک بار مل جاؤ"۔ بے بسی سے وہ سوچ کر رہ گئے۔ بھلا رات کے گھرے سائے میں وہ کیسے مل سکتی تھی۔ تھک ہار کر لوٹ آئے۔ کمرے میں بند ہوتے ہی وہ اس کی تصویر کو گھورنے لگے۔ انہیں ایسا لگا جیسے وہ پلکیں جھپک جھپک کر انہیں دیکھ رہی ہو۔ اور ان کی پریشانی پر مسکرا رہی ہو۔ انجانے میں کتنی بڑی غلطی وہ کر بیٹھے تھے۔ اب تک تنہائی میں وہ ضمیر کے کچوکے سہہ رہے تھے، اب تک ان کے دل میں دماغ پر وہ ساگر جیسی آنکھیں محیط تھیں وہ صبیح رخسار انہیں یاد تھے جن پر ان کی انگلیوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ انہوں نے اسے بہت تلاش کیا تھا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی تھی۔ اب وہ آئی بھی تو انہوں نے اسے خود گنوا دیا تھا۔ انجانے میں ایک بار پھر اس پر ظلم کر بیٹھے تھے۔ انہیں پشیمانی تھی کہ آخر وہی بار بار کیوں ان کی ستم انگیزیوں کا نشانہ بن رہی ہے۔

خاصی دیر تک وہ اس کے بارے میں سوچتے رہے نظریں اس کی تصویر پر جامد ہو گئی تھیں۔

"ارے یہ کن کو لئے چلے آئے ہو؟" تیز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"یہ بیٹی ہے اور یہ بیٹا"۔ کریم بخش بابا نے فرط مسرت سے دونوں کا تعارف کرایا۔

"باؤلے ہو گئے ہو۔ یا بالکل سٹھیا گئے ہو"۔ وہی آواز پہلے سے زیادہ تیز اور سخت سنائی دی تھی۔ سکھی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اور رشید سمٹ کر اس کے قریب ہو گیا۔

"عقل کی بات بھی کر لیا کر، سب کچھ بتادوں گا اٹھ کر پیار کر، اندر بٹھا"۔ کریم بخش بابا نے بیوی کو سمجھایا۔

"تیرا تو دماغ خراب ہے۔ میں پوچھتی ہوں انہیں کیوں لائے ہو؟" اس نے کب شوہر کی بات سنی تھی جواب سنتی۔

"فضیلت! دیکھ یہ بیچارے بے سہارا ہیں اس واسطے لے آیا ہو" ان کا لہجہ نرم ہو گیا۔

اچھا ایک تو ہی سہارا دینے کو رہ گیا ہے۔ ارے پہلے اپنی اولاد کو تو پال لے"۔ زبان کیا تھی۔ دہکتے انگارے تھے جو سکھی کے وجود کو داغ گئے۔ وہی خوف جاگ اٹھا

"رزق تو اللہ دیتا ہے تو یا میں کون ہوتا ہوں"۔ کریم بابا نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں، ہاں تو ٹھیک کہتا ہے۔ مگر میں نہیں رکھ سکتی"۔ وہ زہر خند سے بولیں۔

"فضیلت میری نیکی برباد نہ کر، یہ تیری خدمت کرے گی"۔ کریم بخش بابا بیوی کو سمجھا ہی سکتے تھے۔ مگر وہ تنتنا کے بولی۔

"مجھے نہیں چاہئے خدمت ودمت، ارے یہاں روٹی کے تو لالے ہیں۔ تمہیں نیکی سوجھی ہے"۔ سکھی کا دل ڈبکیاں کھانے لگا۔

"تو پھر بھی سن لے کہ یہ یہاں ہی رہیں گے"۔ کریم بخش بابا نے ہمت کر کے فیصلہ سنایا اور سکھی کو سہارا دے کر اندر کمرے میں لے گئے تھے۔

"ہائے، ہائے یہ تو اندھی ہے"۔ فضیلت ہاتھ ملتے ہوئے دہائی دینے لگی۔ کریم بخش بابا نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی، جب کہ وہ سرتاپا لرز اٹھی۔ رشید نے مظلومیت سے بہن کی طرف دیکھا۔

"بیٹی! تو فکر نہ کر میں فضیلت کو سمجھادوں گا۔ ویسے وہ دل کی بری نہیں غربت نے چڑ چڑی کر دیا ہے۔" بابا نے اس کی آنکھوں میں اترتے خدشات کو بھانپ کر ہمدردی سے کہا۔

بابا! آپ کا بہت شکریہ" اس نے یہ دھوپ جیسا سایہ بھی قبول کر لیا تھا۔ جس کی کوئی پناہ نہ ہو اس کے لئے یہ سب باتیں غیر اہم ہوتی ہیں"۔

"میں تمہیں اپنی بیٹی رجو سے ملواتا ہوں"۔ ساتھ ہی انہوں نے ہانک لگائی۔ "رجو، رجو! اری ادھر تو آ، دیکھ تیرے لئے بہن لایا ہوں"۔ لیکن جواب میں چولھا پھونکتی فضیلت تڑخ کر بولی۔

"ساتھ والوں کے گئی ہے۔ مل لے گی آکر، مت چلا"۔

"اچھا روٹی پکالی تو نے؟" انہوں نے بیوی سے پوچھا۔

"ہاں کھالے، اور ان چیتوں کو بھی کھلا دے"۔ آخری روٹی کو کلوں پر سینکتے ہوئے اس نے کہا۔ اور لالٹین کی روشنی میں سالن پلیٹوں میں نکالنے لگی۔

"آ بیٹی، روٹی کھاتے ہیں، چل بیٹا رشید"۔ کریم بابا نے کہا تو، رشید کو بھوک کا احساس ہوا۔ ورنہ بابا کی بیوی کی باتیں سن کر تو وہ اس احساس سے عاری ہو گیا تھا۔

بابا نے سکھی کو وہیں فضیلت کے قریب پیڑھی پر بٹھایا۔ اور خود بھی رشد کے ساتھ بیٹھ گئے۔ فضیلت نے تنک کر روتی اور سالن کی پلیٹیں ان کے آگے رکھ دیں۔

"لو کھالو، باوا کا مال ہے۔ کل کا اللہ مالک ہے"۔ سکھی کا ہاتھ منہ تک جاتا جاتا رک گیا۔ مگر بابا کی تھپکی سے وہ کھانے لگی۔ فضیلت بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ تو بابا انہیں بتانے لگے۔

. میرا بیٹا رفیق بھی تانگہ چلاوے ہے، آتا ہی ہو گا۔ اور رجو ہے ناں ایک مہینے بعد اس کی شادی ہو جاوے گی، پھر تو تو ہماری خدمت کرے گی۔ پھر فضیلت بھی تجھ سے خوش رہے گی"۔ بابا کی باتوں سے اسے کچھ ڈھارس سی بندھی۔ امید کے علاوہ اس کے پاس تھا بھی کیا۔ پھر

سب سے زیادہ فکر تو اسے رشید کی رہتی تھی۔ بابا کی روکھی سوکھی روٹی رشید کا پیٹ تو بھر سکتی تھی۔ خواہ پیٹ کی ضرورت بن کر ہی۔ ورنہ جلی ہوئی بو والا بدذائقہ کھانے کو کون کھاتا ہے۔ رشید نے بھی بمشکل نوالے اتارے تھے' فضیلت نے اپنے مزاج کی تلخی او تیزی بھی سالن میں بھردی تھی۔ کہاں آٹھ دس دن کے بی جی کے گھر کے مزے دار کھانے جنہیں کھاکر رشید تو جھوم اٹھتا تھا۔ اور باری باری ذائقے گنوا کر اس سے نام پوچھتا تھا۔ اب تو چاچی کے گھر والا حساب تھا' وہ سوچوں میں گم تھی۔ ایک نسوانی آواز پر چونکی۔

"بابا! یہ کون ہے؟"

"یہی تیری بہن سکھی ہے اور یہ رشید ہے تیرا بھائی۔ بالکل اپنے رفیق کی طرح۔" بابا نے محبت سے رجو کو ان کے بارے میں بتایا۔ رجو نے مزید ان سے کچھ نہیں پوچھا بس مسرت سے سکھی کو گلے سے لگا لیا رشید کو پیار کیا۔ ڈھیروں طمانیت بابا کے متفکر چہرے پر پھیل گئی۔ یہی توقع انہیں رفیق سے تھی۔ وہ جاہل ضرور تھا۔ مگر دھیمے اور نرم لہجے والا ہمدرد انسان۔ غربت اور جہالت کی بدنمائی نے اسے بدنما نہیں کیا تھا۔ وہ بالکل کریم بخش بابا کی طرح تھا۔ جب کہ فضیلت کو دکھ کچھ اس بات کا بھی تھا اٹھتے بیٹھتے وہ چیختی چلاتی رہتی۔ مگر ان تینوں میں سے کوئی اس کی بات کا جواب نہیں دیتا۔ شاید یہ تینوں جانتے تھے کہ مفلسی میں چڑچڑاہٹ کا عمل میں آنا ضرری ہے۔ خصوصاً" گھر چلانے والی عورت میں۔

"رجو! تو مجھے پسند آئی ہے"۔ سکھی نے پیار سے اس کے ہاتھ دبائے۔ کھل کھلا کے ہنس دی۔

"جھوٹ ہائے اچھی تو تو مجھے لگے ہے"۔ وہ صرف دکھ سے مسکرا کر رہ گئی۔ اس کو کیا بتاتی کہ میری شکل پر مت جا۔ میری نصیب دیکھے گی تو افسوس ہو گا۔

"بیٹا! یہ دونوں تھکے ہوئے ہیں۔ ایسا کہ صحن والی کھاٹ پر ان دونوں کا بستر کر دے"۔ کریم بابا کہتے ہوئے خود بھی کمرے میں چلے گئے۔ رجو بھی تیزی سے اٹھی اور کمر پر لاد کر جھلنگا سی چارپائی اندر لے گئی۔ پہلے اس کی پائنتی کسی۔۔ پھر بستر بچھایا۔ اور انہیں لے جاکر آرام کرنے کو کہا' خود بھی اپنا پلنگ کھینچ کر سکھی کی طرف لے آئی۔ اور لیٹتے ہی لگی باتیں

کرنے۔ بابا بھی تقریباً" سو چکے تھے۔ فضیلت تو ان سے بھی پہلے سوگئی تھی۔ رجو کو یہ جان کر دکھ ہوا تھا کہ سکھی دیکھ نہیں سکتی۔ روشنی کے بغیر اس کی آنکھیں کتنی خوبصورت تھیں۔

☆☆☆☆

سکھی نے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اپنے نصیب سے' اپنے حالات سے' اب چاہے فضیلت گالیاں دے یا مارے پیٹے وہ اف نہ کرے گی۔ اس سوچ نے اسے مصروف کر دیا۔ وہ رجو کے ساتھ مل کر گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ دن بھر وہ فضیلت کی بڑبڑاہٹ سنتی ضرور رہی مگر کچھ بولی نہیں۔ کام میں لگی رہی۔ شام کو دال بھی اس نے پکائی۔ روٹیاں ڈالنے سے رجو نے منع کر دیا۔ اور زبردستی اسے اٹھا کر خود پکانے لگی۔ رجو کی اس محبت پر اسے حمیدہ یاد آگئی۔ وہ رجو کی طرح واحد سہارا تھی۔ نہ جانے اب کہاں ہوگی؟ اسے میرے بارے میں اب شاید کچھ علم نہ ہو سکے گا۔

کتنے لوگ اسکی زندگی میں آئے تھے اور دور ہوگئے' پھر بے اختیار ہی اسے وہ مہکا مہکا جھونکا بھی یاد آگیا دل بے چینی سے کروٹیں لینے لگا۔ آخر لوگ مل کر بچھڑتے کیوں ہیں___؟ اور بچھڑتے بھی کچھ اس انداز سے ہیں کہ انسان انہیں یاد تو کرتا ہے مگر فراموش نہیں کر سکتا۔ سکھی کی پوری زندگی بھری ہوئی تھی۔ مل کے بچھڑنے والوں سے__۔ حساس دل کڑوی **کسیلی** ہربات یاد رکھے ہوئے تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے شعور میں کھوئی کھوئی سی خوشبو بھی رچ بس گئی تھی' جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا' جیسے دیکھا بھی نہ تھا پھر بھی جس کے ہاتھوں دو بار ذلت بھی اٹھائی تھی۔

دل کے کسی ایک گوشے میں ہوک سی اٹھی اور نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کے اس اضطراب کو کم کرنے لگی۔ جو اسے بے چین کرنے لگا تھا۔ تبھی بابا کی آواز پر وہ چونکی۔

"لڑکیو! جلدی جلدی صحن کا سامان سمیٹ لو۔ بارش آتی دکھے ہے" بابا تو یہ کہہ کر اندر چلے گئے اور وہ تیزی سے اٹھی۔ اور پلنگ پر پھیلے کپڑے سمیٹنے لگی۔ رجو بھی روٹیاں پکا چکی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ مل کر کام نپٹانے لگی۔

سردی زوروں پر تھی۔ ساتھ ہی ساتھ آسمان بادلوں سے ڈھکا تھا۔ کہیں کہیں بجلی بھی چمک اٹھتی تھی' بادلوں کی مسلسل گڑگڑاہٹ ثبوت تھی اس بات کا کہ بارش ہو کر رہے گی۔ اور

بالآخر تھوڑی دیر میں ہی جل تھل ہوگئی۔ وہ سب بستروں میں دبک گئی' شدید سردی کے سبب ہر چیز برف لگتی تھی بستروں کی گرمی نے جسموں کو آرام پہنچایا تو سب ہی سوگئے سوائے سکھی کے جو رشید کے سر میں انگلیاں پھیرتی ہوئی مسلسل سوچوں کے جنگل میں بھٹک رہی تھی۔ اس کے اردگرد پوری زندگی کے حالات و واقعات پھیلے ہوئے تھے' جن کی چھبن اور کسک سے اس کی آنکھیں غمگین ہونے لگیں۔

☆☆☆☆

"چاند! یاد سے ائیرپورٹ چلے جانا"۔ بی جی نے منتظر حسن کو سلائیس دیتے ہوئے کہا۔ جواباً انہوں نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"مجھے تو بیلا کے آنے کی بہت خوشی ہو رہی ہے" منتظر نے چائے کا لمبا گھونٹ بھرنے کے بعد بے خیالی میں ان کی بات سن کر پوچھا۔

"وہ کس لئے؟" سخت لاپرواہی تھی انداز میں۔ بی جی نے محبت پاش نظروں سے دیکھا۔

"ارے بھئی تیری فکر لگی ہوئی ہے۔ بیلا دیکھی بھالی بچی ہے' بس تیری رضامندی چاہیے۔ سلائیس کھاتے کھاتے جیسے ان کا منہ بند ہو گیا ہو۔ بی جی کی بات جو سمجھ میں آئی تو دل کی دھڑکن جیسے ایک مقام پر رک سی گئی۔ وہ ان کی باتوں کا جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ بی جی ماضی میں کھوگئیں۔

"کل کی سی بات لگتی ہے جب تمہارا باپ اور احمد اس گھر میں دھماچوکڑی مچاتے تھے۔ دونوں میں اتنا گہرا پیار تھا کہ رات کو ہی ایک دوسرے علیحدہ ہوتے تھے۔ احمد بیچارا تنہا تھا۔ بوڑھی نانی کے پاس رہتا تھا۔ زیادہ تر وقت دونوں اکٹھے گزارتے تھے۔ مجھے بھی ان میں سے ایک نظر نہ آتا تو بے چین ہو جاتی۔ اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی دونوں نے اکٹھے تعلیم مکمل کی۔ پھر میں نے تمہارے باپ کی شادی کی تو ہفتہ بعد احمد کی شادی ہوگئی۔ پھر تو اور زیادہ محبت اور پیار ان دونوں میں ہوگیا۔ خدا نے احمد کو اچھی سسرال دی تھی' جنہوں نے بیٹی اور داماد کو گھر ہی رکھ لیا۔ وقت گزرتا رہا مگر تعلقات میں کمی نہ ہوئی۔ پھر تم پیدا ہوئے۔ احمد کے ہاں بیلا پیدا ہوئی تم دونوں میں دوستی تھی مگر اتنی نہیں جتنی احمد اور منظر حسن کے درمیان

تھی۔ بیلا بیچاری تو تمہارے آگے پیچھے پھرتی تھی مگر تم منہ پھلائے میری گود میں آ چھپتے۔ بچپن بھی عجیب ہوتا ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ نو دس سال کے تھے اور بیلہ سات آٹھ سال کی جب میرا گھر برباد ہوا۔ میرا منظر' میری بہو دنیا سے چلے گئے۔ احمد پاگل سا رہنے لگا۔ ایسے میں اس کی ساس سسر نے باہر جرمنی بھیج دیا' اور تب سے وہ باہر رہ رہا ہے' وہیں بیوی مرگئی۔ بیٹی جوان ہوگئی"۔ بی جی نے پورا ماضی دہرا کر طویل سانس لیا۔ منتظر حسن بھی ان کی بات پوری توجہ سے سن رہے تھے۔ وہ خاموش ہوئیں تو بولے

"بی جی! اب میں چلتا ہوں واپسی پر بیلا کو لیتا آؤں گا۔"

"چاند بیٹے! تیرے سہرے کا ارمان ہے' اب تو مان جا"۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں التجا تھی۔ وہ محبت سے ہنسے اور ان کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگالئے۔

"آپ کا ارمان پورا ضرور ہوگا مگر اس کے لئے بیلا ویلا کی شرط نہیں چلے گی"۔ مذاق مذاق میں انہوں نے مدعا بیان کر دیا تھا۔ اپنے دل سے چھپے انجانے جذبے کا اظہار کر دیا تھا حسن کو نہ ہی وہ کوئی نام دے سکے تھے اور نہ ہی جھٹلا سکتے تھے وہ سرگرداں تھے اپنے اس جذبے کے جزیرے میں' مگر منزل نہیں مل رہی تھی۔ ان کے مضبوط دل میں کہیں تو دراڑ پڑی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ مسلسل اس اجنبی اندھی لڑکی کے بارے میں سوچے چلے جا رہے تھے اب تک تو اس سوچ کو انہوں نے اپنی زیادتی کا نام دیا تھا۔ اور معافی کے خواہش مند تھے مگر نہ وہ انہیں مل رہی تھی اور نہ وہ معافی طلب کر پارہے تھے یہی کسک میٹھی میٹھی خواہش کو جنم دے رہی تھی جس سے وہ دامن بچانا بھی چاہتے تھے۔ مگر جونہی تصویر نظروں کے سامنے لاتے۔ دل پھڑپھڑانے لگتا۔

انہیں بالکل ایسا لگتا کہ جیسے اس نے انہیں معاف کر دیا ہو' اس کی خاموش تصویر میں نہ گلا تھا اور نہ معافی۔ مکمل سکوت اور مدھر مسکان۔ جو ہر ایک نئی تڑپ انہیں بخش دیتی۔ اب تو یہ معمول بن گیا کہ دن میں جتنی مرتبہ سڑکوں پر نکلتے اسے تلاش کرتے رہتے۔ رات کو اس کی تصویر سے باتیں کرنے لگتے' کبھی ندامت سے معافی طلب کرتے اور کبھی تھکان بھرا گلہ کر ڈالتے۔

"ارے اچھی معصوم لڑکی! تم کہاں کھو گئی ہو؟ مجھے جرم کی آگ میں جلتا دیکھو۔ میں خود کو اب تک معاف نہیں کر سکا ہوں۔ تم جیسی لڑکی نے مجھے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے ہے' جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گی شاید میں بے چین رہوں۔ خدا کے واسطے ایک بار مل جاؤ کہ میں تلافی کرنی چاہتا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں؟ تم میرے حواسوں پر چھاگئی ہو' کیا نام ہے اس جذبے کا' بولو۔ جواب دو۔ وہ تصویر سے باتیں کرتے کرتے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتے۔

اس وقت بھی وہ سخت مضطرب اور بے چین دکھائی دے رہے تھے۔

"کیا بات ہے چندا' طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری"۔ بی جی ہراساں سی ہوگئیں۔ وہ چونکے۔

"نہ نہیں۔ میں ٹھیک ہوں بی جی"۔ مگر ان کی پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔

"ارے بیٹے! میں تو اپنی تنہائی سے تنگ آکر تمہاری شادی کا سوچا ہے۔ ساری عمر تو کنوارا نہیں رکھنا تمہیں"۔ وہ محبت سے بولیں ___ وہ دھیرے سے مسکرا دیئے۔

"ہاں' ہاں کیوں نہیں لیکن ابھی نہیں کچھ وقت دے دیجئے"۔ وہ پھر گھورنے لگیں۔

"ارے ستائیس کے ہوگئے ہو۔ کیا بڑھاپے میں گھر بساؤ گے"۔ ان کے لہجے میں ڈانٹ موجود تھی۔ وہ ہنسے اور بریف کیس اٹھا کر کھڑے ہوگئے۔

"بی جی مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا"۔ انہوں نے شرارتاً کہا۔ بی جی نے سر تھام لیا۔

"لیکن بوڑھے سے سر کون پھوڑے گی؟" وہ جھنجھلا گئی تھی۔ وہ ایک لمحے کو رکے پھر مسکرا کر بولے۔

"ایک بہت معصوم اور پیاری سی لڑکی بالکل حور جیسی"۔

یہ کتنی بڑی بات تھی جو آج وہ کہہ بیٹھے تھے۔ یہیں سے وہ پیمان وفا کے مرتکب ہوتے تھے۔ کیونکہ اس انجانے جذبے کو انہوں نے عنوان دے دیا تھا۔ کہ وہی ان کی زندگی کی ہم سفر بنے گی۔ اسی طرح وہ تلافی کر سکتے تھے۔ کہاں تو وہ عرصے سے اس جنگ میں مصروف تھے۔ لیکن آج کتنی عجلت میں انہوں نے فیصلہ کر ڈالا تھا۔ شاید اس ڈر سے کہ کہیں بیلا کوئی رنگ نہ چھوڑ دے ان پر ___ اس سے پہلے ہی اپنی سوچ کا تعین کر لینا ضروری ہے۔ بہر حال وہ حد درجہ مطمئن ہوگئے تھے' اس لئے چہرہ کھلے ہوئے پھول کی مانند مسکرا رہا تھا۔

بی جی نے دل ہی دل میں ان کی بلائیں لے ڈالیں۔ اور خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

پھر بیلا آگئی۔

"تم دونوں باتیں کرو۔ میں رات کے کھانے کے لئے بندوبست کرتی ہوں"۔ بی جی نے بیلا اور منتظر حسن کو مخاطب کیا تو وہ اٹھلا کر بولی۔

"بی جی آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔ میں خود بنا لیتی ہوں"۔ منتظر حسن نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ بلکہ وہ اسی طرح خاموش رہے جس طرح دو گھنٹے پہلے سے تھے۔ ائیر پورٹ سے گھر تک سوائے رسمی سی سلام دعا کے انہوں نے کوئی بات بیلا سے نہیں کی تھی' بیلا سخت حیران تھی۔ وہ تو کچھ اور مقصد لے کر آئی تھی۔ منتظر حسن لاتعلقی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس وقت بھی اس نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کھانا بنانے کی بات کہی تھی۔ مگر گہری خاموشی پر بی جی نے اس کی بات کا جواب دیا۔

"بیٹا! نہیں' تم تھکی ہوئی ہو۔ گپ شپ کرو' کام تو ہوتا ہی رہے گا"۔ بی جی کی بات پر اس نے مزید خلوص سے کہا۔

"جہاز میں مجھے تھکاوٹ بالکل نہیں ہوئی۔ بلکہ انسان انجوائے کرتا ہے کیوں چاند؟" اب کی مرتبہ وہ چونکے تھے۔ کیونکہ بیلا کی کوشش تھی کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ لہٰذا انہیں ٹوٹا پھوٹا جواب دینا ہی پڑا۔

"ہوں' ہاں' بالکل"۔ ان کی اس رائے پر وہ جھنجھلا گئی۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا"۔ وہ خاموش رہے۔ جب کہ بی جی کو ہنسی آگئی۔

"تم دونوں لڑو۔ ویسے چاند میاں اب راہ راست پر آئیں گے"۔ بی جی نے کچن کا رخ کیا۔ تو وہ بال جھٹکتی ہوئی انکے قریب آگئی۔

"سنئے چاند صاحب! آپ بی جی کی مشکل حل کیوں نہیں کر دیتے؟" عجیب قسم کا سوال تھا۔ انہوں نے بھنوئیں چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔ بلکہ پہلی مرتبہ بغور دیکھا۔ متناسب دلکش سراپا۔ شانوں تک لہراتے سنہری بال۔ شربتی کٹ دار آنکھیں۔ ستواں ناک۔ کھلا سرخ و سفید رنگ۔ وہ ہر لحاظ سے مکمل نظر آ رہی تھی۔ تمام کیل کانٹوں سے لیس۔ مسحور کن حسن

اوپر سے جدید تراش خراش کا لباس ہلکا ہلکا میک اپ اور دلنشیں ادائیں۔ انہیں دھیان ہی نہیں رہا کہ ان کی نظریں جم سی گئی ہیں اسے اپنے پر غرور سا آگیا۔ لجاجت سے بل کھا کر بولی۔

"ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟" وہ چونکے اور سوچنے لگے بیلا میں کوئی کمی نہیں۔ مگر جو میرے من مندر میں براجمان ہے۔ وہ بھی تو لاکھوں میں ایک ہے۔ کیا ہوا جو آنکھوں کے دیئے بجھے ہوئے ہیں۔ مجھے اس کے سوا کوئی نہیں بھا سکتی۔

"اس نے ان کی کلائی کو چھوا۔ "پلیز چاند" کہاں کھو جاتے ہو؟"

"ک ------ کہیں نہیں۔ بس ذرا سر میں درد ہے۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں"۔ انہوں نے آہستگی سے کلائی آزاد کرائی۔ اور تیز قدم اٹھاتے باہر نکل گئے۔

اور بیلا سوچتی رہ گئی۔ کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ وہ چاند تو نہیں ہے جسے تصور میں اس نے بچپن سے بسا رکھا ہے، جسے اپنے خوابوں میں سجا کر وہ یہاں آئی ہے۔ اس کی خاموشی تو ٹوٹتی ہی نہیں۔ اسے روایتی شرم بھی نہیں کہا جا سکتا۔

منتظر حسن! میں تو گلے تک تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔ تمہاری جدائی برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ تمہیں خود کو بدلنا ہو گا۔ میں تمہارے من میں محبت کی جوت جگاؤں گی' اس مصمم ارادہ لے کر وہ باہر کچن کی طرف آگئی۔

"رات کھانے پر منتظر حسن نے کھانا نہ کھانے کا اعلان کر دیا۔ بی جی دلار سے بولیں۔

"اتنا بڑا ہو گیا۔ مگر کھانے میں لاپرواہی ابھی تک موجود ہے"۔ بیلا اداس سی ہو گئی۔ اسے کھویا کھویا دیکھ کر بی جی نے پیار سے کہا۔

"ارے ہم تو کھانا کھائیں، پھر میں اس کے کان کھینچوں گی"۔ بی جی نے بیلا کے خیال سے کھانا شروع کیا۔ ورنہ منتظر حسن کے بغیر وہ کھانا کھا لیں ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر طبیعت کی خرابی کے باعث وہ کھانا نہ کھاتے تو وہ بھی بھوکی رہتیں یہی حال منتظر حسن کا تھا۔ وہ بھی بی جی کے بغیر دانہ منہ میں نہ ڈالتے تھے۔ آج بھی ہمیشہ کی طرح انہوں نے سردرد کی وجہ سے کھانے سے انکار کیا تو بی جی کا دل تو کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر بیلا بھی شاید اکیلی کھانا نہ کھاتی۔ پھر وہ آج ہی تو آئی تھی۔ میز پر اکیلے چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔ اپنا خیال بھول کے زیادہ وقت وہ بیلا کی

طرف ڈشز بڑھاتی رہیں' وہ مسکرا مسکرا کر کھاتی رہی۔ کیونکہ اسے بی جی کی شفقت ہمیشہ سے پسند تھی۔ اپنی ماں کی کمی وہ بی جی میں پوری کر لیتی تھی۔

"کھانے کے بعد بی جی نے ٹرے میں کھانا رکھا اور منتظر حسن کے کمرے کی طرف مڑنے ہی کو تھیں کہ بیلا نے روک لیا۔

"لائیے بی جی کھانا میں لے جاتی ہوں"۔ اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے۔

"ارے نہیں بیٹی۔ وہ ضدی تمہاری بات نہیں سنے گا------"۔ بی جی نے مصنوعی خفگی سے کہا"۔ مجھے ہی جانا پڑے گا"۔

"کوشش کر کے دیکھتی ہوں ورنہ آپ کی خدمات حاصل کر لوں گی"۔ اس نے ٹرے پکڑی۔ اور ان کے کمرے کی جانب مڑ گئی۔

"منتظر حسن اپنی سوچوں میں گم تھے۔ وہ دروازے پر رکی۔

"ٹک ٹک" ۔ اس نے آہستہ سے دستک دی۔ اندر اپنی سوچوں میں کھوئے منتظر حسن چونکے۔ ہاتھ میں دبی تصویر تکیے کے نیچے رکھی اور گونجدار آواز میں اندر آنے کو کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ میرے سر میں درد ہے بیلا" اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے دیکھ کر انہوں نے کہا۔ وہ مسکراتی ہوئی قریب آگئی۔

"منتظر حسن صاحب! آپ کو پتہ ہے میں کتنی دور سے آئی ہوں؟" گلہ اس کی زبان کی نوک پر آگیا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی تھی۔

"جی تو کیا آپ میرے لئے آئی ہیں" انہوں نے ازراہ مذاق کہا۔ تو چند ثانیے تو وہ انہیں غور سے دیکھتی رہی۔ جب انہوں نے نظر چرائیں تو وہ بولی۔

"اگر ہاں کہوں تو____؟"

"تو کیا، بڑی مہربانی اس عزت افزائی کی" وہ گڑبڑا کر بولے۔ حاضر دماغ تو شروع سے ہی تھے۔ اس کی بات کا مطلب سمجھ کر انہوں نے کس خوبصورتی سے بات ٹال دی تھی وہ گردن جھٹک کر رہ گئی۔

"اچھا خیر، کھانا کھالو، پھر بی جی کے پاس بیٹھ کر گپ شپ کریں گے"۔ وہ خوشدلی سے بولی۔

"بھئی کھانے کو میرا دل نہیں چاہ رہا_ اور --------؟"

"اور کہہ دو گپ شپ کو طبیعت نہیں چاہ رہی"۔ وہ اس کا جملہ مکمل کرتی ہوئی منہ موڑ کر بیٹھ گئی تو وہ مجبوراً ہنس کر کھانے لگے۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ بیلا سے یہ بے اعتنائی اچھی نہیں۔ وہ خوش ہو گئی۔ کھانے کے بعد وہ زبردستی انہیں لے کر بی جی کے کمرے میں آگئی۔ پھر وہ اپنا اٹیچی کھول کر جو تحائف ان لوگوں کے لئے لائی تھی دکھانے لگی۔ اور وہ سخت بیزاری کے عالم میں دیکھتے رہے۔ جیسے جسم تو یہاں تھا مگر دماغ کہیں اور -------- جس کے بارے میں وہ خود بھی اتنا جانتے تھے کہ انجانے میں کی گئی زیادتی نے انہیں اسیر کر لیا ہے۔ اور وہ اسے تلاش کر رہے ہیں جسے کھو دینے والے بھی وہ خود ہیں۔ اب اسی معصوم قاتل ادا۔ پری وش کی تلاش تھی" کاش مل جائے کہیں بھی کسی حال میں۔

بیلا نے بال جھٹک کر ہلکے سے غصے کا اظہار کیا۔ کیونکہ وہ مسلسل ایک سوٹ پیس ہاتھ میں پکڑے اسے دکھا رہی تھی۔ اور وہ انجانے سپنوں میں کھوئے تھے۔

"عجیب بات ہے چاند صاحب! آپ بیٹھے بیٹھے کھو سے جاتے ہیں؟" اس کی بات پر وہ واپس لوٹ آئے۔ بی جی زور سے ہنس پڑیں۔

"بیلا بیٹی! اس کی پرواہ مت کرنا، کیونکہ اسے تو گھر میں بھی کام یاد رہتا ہے۔ دفتر میں کھویا رہتا ہے"۔ لیکن بی جی کی اس کی وضاحت کو ماننے سے بیلا کے دل نے انکار کر دیا۔

"لیکن بی جی بات کچھ اور لگتی ہے"۔ جملہ معنی خیز تھا۔ چبھن لئے ہوئے تھا۔ شک شبہ میں ڈوبا ہوا تھا، وہ دھیرے سے ہنس دیئے۔

"بھئی یہ کچھ اور سے کیا مراد ہے تمہاری --------؟" انہوں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ نظریں چرا گئی۔

"کیا تمہیں نہیں معلوم؟" اس نے الٹا سوال دہرایا۔ تو وہ کچھ سنجیدہ سے ہو گئے۔ بھلا ایسے کیا بتاتے کہ کچھ اور ہی تو ان کی متاع حیات ہے۔

"اب پھر چپ لگ گئی"۔ وہ کہتی ہوئی اٹیچی بند کرنے لگی۔ اس کی بات کا رخ بدلنے کو بی جی بولیں۔

"بیلا بیٹی! اب تم آرام کرو۔ چاند کے برابر والا کمرہ تمہارے لئے صاف کرا دیا ہے"۔ اور وہ انکی طرف اچٹتی سی نظر ڈالتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆☆

وہ بڑی دیر سے چولھے کی راکھ کرید رہی تھی۔ ارد گرد سے بیگانہ زندگی کی ناہمواریوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ رجو کپڑے دھو کر اس کے قریب آگئی۔ فضیلت اپنی سی ملنے والے کے ساتھ بازار گئی تھی۔ بیٹی کے جہیز کے لئے چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدنے۔ رفیق کا گھوڑا صبح سے اونگھ رہا تھا۔ اسی خیال سے رفیق نے چھٹی کر لی تھی۔ چولھے سے ذرا فاصلے پر پلنگ پر بیٹھا روٹی کھا رہا تھا جو سکھی نے گرم گرم پکا کر دی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہے سکھی؟" رجو نے پیار سے پوچھا۔

"کچھ نہیں رجو، بس بعض اوقات یہ سوچیں بھی ماں جیسی نرم گرم آغوش بن جاتی ہیں۔ اور مجھ جیسا تھکا ٹوٹا انسان کچھ دیر کو منہ چھپا کر اسی میں سکون تلاش کرنے لگتا، اتنا درد اور گہرائی تھی اس کی بات میں کہ رفیق کا ہاتھ پلیٹ میں ہی رک گیا۔ نہ جانے کیوں اس نے چونک کر سکھی کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا چہرہ تو نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ اس طرف پشت تھی، چہرہ نہ دیکھتے ہوئے بھی اس کے کرب کا اندازہ کر چکا تھا۔ بے اختیار وہ سوچنے لگا کہ "اس بدنصیب سے اماں کو اللہ واسطے کا بیر سا کیوں ہے؟" وہ بہت کم گھر میں رہتا تھا۔ او بمشکل چار پانچ مرتبہ ہی سکھی سے اس کی بات ہوئی تھی۔ البتہ رشید سے خوب گپ شپ کرتا تھا۔ رشید اب سوتا بھی اسکے ساتھ تھا۔ سکھی اس کے آگے کھانا رکھ دیتی تو وہ خاموشی سے کھا لیتا، اس نے چھچھورے نوجوانوں کی طرح سکھی کے لئے مشکلات پیدا نہیں کی تھیں۔ اس کی شرافت اور عظمت کی سکھی بھی دل ہی دل میں قائل تھی۔

"سن سکھی! تو اب بھی پریشان رہتی ہے"۔ رجو نے سکھی سے سوال کیا تو رفیق بھی خیال سے باہر نکلا۔ سالن ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس نے ہاتھ پکڑا نوالہ منہ میں رکھا اور برتن سمیٹ کر رجو کی طرف بڑھا دیئے۔

"تجھے میری فکر کیوں لگی رہتی ہے؟" سکھی نے ہنس کر کہا۔

"اس لئے کہ اماں تجھ سے اچھا سلوک نہیں کرتی۔ میرے بعد تو بالکل اکیلی رہ جائے گی"۔ رجو کا گلا رند گیا تھا۔ سکھی دکھ سے ہنسی اور اسے گلے سے لگالیا۔

"کیوں؟ تیرے بعد میں اکیلی کیسے رہ جاؤں گی بھلا سب لوگ تو ہیں اور پھر اماں تو چھت ہیں میری، مجھے ان سے کوئی خوف نہیں، کوئی شکایت نہیں"۔ رجو خاموش ہوگئی۔ رفیق کے دل میں اس کی عظمت نے گویا جڑ پکڑلی۔

"تو اللہ کرے ہمیشہ خوش رہے"۔ سکھی نے دعا دی۔ رجو کو ایسے لگا جیسے اس وقت وہ کسی پاتال سے بول رہی ہو۔

پھر وہ دونوں بھی چپ ہوگئیں۔ رجو اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ جب کہ وہ خود بھی اپنی بے مقصد زندگی کے بارے میں الجھ گئی تھی۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مقصد نہیں۔ کوئی جواز نہیں خزاں رسیدہ پتے کی کیا حقیقت ہوتی ہے۔ ہنہ سکھی کیوں پھر بے مقصد زندگی کی کتاب کے ورق الٹتی ہو۔ تمہارا ماضی، حال اور شاید مستقبل بھی ایک جیسا ہے۔ کورا، اور سیاہ، کسی احساس کے سہارے زندہ ہو؟ کون منتظر ہے تمہارا؟ اسکے دل نے سوال کیا۔ اور وہ دماغ میں بسی اس معطر خوشبو کو ٹٹولنے لگی کہ چھپی ہے یا وہ بھی خوش بختی کی جھلک دکھا کر نکل گئی ہے مگر دماغ کا آنگن مہک رہا تھا۔ اسے حیرت سی ہوئی۔ سکھی کیوں تو اس احساس کو کھوجنے لگتی ہے؟ بھلا خوشبو سے جلتی دھوپ کا کیا تعلق؟ میرا کوئی نہیں۔ کوئی نہیں؟

اسے کیا معلوم کہ وہ خوشبو کا جھونکا خود گام گام متلاشی ہے بھٹکتا پھر رہا ہے۔ سب کچھ ہونے کے باوجود بے چین و مضطرب۔ انگ انگ میں تڑپ لئے پہروں اس کی تصویر سے باتیں کرتا ہے۔ بند کمرے میں اس کا احساس سے ہمکلام رہتا ہے۔ کوئی تعلق تو ہے اس سے۔

اس وقت بھی وہ کمرے میں تھے۔ ان کی پسندیدہ غزل کا سحر طاری تھا۔ ہولے ہولے وہ خود بھی گنگنا رہے تھے۔

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
وہ تو صدیوں کا سفر کرکے یہاں پہنچا تھا
تو نے جس شخص کو مڑ کے کبھی دیکھا بھی نہیں

اضطراب حد سے بڑھ چکا تھا۔ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ احساس شرمندگی اندر ہی اندر کھائے جارہا تھا۔ بے اختیار وہ جھنجلا کر بڑبڑانے لگے"۔ ظالم لڑکی! ملتی بھی نہیں تاکہ میں شرمندگی کے احساس کو مٹاسکوں۔ معافی مانگ سکوں۔ اے گم شدہ اچھی لڑکی! ایک بار مل جاؤ۔ سزا دو مجھے تڑپاؤ مجھے، اس ہاتھ کو کاٹ ڈالو۔ اس زبان کو نوچ ڈالو"۔ سخت بے چین ہوکر ہاتھ پختہ دیوار سے دے مارا۔ ایک درد اٹھا۔ درمیان والی انگلی سائیڈ سے پھٹ گئی خون تیزی سے بہہ نکلا۔ درد کی شدت سے انہوں نے ہونٹ بھینچ لئے دوسرے ہاتھ سے کلائی تھام لی۔ اور باتھ روم میں ہاتھ دھونے کے لئے گھس گئے۔ لہو قطرہ قطرہ پانی میں حل ہو رہا تھا۔ اور انہیں جیسے سکون مل رہا تھا۔ احساس جرم ہلکا ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد باہر آگئے۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ زخم بہت گہرا تھا۔ تبھی تو کمرے میں موجود بیلا تیزی سے ان کے قریب آئی اور چلائی۔

"ہائے یہ کیا ہوگیا۔ کیسے زخم آیا؟" وہ دھیرے سے مسکرا دیئے۔

"بس ویسے ہی۔ مجھے تو خود علم نہیں۔" "ان کے اس قدر بے پرواہی پر وہ تیزی سے بولی۔

"منتظر حسن صاحب! نہیں معلوم کہ آپ کس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ بات کچھ کرو۔ جواب کچھ دیتے ہو۔ خون بہہ رہا ہے اور تم مسکرا رہے ہو؟"

"تو کیا کروں" اس قدر معصومیت سے پوچھا گیا۔ کہ وہ جھلا گئی تھی۔

"چلو میرے ساتھ ڈاکٹر کے ___" اس نے ان کا ہاتھ پکڑا۔ اور تیزی سے چل پڑی۔ پھر وہ بولے۔

"ایک منٹ، ٹیپ آف کردوں" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر آف کی تو وہ بیزاری سے بولی۔

"سخت بور، نہ جانے کیوں اس غزل کے عشق میں گرفتار ہو"۔ اور وہ کھوئے کھوئے سے اس کے ساتھ چل پڑے۔

ان کی انگلی پر تین ٹانکے آئے تھے۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیں بھی دی تھیں۔ وہ مطمئن سے تھے۔ بیلا ہی ڈاکٹر سے بات چیت کرتی رہی تھی۔

واپسی پر زبردستی اسٹیرنگ انہوں نے سنبھال لیا تھا' بیلا نے خوبصورت سفید ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

"اللہ جانے' کتنے خوبصورت ہاتھ میں نقص پڑ گیا' نشان برے لگیں گے" انہوں نے دھیرے سے مسکرا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اور بولے۔

"تمہیں کیا معلوم یہ کتنے حسین ہو جائیں گے' جتنا بڑا جرم اس نے کیا تھا۔ یہ سزا بہت کم ہے"۔ بیلا کے پلے کوئی بات نہیں پڑی۔ وہ منہ بنا کر بولے۔

"فلسفی تو تم بالکل نہیں تھے۔ نہ جانے کب سے فلسفہ بگھارنے لگے ہو"۔ اور ان کا قہقہہ فضا میں تحلیل ہو گیا۔ نہ وہ زخم کی وجہ بتا سکتے تھے اور نہ ہی قہقہے کا سبب یہ دونوں ان کے اختیار سے باہر تھیں۔ صرف اتنا جانتے تھے کہ آج کسی حد تک انہوں نے اپنے گستاخ ہاتھ کو سزا دے ڈالی تھی۔ یہ طمانیت ان کی روح تک میں اتر گئی تھی۔ تبھی تو وہ دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔

بیلا انہیں کمرے تک چھوڑ کر پلٹی تو وہ پھر اپنی پسندیدہ غزل میں کھوئے ہوئے تھے' چہرے کے اتار چڑھاؤ سے پتہ چلتا تھا کہ کوئی وابستگی ہے اس غزل سے یہ غزل کسی جذبے کی ترجمانی کرتی ہے۔ تبھی تو وہ ہروقت یہی سنتے تھے' یہی گنگناتے تھے۔ اس نے جھٹکے سے ٹیپ آف کر دیا۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔

"کیا وحشت ہے' اتنی تکلیف میں بھی تم لاپرواہی سے اس غزل میں کھوئے ہو"۔ وہ تقریباً" چڑ کر بولی۔

"بیلا! بہت تھک گئی ہو' جاؤ جا کر سو جاؤ"۔ انہوں نے دھیرج سے کہا۔

"تاکہ تم یہ غزل سن سکو"۔ اس نے غصے سے کہا۔

"تمہیں کیا اعتراض ہے؟" وہ تیکھے لہجے میں بولے۔

"ہے۔ مجھے اس غزل کی پسندیدگی کی وجہ بتاؤ"۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

" ہربات کی اہمیت اور وجہ آدمی کے لئے مختلف ہوتی ہے' میری پسند تمہاری پسند نہیں ہو سکتی"۔ انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا اور رخ موڑ کر لیٹ گئے۔ بیلا شانے جھٹکتی ہوئی کمرے کی لائٹ آف کر کے باہر نکل آئی۔ بی جی کو اس حادثے کی ہوا تک نہ لگنے دی تھی۔

رجو کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ آئندہ جمعہ کو اس کی رخصتی تھی۔ وہ بیاہ کر دور کی خالہ کے ہاں جا رہی تھی۔ تاریخ طے ہوتے ہی گھر میں شادی کی تیاری زور پکڑ گئی تھی۔ ویسے تو غریب گھرانوں میں جو ہوتا ہے وہی کچھ ہو رہا ہے۔ مگر شادی میں مصروفیت ہونا ضروری بات ہے۔

بابا' سکھی اور رشید کے لئے ایک ایک جوڑا نیا لائے تھے۔ سب کو خوشی ہوئی تھی مگر فضیلت ہمیشہ طرح بڑبڑانے لگی تھی۔

یہ حیرانی کی بات تھی کہ وہ سکھی کے دوپٹے کے لئے گوٹ کناری لائی تھی۔ جسے رجو نے بڑی تیزی سے لگا دیا تھا۔ سکھی بری طرح مصروف تھی۔ پورا گھر کا انتظام اس نے سنبھال رکھا تھا' صبح فجر کے وقت اٹھتی اور رات آخری پہر پلنگ سے کمر لگتی رجو اس کا ہاتھ بٹانا چاہتی تو وہ غصے سے ڈانٹ دیتی۔ رجو مایوں بیٹھی تھی۔ کوئی زیادہ کنبہ برادری نہیں تھی ان کی' بس گنے چنے رشتہ دار تھے۔ جو شادی میں شرکت کی غرض سے آنا شروع ہو گئے تھے۔

سکھی ہر آنے والے کے لئے پوری طرح خود کو تیار کرتی کیونکہ سمجھتی تھی کہ وہ اس گھر میں اضافہ ہے۔ ہر شخص اس کے بارے میں دریافت کرے گا۔ اسی بناء پر اس نے ذہنی طور پر خود کو آمادہ کیا ہوا تھا۔ تبھی فضیلت کی ممانی نے رجو کی رسم والے دن آتے ہی ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہہ دیا تھا۔

"اری فضیلت! تو اپنے فرض سے فارغ ہو گئی___" فضیلت نے نہ سمجھتے ہوئے انکی طرف دیکھا۔ برتن صاف کرتی سکھی کے کان کھڑے ہو گئے۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟" انہوں نے تنک کر پوچھا۔

"ممانی! مگر کہنا کیا چاہوے ہے" فضیلت اپنا دوپٹہ اوڑھتی ہوئی بولی۔

"اری میرا مطلب ہے کہ بیٹی بیاہ کر جا رہی ہو اور بہو تو پہلے ہی لے آئی۔ ان کا اشارہ صاف سکھی کی طرف تھا۔ وہ کانپ اٹھی' جب کہ فضیلت نفرت سے بولی۔

"چھوڑ ممانی نوچ کیا۔ یہی اندھی ماجور (معذور) پھکڑ رہ گئی ہے میرے رفیق کے لئے"۔ جلے کٹے ایسے الفاظ تھے کہ سکھی چاہنے کے باوجود آنسو نہ روک سکی۔ کیسی بے تکی باتیں تھی جو وہ سننے پر مجبور تھی۔

"تو پھر اس جوان چھوکری کو کیوں رکھا ہوا ہے۔ گھر میں جوان چھورا ہے"۔ ممانی کا مطلب اسے آوارہ بد چلن ثابت کرنا تھا۔ یا پھر انہیں اپنی ثریا کے مستقبل کی فکر تھی۔

"میں کب چاہوں گندے خون کو رکھنا' پر رجو کا باپ دماغ سے ہلا ہوا ہے"۔ فضیلت نے بڑی لاچارگی کا مظاہرہ کیا' چھن سے کچی کانچ کی پلیٹ ٹوٹ گئی۔ بالکل اس کے دل کی طرح فضیلت نے مڑ کر اس کی چوٹی کھینچ ڈالی۔ وہ سسکاری بھر کے رہ گئی۔ نہ جانے اسے کتنی مار پڑتی کہ رفیق آنکلا اور اس نے ماں کو سمجھایا ممانی آنکھیں گھماتی ہوئی دوسری طرف چلی گئیں اور سکھی اپنی بے بسی پر ماتم کرنے لگی۔ گھنٹہ بھر ساون بھادوں کی مانند وہ روتی رہی' پھر ہمیشہ کی طرح آنکھوں کے سوتے خشک ہوگئے۔ وہ پر سکون سی ہوگئی۔ یہی اس وقت کا تقاضا تھا۔ مہمانوں کی موجودگی میں اپنی طرف رحم طلب نظریں اٹھوانا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی رجو' بابا اور خصوصاً" رشید کو دکھی کرنا چاہتی تھی۔ آنکھیں پلو سے رگڑ کر وہ پھر ربورٹ کی طرح کام میں جت گئی۔ اسے پتہ بھی نہیں لگا کہ ایک کونے میں کھڑے رفیق کے دل میں کیسے کیسے جذبے سر اٹھانے لگے تھے۔ اس کی محرومی اور بے بسی کو ختم کرنے کے لئے کیسی پلاننگ وہ کر رہا تھا۔ مگر اسے ان باتوں کی کیا خبر___؟

رجو کی رسم میں تو اس کی شرکت نہ ہو سکی۔ زیادہ وقت کام میں لگی رہی فارغ ہوئی تو فضیلت کے جملے ساعت سے ٹکرائے۔ وہ دل کا درد چھپا کر صحن کے ایک کونے میں چھپی رہی۔ اندر کمرے سے ڈھولک کی آواز بھی آئی۔ شوخ گیتوں اور چھنکتی پائل بھی اس نے سنی مگر وہ اندر جا نہیں سکی۔ رشید کسی کام سے جو صحن میں آیا تو اس طرح سوگوار سا بیٹھا دیکھ کر اس کے قریب آ گیا۔

"کیا بات ہے باجی؟" رشید کے پوچھنے پر وہ ہکلانے لگی۔

"ک ------ کچھ نہیں بس طبیعت گھبرا رہی تھی"۔ اس نے صاف بہانہ بنا دیا۔

لیکن رشید ہر بات سمجھتا تھا۔

"اگر میں بڑا ہوتا نہ تو تیری شادی کر کے تجھ کو خوش کر دیتا۔ مگر -----" معصوم لبوں پر لفظ دم توڑ گئے۔ سکھی نے تڑپ کر اسے بانہوں میں بھر لیا۔ کتنی سچی اور معصوم خواہش تھی اس کی۔ وہ اس کا منہ چومنے لگی۔ دونوں کی آنکھوں سے جھڑی جاری تھی۔

"کیا تیری شادی نہیں ہو سکتی؟" اس نے پھر دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسے کیوں سوچ رہی ہو۔ ابھی تقدیر کی سیاہی تو نہیں ڈھلی"_ اس نے پر سوز آواز مین سمجھایا۔

"کہیں سے تیرا دولہا راجہ آسکتا ہے باجی"_ کیسی بھولی باتیں آج وہ کر رہا تھا۔ سکھی نے کرب سے ہونٹ چبا ڈالا۔

"تو خواب کیوں دیکھنے لگا ہے"_ اس کے سوا وہ اسے کیا کہہ سکتی تھی۔ مگر رفیق نے رشید کو سمجھانے کی پوری کوشش کی۔

"یار رشید! تیری باجی تو اتنی اچھی ہے۔ نہ جانے کس خوش نصیب کا مقدر بنے گا؟" بڑی حسرت آمیز آواز تھی۔ سکھی چونکی۔ مگر سنبھل گئی۔

"لیکن کب؟" رشید کا بس چلتا تو رجو کے ساتھ ہی سکھی کو بھی ڈولی میں بیٹھا دیتا۔ ایسا سوچنا شاید اس کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنی دھان پان سی بہن کو مصیبتیں برداشت کرتے دیکھا تھا۔ شادی سے لڑکیاں خوشحال ہو جاتی ہیں۔ سکھی ہو جاتی ہیں۔ یہی خیال رشید کے ذہن میں تقویت پکڑ گیا تھا۔

رفیق اور رشید باتوں میں مصروف ہوگئے۔ اور وہ وہاں سے چلی گئی۔ رفیق کی بدلتی کیفیت کا اسے اندازہ ہو رہا تھا۔ اور وہ یہ تبدیلی برداشت نہیں کر سکتی تھی کسی صورت بھی۔

☆☆☆☆

رشید کی معصوم خواہش جو بے بسی کے سبب اس کے ہونٹوں سے چپکی تھی۔ اس کا احساس تو منتظر حسن نے کب سے کر لیا تھا (اس کی پیاری بہن کو دل کے سنگھاسن پر بٹھا کر پوجا کر رہے تھے مگر وہ کافر ادا ملتی ہی کب تھی۔ وہ جھلک دکھا کر چھپ گئی تھی۔ چاند کی روپہلی چاندنی کی طرح۔ وہ رشید کو کیسے بتاتے کہ اتنی بڑی جائیداد کے مالک کا دل اس کی بہن کے قبضے میں ہے۔ کریم بابا کوچوان کے کچے گھروندے میں طعنے سہنے والی سکھی کے لئے شیش محل میں

رہنے والا مغرور شخص کتنا اداس اور پریشان ہے۔ جو سب کاموں سے فارغ ہوتے ہی اس کے پیار کا جوگ لے کر کمرے میں بند ہو جاتا ہے۔ اس کی تصویر کو دل سے لگائے' شکوے شکایت کرتا ہے' عجز وانکساری سے معافی طلب کرتا ہے اور پھر بے اختیار وحشت زدہ سا ہو جاتا ہے' جنونی ہو جاتا ہے۔

اس وقت بھی وہ ایزی چیئر پر بیٹھے اپنے تصور میں کھوئے ہوئے تھے۔ بیلا جو مسلسل ایک گھنٹے سے اپنے کمرے میں۔ ان کی پسندیدہ غزل کی آواز سن رہی تھی۔ پاؤں ہٹکتی ہوئی اپنے ٹیپ ریکارڈ سے کیسٹ نکال کر ان کے کمرے میں جا دھمکی' جب اس نے کیسٹ تبدیل کیا تو وہ ہوش بحال کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔

"حد ہوتی ہے بوریت کی تمہاری ہمسائیگی کیا اختیار کی گویا غم فراق میں گھر گئی"۔ بٹن آن کرتے ہوئے وہ جھنجلائی۔ فوراً" ہی گلشن آرا سید کی مدھر آواز کمرے میں گونج اٹھی۔

تمہارے شہر کا موسم بڑا سہانا لگے
میں ایک شام چرا لوں اگر برا نہ لگے۔

وہ بالکل ان کے گھٹنوں سے لگ کر بیٹھ گئی' اس کی سوتی جاگتی آنکھوں میں جذبے مچل رہے تھے' بڑا سحر تھا اس کی شخصیت میں۔ وہ نظریں چرا کر بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے۔

"کیسی ہے غزل؟" اس نے پوچھا۔

"اچھی ہے مگر ____؟"

"مگر کیا ____؟"

"میں نے پہلے بھی کہا تھا پسند اور رائے ہر انسان کی مختلف ہوتی ہے۔ اور ان باتوں سے انسانی جذبوں کی ترجمانی ہوتی ہے" انہوں نے گھوم کر دیکھا۔ "اس غزل سے میں تمہارے کس جذبے کی ترجمانی سمجھوں"۔ اس نے آنکھوں میں جھانکا۔

"جو غزل میں واضح تھا"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن میں تو سمجھتی تھی کہ تمہارے اور میرے جذبوں کی ایک ہی زبان ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"غلط کرتے ہیں ہم لوگ۔ ہم بھلا کون ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے پر پابندی لگانے والے"۔ انہوں نے اٹھ کر بالکنی سے باہر دیکھا' بیلا کے چہرے پر ایک سیایہ سا لہرا گیا۔

"تم ایسے کیوں ہوگئے ہو چاند' کبھی تو میری پسند کا بھی خیال کر لیا کرو"۔ وہ دکھ سے بولی۔

"مس بیلا احمد! یہ کبھی جو ہے ناں' غلط فہمیاں پیدا کرتی ہے"۔ انہوں نے وضاحتی انداز میں کہا۔

"اف میرے خدا کیسی باتیں کرتے ہو_" وہ زچ آگئی تھی۔ منہ پھلائے کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں مجبور ہوں بیلا احمد۔ میں نے اپنا آپ کسی اور کے آگے ہار دیا ہے' انہوں نے گویا خود سے سرگوشی کی اور بالکنی سے ہٹ گئے۔ گلشن آرا سید کے لبوں پر آخری جملے تھے

میں ایک شام چرا لوں اگر برا نہ لگے

انہوں نے کیسٹ نکال دیا۔ بیلا مجھے معاف کر دو' کہ میں تمہارے جذبے کی پذیرائی نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کتنا بے چین اور مضطرب ہوں۔ تم نے اس غزل کے ذریعے اپنے جذبوں کا اظہار کیا ہے۔ لیکن میں کتنا بدنصیب ہوں۔ یکطرفہ آگ میں جھلس رہا ہوں۔ جذبے مجھ سے سر ٹکرا رہے ہیں۔ مگر اصل ہستی تک انہیں پہنچانے میں ناکام رہا ہوں۔ عجیب و غریب انداز سے میرے پیار کا جرم سرزد ہوا۔ معافی نہ مانگ سکا۔ احساس جرم۔ احساس محبت میں بدل گیا بغیر کسی ارادے کے بغیر بتلائے مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے' کیسی ہے؟ مجھے مل بھی پائے گی یا کہ نہیں۔ میں اس کی محرومیاں اپنے وجود میں سمیٹ لینا چاہتا ہوں۔ مگر کب اور کیسے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا' وہ سر تھام کر بستر پر گر سے گئے۔ کب شام ڈھلی اور کب رات ہوگئی انہیں پتہ نہیں تھا۔

☆☆☆☆

رجو کی مہندی تھی۔ لڑکیاں ڈھولک پر مہندی کے گیت گا رہی تھیں۔ سکھی کو سر کھجانے کی بھی فرصت میسر نہیں تھی۔ رجو نے اسے بلا کر زبردستی کپڑے تبدیل کرنے کو کہا۔ اس نے ٹالنا چاہا۔ مگر رجو نے ایک نہ چلنے دی مجبوراً اسے بابا کا لایا ہوا سوٹ تبدیل کرنا پڑا

--------- لمبے بالوں کی اس نے چٹیا بنائی۔ اور دوپٹہ اوڑھے ہوئے بھی وہ کتنی خوبصورت لگ رہی تھی' بغیر میک اپ کے بھی وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ رجو کی ستائشی الفاظ کہنے پر وہ شرما کر کمرے سے باہر نکلی تو رفیق سے ٹکرا گئی۔ رفیق نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ ایک ٹک دیکھے چلا گیا۔ وہ پلو سنبھالتی ہوئی چولھے کی طرف بڑھ گئی۔ فضیلت اسے وہیں آوازیں دے رہی تھی۔ مہمانوں کے لئے روٹیاں پکانی تھیں۔ فضیلت نے بھی گھور کر اسے دیکھا۔ دل ہی دل میں اس کے حسن کی قائل ہوں۔ مگر پھر بڑ بڑ کرتی ہوئی اندر چلی گئی وہ روٹیاں پکانے میں مصروف ہو گئی۔

رات گئے سب تھک ہار کر سوگئے' وہ سب کام ختم کر کے ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں گئی۔ فرش پر بستر لگے ہوئے تھے پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں تھی اس نے چاروں طرف جگہ تلاش کی۔ بالآخر تھک ہار کے باہر آگئی۔ رشید جو بابا کے ساتھ کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا آگیا۔ مسئلہ اس کے سونے کا بھی تھا۔ رفیق اور بابا بھی تھکے ہوئے تھے سخت سردی تھی۔ کوئی پناہ دوسری نہیں تھی اس نے ایک پلنگ چولھے کے قریب چھپر کے نیچے بچھا دیا۔ ایک چادر اس پر بچھائی دوسری اوڑھنے کو رکھ دی۔ بابا کو لیٹنے کو کہا وہ رشید کو لے کر لیٹ گئے۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ مگر نیند کانٹوں پر بھی آجاتی ہے۔ لہٰذا وہ بھی سو گئے۔ سکھی کمرے میں دروازے سے لگ کر بیٹھ گئی۔

رات جیسے تیسے گذر گئی۔ صبح نو بجے بارات آنا تھی۔ گھر میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ ناشتہ بنانے بیٹھ گئی۔ رشید کی طرف توجہ نہ دے سکی۔ اس کو ہلکا بخار تھا۔ رات ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ مگر بچہ تھا مہمانوں میں مصروف ہو گیا۔ سکھی کو بھی خیال نہیں رہا۔

شام جو باہر سے آیا تو بخار میں پھنک رہا تھا۔ وہ اپنی تھکاوٹ بھول کر اسے لحاف میں چھپانے لگی۔ رشید منٹوں میں غنودگی میں ڈوب گیا۔ بابا بھی پریشان ہو گئے۔ رفیق جلدی سے بخار کی گولی لے آیا۔ سکھی نے چائے بنا کر رشید کو گولی کھلائی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ سب بے خبر سو گئے سوائے رفیق' بابا اور خود اس کے' تینوں ساری رات بے چین رہے۔

صبح معمولی سا فرق تھا۔ سکھی کو کچھ اطمینان نصیب ہوا۔ اب مسئلہ رجو کو لے کر آنے کا تھا۔ سب جا رہے تھے سوائے فضیلت کے' رشید سردی کے موسم میں سفر نہیں کر سکتا تھا۔ اور کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا۔ فضیلت تو ویسے ہی دشمن تھی۔ رشید کے خیال سے اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ بابا کو افسوس ہوا مگر پھر وہ بھی رشید کی وجہ سے مطمئن ہو گئے۔

سردی نے پھر شدت اختیار کر لی تھی۔ خاص کر صبح سے سورج بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا بارش برسنے کو تیار تھی۔ سب لوگ چلے گئے۔ سکھی رشید کے پاس آگئی۔ وہ بے سدھ سا پڑا تھا۔ صبح سے اس نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ بخار پھر شدید ہو گیا تھا۔ سکھی نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے' وہ جیسے ہی کسمسایا۔ اس نے گولی کھانے کو کہا۔ بخار عجیب نوعیت کا تھا کہ دوا کھاتے ہی کم ہو جاتا پھر دو چار گھنٹے کے بعد شدت اختیار کر لیتا۔ جیسے ہی بخار میں کمی واقع ہوئی وہ بھی رشید کے برابر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر میں تھکاوٹ سے چور بدن نیند کی مہربان آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆☆

بھرپور جمائی لے کر جیسے ہی وہ بیدار ہوئے۔ توجہ فوراً" کمرے سے باہر بارش کی آواز پر چلی گئی۔ وہ تیزی سے اٹھے اور کھڑکی کھول کر دیکھا تو ہر طرف جل تھل تھی۔ موسلادھار بارش تھی۔ کالے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے' بجلی کی چمک بادلوں کی گڑگڑاہٹ بڑی شدید تھی اور پتہ دے رہی تھی کہ آج تو بارش رکنے کا کوئی امکان نہیں۔ سردی کی لہر سے لپٹی انہوں نے فوراً" کھڑکی بند کر دی۔ اور گاؤن کی ڈوریاں کستے ہوئے باتھ روم میں داخل ہو گئے۔ انہیں ایک ہی فکر تھی کہ اتنی شدید بارش میں فیکٹری کس طرح جایا جائے۔

باتھ روم سے فارغ ہو کر وہ ڈائننگ روم میں آگئے۔ کیونکہ انہیں علم تھا کہ اگر ناشتے کی میز پر نہ پہنچے تو بی جی کی خوبصورت ڈانٹ سننی پڑے گی۔ اور وہ خود بھی ناشتہ نہیں کریں گی۔ یہی سوچ کر وہ ناشتے کی میز پر پہنچ گئے۔

میز پر بیلا کانٹے چمچ سے کھیل رہی تھی۔ جب کہ بی جی کچن میں مصروف تھیں۔ بڑی زوردار خوشبو پھیل رہی تھی۔ انہوں نے زور سے سانس کھینچی اور بیلا سے مخاطب ہوئے۔

"صبح بخیر"۔ جواباً" اس نے بھی یہی الفاظ دہرا دیئے۔

"یہ بی جی کہاں ہیں۔ اور کیا ناشتے میں کانٹے چھری کھانے ہیں؟" انہوں نے قدرے خوشگوار موڈ میں کہا۔ بیلا کے ہونٹ سختی سے بھینچے رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت چپ اور اداس ہے۔ وہ چند ثانیئے تو بغور دیکھتے رہے) پھر اخبار اپنے آگے کر کے خبروں میں گم ہوگئے۔

"ارے بس کرو چاند سارا چاٹ کر ہی دم لوگے"۔ بی جی گرم گرم کچوری اور حلوہ ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھیں بولیں۔

"واہ' موسم کی مناسبت سے کیا مزے دار چیز بنائی ہے"۔ انہوں نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔ بیلا چپ ہی رہی۔

"مگر بی جی! آپ کچن میں کام کیوں کرتی ہیں ڈاکٹر نے منع کیا ہے"۔ انہیں جیسے خیال آیا۔ ہاتھ روک کر خفگی سے بولے۔

"کیا ملازموں کی کمی پڑگئی ہے؟"

"پھر وہی بے ایمانی' میرا اتنا خیال ہے تو میری خوشی پوری کر دے"۔ بی جی نے آنکھیں دکھائیں۔ اب انہیں بات سنبھالنا مشکل ہوگئی۔ فوراً" بیلا سے بولے۔

"مس بیلا احمد! آپ نہیں کھا رہیں"۔ اس نے گھنیری پلکیں اٹھائیں۔ ہزاروں شکوے منتظر حسن کو پریشان کر گئے۔ گہری گہری آنکھوں میں شکوے اور اداسیاں ڈیرے لگائے ہوئے تھیں۔

"ہاں بیٹی' کیا بات ہے؟" بی جی بھی پریشانی سے بولیں۔

"بی جی نہیں' ذرا طبیعت اداس ہے"۔ وہ بڑی کلفت سے بولی۔

"کیا میری بیٹی کو ڈیڈی یاد آرہے ہیں؟" بی جی نے چمکارتے ہوئے پوچھا۔ باپ کے ذکر پر اس کے آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا۔

"مس بیلا احمد! عجیب بات ہے آپ جیسی باذوق اور ذوق جمال رکھنے والی لڑکی اس موسم میں اداس ہے"۔ منتظر حسن نے ہنس کر کہا وہ یاسیت بھری نظروں سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

"چاند! بہت بری بات ہے کتنے دن ہوگئے اور تو بیلا کو کہیں سیر کرانے نہیں لے گیا"۔ بی جی نے شکایتی نظروں سے گھورا۔

"بی جی! بیلا نے کبھی کہا ہی نہیں-------" انہوں نے معصومیت سے جواب دیا۔

"اچھا چلو آج اسے کہیں لے جاؤ۔ میں کھانے پینے کی چیزیں گاڑی میں رکھوا دیتی ہوں"۔ بی جی نے تحکم سے کہا۔

"مگر دفتر-------"

"آج چھٹی-------" بی جی نے فیصلہ سنایا۔

"نہیں بی جی مجھے کہیں نہیں جانا"۔ یہ کہتی ہوئی بیلا تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے روک نہ سکے۔ خود بھی خاموشی سے ہونٹ چبانے لگے۔

"لڑکی پریشان کیوں ہے؟" بی جی سخت متفکر ہوگئیں۔

"معلوم نہیں"۔ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

"چاند! میرا خیال ہے' وہ تم سے ناراض ہے"۔ بی جی جو کئی روز سے اس کی خاموشی اور اداسی نوٹ کر رہی تھیں' انہیں اس کے سوا کوئی وجہ نظر نہیں آرہی تھی۔

"مگر کیوں؟" وہ پوچھ بیٹھے۔

"شاید اس لئے کہ بچپن سے آج تک تم نے اسے وہ مقام نہیں دیا جو وہ تمہیں دیتی آئی ہے"۔

"مگر بی جی! مقام خود سے متعین نہیں ہوتے۔ یہ کوئی جاگیر تو نہیں۔ جو جس کے نام چاہو لکھ دو آپ جانتی تو ہیں کہ دل کا معاملہ کتنا اٹل ہوتا ہے' انسان دل کا فیصلہ ماننے سے انکار نہیں کر سکتا"۔ انہوں نے دبے دبے لفظوں میں وضاحت کی۔

"تو کیا' تمہارے دل نے بھی فیصلہ سنا دیا ہے۔ تم کسی اور کے نام یہ جاگیر لکھ چکے ہو"۔ بی جی نے تشویش سے مگر سہمی سہمی نظروں سے دیکھا۔ اور اتنے آہستہ سے پوچھا کہ کہیں بیلا تک یہ بات نہ پہنچ جائے۔

"بی جی' میں کیا بتاؤں۔ یہ کیسے ہوا میری سمجھ میں نہیں آتا"۔ وہ جز بز سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے' بیلا جو مبہم سی امید پر زندہ تھی' دل پکڑ کر کھڑکی سے پرے ہٹ گئی۔

گویا بات وہی نکلی تھی جس کا اسے شک تھا۔ وہ تو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے پوج رہی تھی، بچپن سے اس کا ہیولا سا ذہن میں نقش تھا، جوں جوں عمر میں اضافہ ہوتا گیا اس کا دل بس سے باہر ہوتا چلا گیا۔ منتظر حسن تو اس کے حواسوں پر چھا چکے تھے، مگر یہ کیسا انکشاف تھا، کیسی تلخ سچائی تھی جسے حلق سے نیچے اتارنے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا، مگر عقل نے فوراً" دلیل دی۔ بیلا جو سن لیا وہ بہت کافی ہے یقین کر لینے کو، سوچ لو کہ جس چاند سے تمہارا جیون منور تھا۔ وہ کسی اور آنگن کی روشنی ہے۔ عقل کی دلیل پر کسی حد تک اس نے سمجھوتہ بھی کیا۔ مگر دل قابو سے نکلا جا رہا تھا۔ گلا خود بخود رندھ سا گیا۔ آنکھیں برس اٹھیں۔ بالکل باہر بارش کی طرح، کمرے میں اس کی ہچکیوں، سسکیوں کا شور، باہر بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے زیادہ تھا، بستر پر تکیئے پر منہ ٹیک کر وہ ہچکولے کھانے لگی۔

"ناکامی کا احساس کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے" اس نے سسکیوں کے درمیان سوچا۔ وہ تو ہار گئی تھی۔ دوسری طرف منتظر حسن بھی تو ابھی تک ہارے ہوئے جواری کی طرح تھے وہ بھی تو بے چین تھے مضطرب تھے، بادلوں کی گونج میں اپنے اندر کے طوفان کے دبانے کی کوشش میں لگے تھے لیکن کسی پل سکون نہیں تھا۔

کمرہ ہیٹر سے خاصا گرم ہو چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے۔ سوچیں منتشر تھیں۔ کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا بے اختیار ٹہلتے ٹہلتے اپنے کمرے کے اندر بیلا کے کمرے کی کھڑکی کے قریب آئے تو ہچکیوں کی آواز صاف سنائی دی۔ چند لمحے تو وہ غور سے سنتے رہے، پھر تیزی سے باہر آئے اور اس کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

"بیلا ------ بیلا پلیز کیا پریشانی ہے کچھ بتاؤ"۔ انہوں نے تیزی سے پوچھا"۔ رو کیوں رہی ہو؟"

ایک لمحے کو وہ ساکت رہی پھر آہ بھر کے اٹھی اور ڈوپٹے سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔ روئی روئی آنکھیں، دھلا ہوا چہرہ وہ پہلو بدل کر رہ گئے۔

"بیلا مجھے حق تو نہیں ہے کہ تم سے پوچھوں مگر میرے سوا کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے" انہوں نے بے تکی سے بات بات بنائی۔

"تم درست کہتے ہو"۔ جملے میں نمی انہوں نے صاف محسوس کی۔

"کیا تم مجھ سے ناراض ہو، کوئی شکایت ہے؟"

"اس نے بھیگی بھیگی پلکوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"نہیں، جب تم پر کوئی حق ہی نہیں پھر تم سے شکایت کیسی؟"

"دیکھو بیلا! حق کا دائرہ وسیع ہے۔ وضاحت کر دو تمہیں کون سا حق چاہیے"۔

"ہنہ، کیا تم مجھے وہ حق دے دو گے؟" لہجہ طنزیہ تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی، تمام حقوق ایک شخص کے لئے وقف نہیں کئے جا سکتے"۔ انہوں نے گھوم کر شیشوں سے باہر برستی بارش کو دیکھا۔

"جی میں سمجھتی ہوں، لیکن انجانے میں بلا سوچے سمجھے اپنے تمام حقوق ایک شخص کی ذات سے منسلک کر چکی ہوں" وہ غمگین لہجے میں بولی تو وہ تیزی سے پلٹے۔

"اور یقیناً" وہ شخص میں ہوں"۔ وہ مقناطیسی نظروں کا مقابلہ نہ کر سکی فوراً" پلکیں جھکا لیں۔

"ہاں، مگر غلطی سے جانا کسی اور سمت تھا، رخ ادھر کر لیا"۔ وہ ہلکے سے ہنس پڑی۔ جیسے اپنی بے وقوفی کا تمسخر اڑانا چاہتی ہو۔

"تم اکیلی مرتکب نہیں ہو اس بے وقوفی میں میں بھی شریک ہوں۔ شاید جس طرف چل پڑا ہوں۔ اس کا تصور میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہم دونوں ہی ایک کشتی کے سوار ہیں۔"

"مگر دونوں کی سمتیں متضاد ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنی طرف بلانا چاہتے ہیں"۔ اس کی آواز پاتال کی سی گہرائی سے ابھری۔

فیصلہ کرو قصور کس کا ہے؟" انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"وقت کا یہی تو اپنے فیصلے انسانوں پر ٹھونسنا ہے۔ اور مجبور کر دیتا ہے"۔ وہ دانت بھینچ بھینچ کر بولی۔ شدید غصے کا ردعمل تھا۔

"پھر ہمیں سمجھوتہ کر لینا چاہئے"۔ انہوں نے باتوں ہی باتوں میں اسے سمجھا ڈالا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بیلا بکھر سی گئی ہے۔ اسے نرمی سے محبت سے سمیٹا جا سکتا ہے۔ سمجھایا جا سکتا ہے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ جسے دل و دماغ قبول کر چکے تھے۔ اسے بھلانا یا فراموش کرنا گویا

اپنی ذات سے کئے گئے قول سے پھرنا تھا جو کم از کم وہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تو ان کی روح تک میں سما چکی تھی۔ اپنی تمام تر اجنبیت اور لاتعلقی کے ساتھ۔

"ہاں' کیوں کہ تم تو کر ہی چکے ہو" ہلکا سا تلخ لہجہ تھا۔ وہ شرمندہ ہوئے' نہ پچھتائے۔ کیونکہ انہوں نے بیلا کو کوئی دھوکہ نہیں دیا۔۔ کبھی کوئی عہد و پیمان نہیں کیا تھا جو وہ شرمندہ ہوتے۔

"بیلا! یہ تم بھی سمجھتی ہو کہ اب سے پہلے بھی جذبے' ہمارے خیالات کہیں ہم آہنگ نہیں ہوئے اور نہ ہی ایسا کوئی تاثر میں نے کبھی تمہیں دیا ہے۔ میں تمہارے خیال کو کمتر نہیں سمجھتا مگر تم ہی بتاؤ کہ جس طرح تم میرے بارے میں سوچنے پر مجبور تھیں اس طرح کیا میں مجبور و بے بس نہیں ہو سکتا تھا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میری اور تمہاری محبت میں' جذبے میں فرق کہیں نہ کہیں رہ گیا ہے_" وہ ماتھے پر انگلیاں پھیرتی ہوئی کرسی پر ٹک گئی۔

"نہیں بیلا! اپنے جذبے پر شک مت کرو' کامیابی ہی جذبوں کی صداقت نہیں ہوتی۔ بلکہ ہارے ہوئے لوگ اپنے جذبوں کی جنگ میں امر ہو جاتے ہیں۔ ہمیشگی حاصل کر لیتے ہیں" وہ دور کہیں نکل گئے۔

"یہ بات تو مان لو کہ تم نے جسے اتنی شدت سے چاہا اور اپنی زندگی کا خواب بنا لیا۔ میں نے بھی تمہیں چاہا۔ مگر تم سے شدت میں مات کھا گئی ہوں۔ کہیں کوئی کمی تو تھی ناں جو تمہیں پا نہ سکی"۔ وہ مضطرب سی ہو کر انگلیاں مروڑنے لگی۔

"محبت میں مات کا تصور کیا ہے؟ صرف کسی چیز کو جیت لینا محبت نہیں ہوتی۔ محبت کی وسعت تو بہت آگے تک جاتی ہے۔ ان سب مفاد پرستی کی باتوں سے دور"۔ وہ دو زانوں اس کے قدموں کے قریب بیٹھ کر نہایت نرمی سے سمجھا رہے تھے۔ اور شاید خود کو بھی' کیونکہ ابھی تک انجانی محبت کی تپش ہی تھی۔ پانے کا تصور تو ان کی بھی خام خیالی تھا۔ ان لوگوں کی طرح' جو خوش قسمتی سے منزل پالیں تو ٹھیک' ورنہ اگر ایسا نہ ہو تو ساری عمر تیاگ دیتے ہیں۔ مگر محبت کپڑوں کی طرح تبدیل نہیں ہوتی۔ سکھی اگر مل نہیں رہی تھی۔ تو اس خیال سے بیلا کو دھوکہ نہیں دی سکتے تھے۔

"ٹھیک ہے' میں محبت کی وسعت کو پانے کی کوشش کروں گی۔ خدا تمہیں کامیاب رے۔" اس نے صدق دل سے ہاتھ اٹھا کر ان کے لئے دعا کی۔ اور وہ اس فراخ دل لڑکی کو دیکھتے رہ گئے۔

"مجھے معاف کر دینا بیلا اس خیال سے کہ مانگے کے چراغ سے روشنی نہیں ہوا کرتی"۔ یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔ بیلا دیر تک ہلتا ہوا پردہ دیکھتی رہی۔

بڑی دیر سے ٹیلی فون بیل ہو رہی تھی۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے ٹیلی فون نے ساری توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔ وہ جلدی سے اس کی طرف لپکے' دوسری طرف ان کا دوست میجر ایاز تھا۔

"ہاں' کیا بات ہے ایاز؟" وہ بولے__

"یار آج شام پانچ بجے میرے تمام دوست میرے گھر جمع ہو رہے ہیں۔ ان میں تم پہلے نمبر پر ہو"۔ دوسری طرف سے ایاز صاحب نے خوشدلی سے کہا۔

"لیکن کس خوشی میں؟" انہوں نے بھی قدرے بشاش لہجے میں دریافت کیا۔

"بھئی بارش رکنے کا کوئی پروگرام نہیں۔ للذا آج کی شام موسم کی نذر"۔ ایاز صاحب بہت زندہ دل تھے۔

"یار! تم بھی خوب ہو بھلا کیوں بھابی کو پریشان کرتے ہو"۔ انہوں نے نہ جانے کے خیال سے بہانہ کیا۔

"چھوڑ یار! بیوی کا کم از کم اتنا فائدہ تو ہونا چاہئے' لیکن خیر تم ابھی انجان ہو"۔ وہ شرارت سے بولے۔

"ٹھیک ہے بابا' میرا آنا بہت ضروری ہے؟" وہ اس وقت سخت ڈسٹرب تھے۔

"جی بہت ضروری' سمجھ گئے"۔ اس وقت شدید اصرار تھا کہ وہ بے بس ہو گئے۔

"اوکے۔ میں آجاؤں گا"۔ انہوں نے گویا ایاز کے آگے ہتھیار پھینک دیئے۔

"تھینک یو ڈیئر"۔ ایاز خوشی سے بولے اور ٹیلی فون بند کر دیا۔ وہ بھی ریسور رکھ کے بیڈ تک آئے اور پھر کچھ دیر کو آنکھیں موند کر خود کو آزاد کر دیا۔

جیسے ہی اس نے رشید کی پیشانی چھوئی تو کانپ اٹھی۔ وہ تنور کی طرح دہک رہا تھا۔ آج تو دن بھر وہ بے سدھ پڑا رہا تھا۔ ایک لمحے کو بھی بخار میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کو وہ کام کاج کی غرض سے رشید کے پاس سے اٹھ کر گئی تھی۔ کیونکہ فضیلت تو بستر میں گھسی ہوئی تھی۔ گھر سارا الٹا ہوا تھا۔ وہ اس کے ڈر سے کام میں لگ گئی تھی۔ لیکن توجہ ساری رشید کی طرف تھی۔ رفیق کی لائی ہوئی گولیاں بھی ختم ہوگئیں تھیں اسی خیال سے وہ ہراساں ہو گئی تھی۔ جب دل تڑپا تو اٹھ کر فضیلت کے قریب آگئی۔

"اماں، اماں"۔ اس نے سہم کر آواز دی۔ وہ کسمسائی۔ منہ سے لحاف ہٹا کے دیکھا۔

"اماں! سنو رشید کو بہت تیز بخار ہے"۔ وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"اب زہر کی گولی کھلا دو"۔ وہ دہاڑی۔

خدا نہ کرے۔ کیسی باتیں کرتی ہو اماں"۔ وہ تقریباً" رو پڑی۔

"اری کم بخت! میرے سرہانے کاہے روتی ہے۔ انہوں نے چیخ کر کہا۔

"وہ اماں، تم رشید کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ"۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بڑی مشکل سے بولی۔

"ارے واہ! میں باؤلی ہوں۔ اتنی سردی میں بارش میں ماری ماری پھروں"۔ وہ تنک کر بولی۔

"اچھا مجھے کچھ پیسے دے دو۔ میں گولیاں لے آتی ہوں"۔ اس نے سہم کر کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ تیرے باوا کا بینک کھلا ہے یہاں۔ اری بھاگوں جلی کوئی درخت سے پیسے نہیں ٹوٹ رہے"۔ اس نے آنکھیں گھما گھما کر اسے گھورا۔

"اماں جو چاہو کر لو مگر"۔ وہ روتے ہوئے ان کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"اری خدا کی بندی، پیچھا چھوڑ میرا"۔ فضیلت نے ناک چڑھاتے ہوئے میلے کچیلے دوپٹے کے پلو سے گرہ کھولی اور مڑا تڑا ایک روپیہ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"اماں! اس سے دوائی آ جائے گی؟" اس نے پوچھا۔

"اگر نہ آئے تو زہر ضرور آ جاوے گا"۔ وہ زہر خند سی بولی۔ اور لحاف منہ پر لپیٹ کر ئی۔ وہ خون کے آنسو روتی، رشید کے پاس آئی۔ چادر میں اسے اچھی طرح لپیٹا اپنی چادر درست کی۔ اسے کندھے سے لگایا اور روپیہ مٹھی میں داب کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

موسلا دھار بارش برس رہی تھی۔ کالے بادل ابھی تک آسمان کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھے۔ شام ڈھلے ہی رات کا سماں بندھ گیا تھا۔ خیر اندھیرے کے خوف سے تو وہ عاری تھی۔ اسے کون سا کچھ نظر آتا تھا۔ البتہ چند لمحے وہ کچے فرش پر پاؤں جمانے کی کوشش ضرور کرتی رہی۔ ایک بار پہلے وہ بری طرح پھسل گئی تھی۔ آج تو رشید کو اٹھایا ہوا تھا۔ لیکن کہتے ہیں ناں کہ تڑپ میں انسان آگ سے بھی گذر جاتا ہے۔ وہ بھی جیسے تیسے کر کے صحن عبور کر گئی۔ اب اہم مسئلہ یہ تھا کہ کس سمت جائے، ڈاکٹر یا سرکاری اسپتال کس طرف ہے۔ قریب کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر وہ بولی۔

"ارے بھئی سنو"۔ یہ سن کر اجنبی راہ گیر رک گیا۔

"بھیا! کوئی ڈاکٹر یا اسپتال کس طرف ہے مجھے بتا دو"۔

"بہن ڈاکٹر صاحب کا کلینک ہے۔ تقریباً" یہ سامنے والی پوری سڑک کے آخری موڑ پر۔ اور اسپتال تو بہت دور ہے، ویسے بھی شام ہو چکی ہے۔ اسپتال میں کون ہو گا۔ سوائے ایمر جنسی مریضوں کے کوئی دوسرا اس وقت وہاں نہیں جاتا"۔ اپنے طور پر راہ گیر نے وضاحت کی۔ اور وہ شکریہ کہتی ہوئی سامنے والی سڑک پر چل پڑی۔ تاکہ ڈاکٹر کے کلینک جا سکے۔ انجانی راہیں تھیں۔ برسات تھی ٹھنڈی ہوا جو جسموں کو چیرے دے رہی تھی۔ خود جوان جہان تھی۔ اس پر ستم یہ کہ اچھا برا دیکھ نہیں سکتی۔ صرف خونی رشتے کی تڑپ تھی محبت تھی جو اسے بھگائے لئے جا رہی تھی۔ گو کہ رشید کا وزن سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا سردی نے پورا وجود شل کر کے رکھ دیا تھا۔ سر سے پاؤں تک بھیگ چکی تھی۔ رشید بھی بخار میں سارا بھیگ گیا تھا اسے زیادہ فکر رشید کی تھی۔ وگرنہ دو قدم چلنے کی ہمت نہیں تھی۔ قدموں کی لڑکھڑاہٹ اور بار بار پھسلنے پر بھی وہ دونوں بازوؤں میں اسے دبوچے کٹی پتنگ کی طرح ڈول رہی تھی۔ کوئی اس کا پرسان حال نہیں تھا۔ ہوتا بھی کون۔ سڑک پر مکمل خاموشی تھی۔ کوئی اکا دکا گاڑی زن سے گزر جاتی ورنہ ایسے طوفانی موسم میں کون باہر نکلتا ہے۔ تو یہ وہی دکھیاری تھی۔ جو دھکے کھا

رہی تھی، جیسے اپنے ہوش میں نہ ہو۔ اتنا بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ عین سڑک کے وسط میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ تبھی تو پیچھے سے آنی والی گاڑی نے بہت کوشش کی اسے بچانے کی مگر چشم زدن میں وہ اچھل کر دور جاگری اور بازوؤں سے نکل کر رشید فٹ پاتھ سے جا ٹکرایا۔ فٹ پاتھ پر ابھرا ہوا پتھر اس کے دماغ میں اتر گیا۔ خون کا فوارہ ابل پڑا۔ وہ پہلے ہی بے ہوش تھا۔ البتہ الٹ کر گرتے ہی وہ بھی بے ہوش ہو گئی تھی۔

گاڑی میں بیٹھا شخص افسوس سے آنکھیں پھاڑے ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ تیزی سے نیچے اترا اور پہلے رشید کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا۔ اور پھر ایک طرف ڈھلکی ہوئی سکھی کو سیدھا کر کے اٹھایا۔ اندھیرے میں بھی اٹھانے والا ایک لمحے کو ششدر رہ گیا۔ جو کاغذ کے ٹکرے پر خاموشی کا لبادہ اوڑھے ان کی مٹھی میں بند رہتی تھی۔ وہ آج اسی طرح ساکت ان کی باہوں میں تھی۔ ملی بھی تو کس انداز میں! ایک نئے جرم کے ساتھ۔ ایک نئی زیادتی کے ساتھ۔ وہ کرب سے نچلا ہونٹ چبا کر رہ گئے پھر وقت کا احساس کر کے فوراً" اسے بھی گاڑی میں جیسے تیسے لٹایا۔ رشید کے سر سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ جب کہ سکھی کے مختلف جگہوں پر تھوڑے زخم آئے تھے جن سے خون رس رہا تھا۔

گاڑی ایک پرائیویٹ اسپتال کے آگے رکی ساتھ ہی اسٹریچر پر ان دونوں کو ایمرجنسی روم میں لے جایا گیا وہ بے چین اور ملول سے باہر ٹہلنے لگے۔

کچھ ڈاکٹرز، سکھی کے گرد جمع تھے اور کچھ رشید کو چیک کر رہے تھے۔ رشید کے لئے فوری آپریشن تجویز کیا گیا تھا۔ کیونکہ زخم گہرا تھا۔ اور خون دماغ میں بھی پھیل رہا تھا سکھی کی ڈریسنگ وغیرہ کر کے دوسرے کمرے میں منتقل کیا گیا تھا۔ وہ بے تابی سے اس کے کمرے داخل ہوئے اس کی خیریت دریافت کی۔ ڈاکٹر کے بقول سکھی تو خیریت سے تھی کچھ دیر تک ہوش میں آنے والی تھی۔ البتہ انہوں نے رشید کے آپریشن کی اجازت طلب کی تھی جو انہوں نے جلدی سے دی دی اور دستخط کر دیئے۔ ڈاکٹرز باہر چلے گئے۔ انہوں نے دکھ بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ فرشتوں کی سی معصومیت اس کے چہرے پر چھائی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ آج بھی خاموش تھی۔

کبھی تو میری زیادتی کے خلاف سراپا احتجاج بن جایا کرو۔ مجھے احساس ندامت کی کسک دے کر چپ ہو جاتی ہو"۔ وہ جھنجھلا کر چلا پڑے۔ پھر بالوں میں انگلیاں پھنسا کر اس کے قریب پڑی کرسی پر ٹک گئے۔

کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔ وہ وحشت زدہ سے اسے گھور رہے تھے اور وہ ہر چیز سے لاتعلق آنکھیں بند کئے ہوئے تھے۔ وحشت حد سے بڑھی تو وہ گھبرا کر اسپتال سے باہر نکل گئے۔

وقت بے کیف اور بے رنگ گزر رہا تھا۔ تقریباً" دو ڈھائی گھنٹے بعد وہ پھر برق رفتاری سے اندر آ گئے۔ اس کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے باہر ٹھٹھک گئے۔ سکھی کی پرنم آواز سماعت سے ٹکرائی۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ ڈاکٹرز اور پولیس انسپکٹر سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ تو سکتے میں آ گئے۔ کتنی عظیم تھی وہ۔ جو بھائی کی موت کی خبر سن کر بھی صبر کا حوصلہ نہ ہاری تھی۔

"میں کسی کو نہیں جانتی۔ کس کی گاڑی نے میرے بھائی کو نہیں مارا، تقدیر کا فیصلہ تھا"۔ وہ کہہ رہی تھی۔

مگر بی بی؟ پولیس انسپکٹر نے کچھ کہنا چاہا۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔ میں اس شخص کو کیا دوش دوں۔ میرا بھائی شاید میرے نازک کندھوں کا بوجھ خود اتار گیا ہے"۔ اس نے ضبط کر کے ہچکی سی لی۔ آنکھیں کھلی تھیں۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ جیسے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ بے حساب پانی بہتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ڈاکٹرز نے انسپکٹر کو ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ وہ باہر نکلنا ہی چاہتے کہ وہ ایک طرف ہو گئے، پھر جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے، وہ روتے روتے چونکی۔ دماغ میں بسی خوشبو جیسے تازہ ہو گئی۔ دماغ سے نکل کر جیسے اس کے ارد گرد پھیل گئی ہو۔ دبے قدموں کی آہٹ پر اسے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ کوئی اندر آیا ہے مگر خوشبو نے زبان پھر بھی نہ کھولی۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ "میں نے جسے معاف کیا۔ وہ تم ہی ہو، کوئی غیر نہیں"۔

تیسری مرتبہ یہ مہک اس کے ارد گرد محسوس ہوئی تھی۔ اس دل و دماغ میں بسے احساس کو مٹانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ بس دکھ حد سے بڑھا تو ہچکیوں میں اضافہ ہو گیا۔ ان کا وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ ضمیر چوٹ لگانے لگا۔ اس کی برستی آنکھوں کو بے موسمی برسات

انہوں نے بخشی تھی۔ اس سے اس کا بھائی چھین لیا تھا۔ احساس ندامت ڈسنے لگا تو پھر الٹے قدموں باہر نکل گئے‘ اس نے ان کے جانے کو بھی محسوس کیا۔ اور ایک مرتبہ پھر مہک اس نے دل و دماغ میں چھپالی اور سسکیاں بھرنے لگی۔

سنو بی بی! تم اپنے بھائی کی میت لے جاسکتی ہو“۔ ڈاکٹر نے دکھ سے اسے روتا دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ تڑپ کر کھڑی ہوگئی۔ دل ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔

”؟ صبر سے کام لو‘ خدا کا فیصلہ تبدیل نہیں کیا جاسکتا“۔ ڈاکٹر نے ہمدردی سے کہا“
ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں“۔ اس نے سسکاری بھری۔

”اگر چاہو تو صبح بھی جاسکتی ہو“۔ ڈاکٹر نے آنکھوں سے محرومی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! مجھے میرے بھائی کے پاس لے چلیں۔ پھر میں صبح اسے لے جاؤں گی“۔ اس نے رخسار صاف کئے اور ڈاکٹر کے ساتھ رشید کے کمرے میں آگئی۔

”ڈاکٹر صاحب! مجھے اپنے بھائی سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ڈاکٹر آہستہ سے باہر نکل گیا۔

”رشید سنو! اچھے بھیا‘ تم نے اچھا کیا‘ اذیت سے نجات حاصل کرلی۔ شاید تم نے میرے کمزور سہارے پر خود کو بوجھ بننے سے بچایا ہے۔ یہ صحیح ہے رشید‘ آج میرا وجود ہلکا پن محسوس کر رہا ہے۔ میں تمہارا بوجھ اٹھانے کے قابل بھی نہیں تھی تم نے بہت اچھا کیا سکھ سے آنکھیں موندلیں۔ تم اپنا بوجھ تو اتار لے گئے‘ مگر میں تو اب اپنا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتی۔ میں یہ بوجھ اتار پھینکنا چاہتی ہوں۔ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں_ بول_ بول_ رشید میرے بھائی۔ “۔ وہ ہذیانی انداز میں چلائی اور اس سے لپٹ گئی۔ مگر آج وہ چپ تھا۔ ہمیشہ کی طرح نہ اس کے آنسو صاف کر رہا تھا اور نہ اس کے دکھ بانٹ رہا تھا۔

”رشید! مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارا بوجھ اٹھا کر نہیں لے جاسکتی۔ تمہیں لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑے جا رہی ہوں اس وجہ سے کہ تمہیں آخری آرام گاہ تو اچھی مل جائے۔ ورنہ میں شاید تمہیں یہ بھی نہ دے سکوں۔ میں تو خود نہ جانے کہاں گم ہو جاؤں۔ خدا

حافظ۔ خدا حافظ میرے بھائی“۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر شکستہ قدموں سے باہر نکل آئی۔

پھر کسی نے اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ دیوار سے لگے منتظر حسن نے بھی نہیں۔ آج پھر ان کی منزل قریب آکر دور ہو رہی تھی۔ انہیں احساس تک نہیں ہوا اور وہ رات کے سناٹے میں بے خوف و خطر بھاگ رہی تھی‘ جس سمت منہ اٹھا۔ وہ بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ بارش تو اسوقت تھم چکی تھی۔ مگر جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ سڑکیں گیلی تھیں‘ ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے کوئی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اتنی سردی میں رات کے ایک ڈیڑھ بجے کوئی گاڑی ہی صرف زن سے گزرتی گاڑی میں بیٹھے لوگ جلد سے جلد اپنی منزل تک پہنچنا چاہتے تھے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھا کہ وہ کون تھی اور کہاں بھاگی جارہی تھی؟ نہ کوئی جینے کی تمنا تھی اور نہ ارادہ زندگی کا بوجھ آج ہر صورت اتار پھینکنا چاہتی تھی۔ اس دنیا کی بے ثباتی نے اسے یہی سبق دیا تھا۔ ورنہ صبر و حوصلہ روز اس کی چوکھٹ پر سلام کرتے تھے۔ آج تو انہونی ہی ہوگئی تھی کہ وہ صبر و ضبط کے تمام بندھن توڑ کر خود کو آزاد کرنا چاہتی تھی۔ یا پھر صرف بھائی کی محبت صبر کی شکل اختیار کرلیتی تھی۔ اس کے سہارے ہی وہ اپنی آنکھوں کے گرد بند باندھتی تھی‘ لیکن اب کیا رہ گیا تھا؟ بے سہارا وجود‘ محتاج زندگی اس کا ختم کر دینا ہی بہتر تھا۔ اور اسی لئے وہ آج تقدیر کو ہرانے چلی تھی۔ تاکہ پھر کوئی چرکہ تقدیر اسے نہ لگائے‘ اب اس میں وہ حوصلہ نہیں تھا۔ وہ تقدیر کو مات دینے چلی۔

☆☆☆☆

”چاچا رانجھن‘ ارے رکو دیکھو“۔ بانسری کی مدھر تان میں کھوئے کھوئے سب لوگ عبداللہ کی بات پر چونکے‘ اور عبداللہ کے اشارے کی طرف دیکھنے لگے۔

”ارے عبداللہ یہ تو چھوکری معلوم ہوتی ہے“۔ چاچا رانجھن نے لالٹین آنکھوں کے قریب لاکر بھاگتی ہوئی پرچھائیں کے بارے میں کہا۔

”ہاں چاچا‘ مگر یہ کدھر جاتی ہے۔ دیکھو تو بالکل کچے پر سے گزر کر دریا کے سرے کی طرف رخ ہے“۔ افضل نے تشویش سے کہا۔

"ارے روکو' بھاگو' پوچھو اس سے"۔ چاچارانجھن نے تیزی سے ان سب سے کہا وہ سب اٹھ کر بھاگنے ہی والے تھے کہ فضا میں چیخ بلند ہوئی۔ اور دریا کی لہروں میں خونخوار انداز میں غراکر اسے اپنے اندر سمیٹ لیا۔ ان سب نے افسوس سے آہیں بھریں۔

"ارے بابا' وہ گر گئی' اسے بچاؤ' بھاگو اچھو مچھیرے کو جھونپڑی سے جگاؤ"۔ چاچا رانجھن نے پھر امید کی کرن جگائی۔ خود بھی بھاگے' ان کے ساتھ سب لوگ شور مچاتے ہوئے دریا کے اس حصے کی طرف چلے گئے جہاں انہوں نے اسے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اچھو نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر چھلانگ لگادی تھی اور منہ زور لہروں سے لڑتا ہوا چاروں طرف ہاتھ مار رہا تھا۔ وہ سب باہر کھڑے دعائیں مانگ رہے تھے۔

سب کے چہروں پر یاسیت چھائی ہوئی تھی۔ خصوصا" چاچارانجھن کے چہرے پر۔ جو اکثر وبیشتر ایسی بے شمار لڑکیوں کو ڈوبتا دیکھ چکا تھا۔ ان کی اپنی رانی اسی دریا کی نذر ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ جوگ لے کر یہیں دریا کے کنارے آبسے تھے۔ ساری دنیا سے کٹ کر صرف اپنی بانسری کے ساتھ۔ جوان کا واحد سہارا تھی۔ ساری جوانی تج دی تھی۔ اس کچے چھپر کے نیچے۔ جس میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اور باہر برآمدہ سا۔ جسے انہوں نے چائے کا ہوٹل بنا رکھا تھا۔ اردگرد کے رہنے والے ان کی اس چھوٹی سے عافیت گاہ میں پہروں بیٹھے چائے پیتے اور پھر ان کی بانسری کے سوز میں کھو جاتے۔ بانسری کے حوالے سے ہی ان کا نام چاچارانجھن پڑ گیا تھا۔

"اس وقت انکی بڑی عجیب حالت تھی انہیں چاروں طرف رانی نظر آرہی تھی۔ جو ڈوب رہی تھی۔ اور انہیں پکار رہی تھی۔ بے خودی میں وہ زور سے چلائے۔

"میں آرہا ہوں رانی" اس سے پہلے کہ وہ چھلانگ لگاتے' سب نے انہیں مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اور اسی لمحے اچھو نے کامیابی کا نعرہ بلند کیا۔

"چاچا! لڑکی مل گئی ہے"۔ سب نے خوشی سی کہا۔ اور وہ واپس اپنی دنیا میں آگئے۔

ان کے کہنے کے مطابق اچھو لڑکی کو چاچارانجھن کے کمرے میں لے آیا۔ اور فرش پر الٹا کر کے دباؤ سے پانی نکالنے لگا۔ وہ بے ہوش تھی۔ مگر جسم میں جان تھی۔ یہی بات چاچا

رانجھن کے لئے خوش کن تھی۔ ان کی جھری زدہ چہرے پر اطمینان چھلکنے لگا۔ (تھوڑی دیر میں اچھو نے سارا پانی نکال دیا۔ اور اسے پلنگ پر لٹا دیا۔

"چاچا! اب یہ تھوڑی دیر میں ہوش میں آجاوے گی۔ تو گرم دودھ پلا دینا"۔ وہ یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ اور انہوں نے سب کے درمیان آکر کہا۔

"تم سب بھائیوں کو اس بات پر کوئی اعتراض تو نہیں کہ یہ بیٹی میرے پاس رہے"۔

"نہیں ۔___نہیں چاچا! کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم سے بڑھ کر کون اس کا خیال رکھ سکتا ہے۔ ہم لوگ چلتے ہیں"۔ وہ سب ان کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ نہایت تکریم سے بولے اور اپنے اپنے گھروں کی جانب چل دیئے۔ اور وہ دودھ گرم کرنے لگ گئے۔

جب چمچہ چمچہ دودھ وہ اس کے منہ میں ڈال رہے تھے' تو انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بینائی سے محروم ہے۔ اور اس نے جان کر مرنے کا ارادہ کیا تھا۔ جیسے ہی دودھ ختم ہوا اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ابھی تک یقین نہیں کر پائی تھی کہ مرگئی ہے یا زندہ ہے۔ زندہ ہے تو کس کے پاس ہے؟

"بیٹی! نئی زندگی مبارک ہو"۔ چاچا نے محبت سے کہا اتنی میٹھی اور ہمدرد زبان سن کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ اور کوئی پھر اس سے ہمدردی کر رہا ہے ہمیشہ کی طرح' اور پھر یہ ہمدردی زہر بن جائے گی۔ ناگ بن جائے گی جس کے خوف سے وہ ایک نئی منزل کی طرف بھاگنے لگے گی۔___سب کچھ پیچھے چھوڑ کر۔

"بیٹی بول' کیا نام ہے تمہارا؟" انہوں نے پھر شفقت سے پوچھا

"کیا بولوں۔ کچھ بولنا نہیں چاہتی؟" وہ آہستہ سے بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے تم آرام کرو' صبح باتیں کریں گے"۔ وہ اسے زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لالٹین کی لو کم کی' اور فرش پر بستر بچھا کر سوگئے۔___(جب کہ وہ روتی رہی اپنے پیارے بھائی کو یاد کرتی رہی جسے وہ اسپتال میں لاوارثوں کی طرح چھوڑ آئی تھی۔ نہ جانے غیروں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا؟ پتہ نہیں زندگی اب کیا رخ اختیار کرے۔ میں تو زندگی کے تمام نشان مٹا آئی ہوں۔ اسی لمحے دل نے سرزنش کی کہ۔ نہیں خوشبو کا احساس انمٹ ہے۔ تم اسے فراموش نہیں کر سکتیں۔

"ہاں! لیکن میں اس احساس کو پا بھی تو نہیں سکتی وہ سراب ہے۔ میں اس کے پیچھے بھاگ نہیں سکتی"۔ اس نے غصے سے دل کو ڈانٹا۔

اسے کیا علم تھا کہ وہی سراب حقیقت میں اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ مگر ہر بار ناکام ہو جاتا تھا۔ آج جب پایا تو کھونے کے احساس نے کمر سی توڑ دی۔ دیوانوں کی طرح ہر ایک سے اس کا پوچھا۔ ہسپتال کا کونہ کونہ چھان مارا۔ سوائے رشید کی میت کے کچھ نہ ملا۔ اور پھر وہ سمجھ گئے کہ وہ رشید کو خدا کے سپرد کر گئی ہے۔ اور شاید خود کہیں گم ہو گی ہے۔

"اف، منتظر حسن! یہ تم نے کیا کر دیا۔ اس سے جینے کا سہارا بھی چھین لیا"۔ وہ بلک اٹھے اب رشید کو اس کے مقام تک پہنچانے کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی تھی۔ تمام حوصلے یکجا کر کے انہوں نے گھر سے رحمو کو بلایا اور اسے کچھ پیسے دے کر تدفین کا انتظام کرنے کو کہا۔ وہ بھی دکھی سا مصروف ہو گیا۔

صبح سویرے وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر پہنچے تو جسم درد سے چور تھا۔ سیدھے اپنے کمرے میں گئے اور بستر پر گرتے ہی انہیں کچھ ہوش نہیں رہا۔ آج وہ ایک بار پھر متاع حیات لٹا آئے تھے۔

☆☆☆☆

سکھی نے اپنی کہانی چاچا انجھن کے گوش گزار کر دی تھی۔ انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ بہت دکھی ہوئے اسے ڈھیروں تسلیاں دیں اور پھر رشید کی میت لینے کیلئے ہسپتال بھی گئے۔ وہ بڑی دیر سے ان کے منتظر تھی۔ جو بس بھی گزرتی وہ سمجھتی کہ چاچا انجھن آ گئے ہیں۔ جیسے ہی وہ آئے تو وہ بے تابی سے بولی۔

"چاچا! رشید کو میرے پاس لے آؤ"۔

"بیٹی! رشید کو میں نہیں لا سکا"۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں ___ کیوں چاچا؟" وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

"رونے کی کوئی بات نہیں، اسے کسی منتظر حسن نے دفنا دیا ہے"۔ انہوں نے اس کی آنکھیں انگلی کی پور سے صاف کیں۔

منتظر حسن"۔ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"بیٹی اب غم نہ کرو، اس کو آخری جگہ مل گئی ہے، بس تم اپنا خیال رکھو"۔ انہوں نے اسے دلاسہ دیا۔ وہ خاموش رہی۔ تو وہ پھر بولے۔

"میں اب باہر آگ وغیرہ جلا کر دودھ گرم کروں، لوگ باگ جمع ہونے والے ہیں"۔ ان کے جاتے ہی وہ سسک اٹھی، زندگی اسے مل گئی تھی۔ بس اس کا بھائی نہیں رہا تھا۔ جتنی عمر اس نے پائی عذاب مسلسل میں رہا۔ مگر اسے کوئی تکلیف نہیں دی، اس نے اس کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ یا پھر اس کے بس میں کچھ تھا ہی نہیں۔ فضیلت کو کون سا اس کے دکھ میں شریک ہونا تھا۔ گھر میں اس کی نعش سڑ بھی جاتی تو وہ کوئی انتظام نہ کرتی۔ بابا اور رفیق کو دو تین دن بعد آنا تھا۔ اس نے اچھا ہی کیا کہ دکھوں کی چادر پہلے ہی اوڑھ کر اسے خود سے جدا کر دیا۔

"بہت شکریہ منتظر حسن صاحب! تم نے میرا مان رکھ لیا ہے۔ خود کو کچھ اور بھی مجھ میں سما دیا ہے، جب، جب رشید کی یاد آئے گی تم چپکے سے میرے ذہن میں آ جاؤ گے۔ اور نہ پاتے ہوئے بھی میں تمہیں پا لیا ہے۔ پتہ نہیں تم کیسے ہو ___ بس میں تو اتنا جانتی ہوں کہ رشید کے بعد میری زندگی تمہارے احساس سے ہمیشہ مہکتی رہے گی۔ پہلے تو تمہاری مخصوص خوشبو مجھ پر قابض تھی۔ اب اتنا بڑا احسان کر کے تم نے مجھے ہمیشہ کے لئے جیت لیا ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگی۔ بلکہ مانگ ہی نہیں سکتی۔ البتہ تم جو کوئی بھی ہو۔ جہاں بھی رہو۔ خوش رہو، اس سے زیادہ میری کوئی تمنا نہیں۔ کوئی خواہش نہیں۔ میں تو آج یہاں ہوں نہ جانے کل کہاں بسر ہو۔ گمنام وجود ہمیشہ کھو جاتے ہیں۔ تم مجھے تلاش کیوں کرو گے"۔

عجیب احمقانہ سوچ تھی اس کی، اس نے خود بخود فرض کر لیا تھا کہ وہ اسے کیوں تلاش کریں گے؟ حالانکہ کون سی جگہ تھی جو انہوں نے نہ چھانی ہو۔ اب تو وہ ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ صرف امیدیں جوان تھیں۔ جن کے سہارے اس کی تلاش کا سلسلہ جاری تھا۔ کوئی اور کیوں اس طرح ایک معمولی سی لڑکی کے لئے مارا مارا پھرتا۔ کیا تھا اس کے پاس، صرف حسن معصومیت پاکیزگی، ایک عام امیرزادے کو ان باتوں سے کیا دلچسپی __؟ اسے اندھی لڑکی سے کیا مطلب؟ امیرزادے سے ہٹ کر آج کا غوب بھی شاید یہ باتیں برداشت نہیں کرتا۔ جب

کہ انہیں اس کی ہر بات سے عشق تھا۔ اس کے فراق میں سلگ رہے تھے۔ حال سے بے حال ہو گئے تھے۔

بی جی انہیں دیکھ دیکھ کر کڑھ رہی تھی۔ صبح سے وہ ان کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ اور وہ بے سدھ پڑے تھے۔ شام ڈھلنے کو تھی تب انہوں نے بوجھل بوجھل پلکیں کھولیں۔ سرخ آنکھیں بی جی کو ہولا گئیں۔

"ارے چندا' کیا رات جاگتا رہا ہے"_

"ہاں' بس رات بھر ایاز کے ہاں محفل جمی رہی" انہوں نے صاف جھوٹ بول دیا۔

"حیرت ہے' پہلے تم نے محفلوں کی پرواہ نہیں کی۔ اور رات جاگ کر گزار دی"۔ بی جی تشویش بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"کبھی کبھی بی جی زندگی کی محرومیوں سے تنگ آکر محفلوں میں کھونا بھی پڑتا ہے"_ وہ سراسیمگی سے بولے۔ اور کمرے میں داخل بیلا نے ان کی بات کا جواب دیا۔

"ہرچند کہ محرومی سے جینے کا حوصلہ چھین لیتی ہے۔ مگر جینا پڑتا ہے"۔ بے انتہا تڑپ تھی اس کے جملے میں وہ اس کی بات کے قائل ہو گئے۔

"بیلا! کہاں تھیں سارا دن؟" بی جی نے پوچھا۔ کیونکہ وہ صبح سے غائب تھی۔

"جی بس سڑکیں ناپ رہی تھی" وہ مزاحاً" بولی۔

"پھر بھی!" بی جی نے دوبارہ پوچھا۔

"میں کل پانچ بجے کی فلائٹ سے واپس جا رہی ہوں"۔ اس نے یہ انکشاف کر کے گویا ان دونوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

"مگر بیٹی کیوں؟ احمد نے تو____" بی جی نے کچھ کہنا چاہا۔

"ان کے یہاں آنے سے کچھ حاصل نہیں"۔

"بیلا! احمد چچا کو دکھ ہو گا"۔ وہ نرمی سے بولے۔

"میرے دکھ کی نوعیت سے مختلف ہے ان کا دکھ"۔ وہ سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھ کر بولی۔

"بیلا احمد! احمد تو یہاں خود آئے گا۔ اور پھر تمہیں یہیں رہنا ہو گا"۔ بی جی کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔

"نہیں بی جی' یہ پرایا گھر ہے۔ میں یہاں کیسے رہ سکتی ہوں؟ منتظر حسن نے صاف آنسوؤں کی نمی اس کے لہجے میں محسوس کی۔

."پاگل ہو گئی ہو' چاند کے ساتھ____"

"چاند مجھے بطور شوہر قبول نہیں ہے"۔ ان کی بات درمیان میں کاٹ کر وہ بڑے ضبط سے بولی۔ اور پیٹھ موڑ لی کہ مبادہ کہیں چھلکتے آنسو نظر نہ آجائیں۔ ساری تہمت اس نے اپنے سر لے لی تھی۔ وہ بے کل سے ہو گئے جو زہر وہ قطرہ قطرہ پی رہی تھی۔ اس کی تلخی کا انہیں احساس تھا۔

"کیا واہی تباہی بک رہی ہو؟" بی جی غصے سے بولیں۔

"بی جی! پلیز' چاند میرا بہت اچھا دوست ہے' ضروری تو نہیں جس سے دوستی ہو' شادی بھی اس سے کی جائے"۔ آنکھیں صاف کر کے وہ بی جی کے شانے لاڈ سے تھامتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ لیکن جو طوفان اس کی مسکراہٹ سے چھپے تھے اس کا اندازہ بی جی نے لگا لیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ بطور بیوی' منتظر حسن کو بیلا قبول نہیں تھی۔ وہ اس عظیم لڑکی کے آگے چپ ہو گئیں۔ جب کہ منتظر حسن شرمندہ سے ان سے نظریں چرا کر خلاؤں میں گھورنے لگے۔

وہ بے حس نہیں تھے' نہ ہی کٹھور تھے۔ مگر دل کے ہاتھوں مجبور تھے کہ دل صرف اسی الہڑ کے نام پر دھڑکتا تھا۔ انہیں خود اختیار نہیں تھا۔ دنیا کی تمام مصروفیات چھوڑ کر وہ بنجاروں کی طرح بھٹکتے پھر رہے تھے۔ شاید ان کی محبت میں' ان کے جذبوں میں ہی کمی تھی۔ جو وہ مل کر بچھڑ جاتی تھی۔ اور انہیں ایک نئی چتا میں لٹا جاتی تھی۔ کیا صبر آزما امتحان لے رہی تھی وہ! ہر مرتبہ ان کی کسی بھول' کسی انجانی زیادتی کا شکار ہو کر بھی انہیں خاموشی سے معاف کر کے گزر جاتی تھی انہیں کچھ کہنے کا موقعہ بھی نہیں دیتی تھی۔ تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ سامنے آتی۔ اور پھر خواب و خیال بن کر رہ جاتی' پہلے احساس جرم کیا کم تھے جو وہ مزید گہری کسک انہیں دے گئی تھیں انہوں نے اس مرتبہ تو اس کا بھائی بھی چھین لیا تھا مگر وہ کیسے حوصلے سے انہیں بغیر کچھ کہے چلی گئی تھی۔ "شاید وہ مجھے جانتی بھی نہیں اسے کیا معلوم کہ میں نے اس

کے بھائی کی جان لی ہے۔ میں نے اس کے پھول جیسے رخسار پر تھپڑ مارا تھا۔ میں نے ہی اسے بی جی کی شفقت سے محروم کیا تھا۔ کبھی براہ راست تو اس سے بات ہوئی ہی نہیں۔ اسے میرا کیا پتہ"۔ کتنی بڑی غلطی کی ہے منتظر حسن تم نے 'اس بار موقعہ تھا اس سے بات کر لیتے۔ سب حال دل سنا ڈالتے۔ اپنے ہر قصور کی معافی مانگ لیتے۔ اپنی زندگی اس کے قدموں میں رکھ دیتے۔ پھر جو سزا وہ دینا چاہتی دے دیتی' اگر تمہیں قبول نہ بھی کرتی تو کم از کم تمہارے دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جاتا۔ تم اس کا انکار سن کا خوشی سے کہیں گم ہو جاتے۔ اپنے جذبوں کو امر کر دیتے۔ "مگر ____ مگر اب میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں۔ کس طرح تلاش کروں؟" وہ پاگلوں کی طرح چلا اٹھے۔ بی جی گھبرا کر ان کے کمرے میں دوبارہ داخل ہوئیں۔ چاند' چاند بیٹا' کیا بات ہے؟"

"بی جی! میں تھک گیا ہوں۔ میں مجرم ہوں۔ میرا ضمیر ملامت کرتا ہے"۔ وہ بچوں کی طرح بی جی کی گود میں منہ چھپا کر سسک اٹھے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کچھ بتاؤ بھی' کیا بات ہے۔ میرا دل ہولنے لگا ہے"۔ بی جی کمزور دل تو پہلے ہی تھیں وہ ان کے غم اور پریشانی پر تو فوراً" رونے لگتی تھیں۔ وہ فوراً" سنبھلے۔

"بی جی بس' کام کی زیادتی سے گھبرا گیا تھا ____ "بہانہ فوراً" پیش کر دیا۔

"اللہ رے' تم اور کام سے گھبرا گئے"۔ بی جی کو ہنسی آ گئی۔

"ایمان سے ____ آپ یقین کریں"۔ انہوں نے بھرپور کوشش کی یقین دلانے کی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ مگر تم ذہن پر سوار کیوں کرتے ہو' بیمار ہو جاؤ گے"۔ انہوں نے تنبیہہ کی۔

"ایسا ہی کروں گا"۔ وہ سعادت مندی سے سرہلا کر بولے۔

"چلو اٹھو' کھانا کھالو' پھر آرام کرنا"۔ بی جی نے کہا اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆☆

کافی دنوں بعد چمکیلی دھوپ نکلی تھی۔ ہر طرف دھوپ نکلنے کی وجہ سے چہل پہل تھی۔

وہ ایک مرتبہ پھر وقت کے دھارے پر بہنے لگی تھی اپنی تمام محرومیوں سے سمجھوتہ کر کے کچھ مطمئن سی ہو گئی تھی۔ یا پھر چاچا رانجھن نے اسے سمجھا بجھا کر جینے کا حوصلہ بخشا تھا جب اس نے ان کی کہانی سنی تھی۔ تو ان کے دکھ پر رو دی تھی انہیں اس دریا نے رانی چھین کر بیٹی کی صورت میں رانی لوٹا دی تھی۔ چاچا رانجھن اسے رانی ہی کہتے تھے۔ وہ ان کی خوشی سے خود بھی خوش ہو جاتی

بہت سے میلے کپڑے جمع تھے وہ انہیں دھونے بیٹھ گئی۔ چاچا اس کے قریب بیٹھے بانسری کی دھن میں کھو گئے تھے۔ وہ بھی غور سے سن رہی تھی اسی وقت کسی گاڑی کے بریک ان کے دروازے پر چرچرائے اور تھوڑی دیر میں کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ بابا جلدی سے بانسری رکھ کے باہر چلے گئے۔ نہ جانے کون آیا تھا۔

وہ کپڑے تار پر پھیلا کر فارغ ہوئے تو چاچا رانجھ تھکے تھکے قدموں سے اندر آ گئے۔" کیا بات ہے چاچا' کون آیا تھا؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"بابو لوگ تھے' کہہ رہے تھے کہ وہ قانونی طور پر یہ زمین خرید چکے ہیں"۔ چاچا کی آواز شکست خوردہ ہو رہی تھی۔

"کیا؟ مگر کیسے؟ وہ لوگ یہاں ویرانے میں کیا کریں گے؟" وہ غصے سے بولی۔

"وہ یہاں سیر گاہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہمارا گھر درمیان میں آتا ہے۔ اور پھر ویسے بھی کونسی ہماری زمین ہے"۔ چاچا رانجھن دکھ سے بولے۔

"تم نے کیا کہا؟" وہ دھیرے سے بولی۔

"؟ کچھ نہیں' کیا کہتا' وہ کہتے ہیں کہ ہم پیسے دیں گے تم کہیں اور چلے جاؤ"۔ انہوں نے جواب دیا۔

"مگر ہم کہاں جائیں گے؟" اس کے آنکھیں بھر آئیں۔ قسمت نے اس کے اطمینان میں پھر چنگاری لگا دی تھی۔

"خدا کی زمین بڑی ہے ہمیں جانا ہی ہوگا"۔ چاچا نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور وہ سوچ کے رہ گئی۔

"اب تو میرے مقدر کی تختی پر سکون لکھ دے خدا"

چاچا رانجھن دکھوں کی بانسری بجانے لگے۔ اور وہ نصیب کے کھیل میں اپنی ہار پر بے بسی سے ایک طرف بیٹھ کر سوچنے لگی۔

"نہ جانے اب کس بستی میں بسیرا ہو' کہاں صبح ہو' اور کہاں شام ہو۔ کس کس نگر سے نکلوائے گی یہ زندگی مقدر کی سختی کب ختم ہوگی؟ میرے قریب تو موت بھی نہیں آئی۔ کتنا اچھا رہا رشید' روز روز کی بھاگ دوڑ سے تو بچ گیا۔ ایک جگہ تو سویا رہے گا۔ سب باتوں سے بے فکر' کوئی اسے وہاں کچھ نہیں کہے گا۔ اور میں ایک گیند کی مانند انسانوں کی ٹھوکروں میں ہوں۔ ٹھوکریں ہی میرا مقدر ہیں___" سوچتے سوچتے آنکھیں بھیگ چلیں۔ دل نے ہنس کر کہا۔

"پگلی! ہمیشہ کی طرح زبان بند رکھ' شاید تیری خاموشی' خوشی کی زبان بن جائے"_

اس نے پہلو سے آنسو خشک کئے اور دوپہر کا کھانا بنانے میں مصروف ہوگئی۔ یہی تو اس کی عظمت تھی کہ وہ صبر کی سل رکھ کر پرسکون ہو جاتی تھی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے کام میں مصروف تھے۔ اور بانسری کی مدھر تان دور تک فضاؤں میں اپنا اثر پھیلا رہی تھی۔

☆☆☆☆

کئی روز سے چاچا رانجھے کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس پر ستم یہ کہ انہیں جگہ خالی کرنے کا نوٹس مل گیا تھا۔ انہوں نے اسے سامان باندھنے کو کہا اور خود دوائی لینے شہر چلے گئے۔ وہ سامان سمیٹ کر اکٹھا کرنے لگی۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دوپٹہ سر پر جماتی ہوئی دروازے کی اوٹ میں ہو کر پوچھنے لگی۔ "کون ہے؟"

"چاچا رانجھ صاحب کو باہر بھیجیں"۔ بڑے مؤدب اور بارعب آواز میں کہا گیا آواز سے پہلے خوشبو کا بھبھکا اس کے نتھنوں میں گھس گیا۔ دھڑکتے دل سے وہ بولی۔

"جی وہ تو نہیں ہیں"۔

"ٹھیک ہے۔ تم کون ہو۔ میرا مطلب ہے چاچا کی___؟"

"بڑی عجلت میں پوچھا گیا۔ وہ جو بے خود سی ہو رہی تھی گھبرا کر بولی۔

"جی بیٹی!"

"زمین کی رقم لے لو' بیس ہزار روپے ہیں"۔ دروازے سے ہاتھ انہوں نے اندر بڑھا دیا۔ اس نے اندازے سے لرزتا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور ہاتھ' ہاتھ سے چھو گیا۔ وہ سراپا کانپ اٹھی۔ بے دھیانی میں پیسے لے لئے۔

"گن لو"۔ آواز پر وہ چونکی۔

"? ٹھیک ہی ہوں گے"۔ بمشکل کہہ سکی۔ پھر گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ اور وہ ساکت کھڑی ہونٹ چباتی رہ گئی' چوتھی مرتبہ یہ جھونکا اس سے ٹکرایا تھا۔ مگر ہمیشہ کی طرح اجنبی بن کر بالکل غیر متوقع انداز میں۔ ایک نیا احساس لے کر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے میں آگئی۔

"چاچا آئے اس نے پیسے انہیں دے دیئے۔

"اچھا آدمی ثابت ہوا۔ خیر ہم کل چلے چلیں گے" چاچا نے بے خیالی میں کہا۔ وہ خاموش رہی۔

رات چاچا سب کو دکھ سے بانسری سناتے رہے۔ سب تقریباً" رو پڑے۔ جب انہوں نے اپنے جانے کا بتایا۔ پھر ساری رات وہ ان کی بانسری کی تان میں کھوئے رہے۔ صبح فجر کی نماز پڑھتے ہی چاچا نے اسے تیار ہونے کو کہا۔

وہ بے دلی سے چادر اوڑھ کر تیار ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں بیل گاڑی آگئی۔ بیل گاڑی کا مالک عبداللہ اداسی سے سامان رکھنے لگا۔ جب سامان رکھ چکا تو چاچا نے اسے بھی بیل گاڑی میں ایک طرف بٹھا دیا اور بولے۔

"بیٹی! عبداللہ تمہیں لے کر چلتا ہے۔ میں ان بابو صاحب کا انتظار کرتا ہوں انہیں چابی لینے آنا ہے۔ اچھا چاچا وہ بولی عبداللہ نے بیل کو چلنے کا اشارہ کیا' چاچا بھری بھری آنکھوں سے انھیں جاتا دیکھتے رہے جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے تو وہ آخری مرتبہ بانسری ہونٹوں سے لگا کر دریا کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے اپنی رانی سے کہہ رہے ہوں" آخری بار سن لو' پھر ہم کبھی نہیں سنا سکیں گے"۔ کسی نے آہستگی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ پلٹے۔

"سلام بابو صاحب"۔ وہ بولے۔

"وعلیکم السلام کا نہایت پرخلوص جواب ملا"۔ ہم شرمندہ ہیں تم سے جگہ خالی کرا کے مگر کیا کریں بہت عرصہ پہلے گورنمنٹ سے یہاں پارک بنانے کی اجازت مانگی تھی"۔

"کوئی بات نہیں صاحب! ہم کہیں بھی رہ لیں گے۔ یہ لو چابی"۔ چاچا رانجھن نے جیب سے چابی نکال کر ان کی طرف بڑھائی۔ انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پرس کے ساتھ کوئی چیز نکل کر زمین پر گر گئی۔ ان کے ساتھ چاچا رانجھن بھی جھکے اور وہ تصویر اٹھالی۔ جو زمین پر گری تھی۔ وہ حیران اور پریشان نظروں سے کبھی تصویر دیکھ رہے تھے اور کبھی انہیں۔ پھر ہکلاتے ہوئے بولے۔

"یہ' یہ' یہ فوٹو"۔

"یہ فوٹو' میری امنگوں کا مقبرہ ہے"۔ وہ کرب سے بولے۔ اور فوٹو جیب میں رکھ لیا۔ "بابو صاحب' یہ فوٹو___" وہ بات پھر مکمل نہ کر سکے۔

"چاچا یہ میری زندگی کی علامت ہے' مجھ سے بچھڑ گئی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ گاڑی کی جانب بڑھے۔

"مگر یہ تو میری بیٹی جیسی ہے' بلکہ میری بیٹی کا فوٹو ہے"۔ وہ تیزی سے ان کے آگے آگئے۔

"کیا--- ؟ تمہاری بیٹی' لیکن یہ دنیا میں اکیلی ہے۔" وہ گردن جھٹک کر سوچنے لگے۔

"اکیلی ہی تو ہے۔ بھائی تھا قدرت نے وہ بھی لے لیا"۔ چاچا رانجھن غمگین ہو گئے۔

"بھائی! وہ زیر لب بڑبڑائے۔ دل نے شور مچایا۔ دھڑکنیں اتھل پتھل ہونے لگیں۔

"کہاں ہے تمہاری بیٹی؟" وہ بے تابی سے بولے۔

"وہ تو جا چکی" چاچا شکست خوردہ سے بولے۔

کہاں؟ کب؟" ان کی بے تابی دیدنی تھی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے آپ کا گھر بھی تو خالی کرنا تھا"۔ چاچا رندھی ہوئی آواز میں بولے۔

"پلیز چاچا' تم سب کچھ لے لو' یہ چابی لو' مجھے اپنی بیٹی سے ملوا دو' کہیں وہ میری سکھی ہی ہو! شدید جذبات سے وہ ان کے ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔

"سکھی____یہ تو تمہاری ہی سکھی ہے"۔ چاچا نے مسرت سے ان کا کندھا تھپتھپایا
وہ بھونچکا سے انہیں دیکھنے لگے۔

"جلدی جاؤ۔ تمہیں راستے میں مل جائے گی وہ بیل گاڑی پر ہے" چاچا نے خوشی سے کہا۔ اور انہوں نے تیزی سے گاڑی موڑی اور دوڑا دی

دل بری طرح مچل رہا تھا عجیب شور تھا دھڑکنوں میں۔

"خدا کرے وہ سکھی ہی ہو' میری زندگی' میری خوشی" انہوں نے بے اختیار ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے' لمحہ قبولیت کا تھا وہ دور سے ہی اسے پہچان گئے بڑی تیزی سے اس تک پہنچے ان کے قریب پہنچتے ہی وہ بھی برے طرح **ٹھٹھکی** -------- بے رونق ماحول سے معطر سا رنگ اس نے شدت سے محسوس کیا تھا۔

"رک جاؤ" انہوں نے عبداللہ کو کہا۔ اس نے ایک طرف کر کے بیل گاڑی روک لی۔

"سکھی"۔ پہلی مرتبہ وہ اس سے مخاطب تھی۔ وہ اپنے کانوں پر یقین نہیں کر پا رہی تھی۔

"سکھی! تمہاری کھوج میں بڑی مشکل سے یہاں پہنچا ہوں"۔ وہ مدھم لہجے میں بولے۔ اسے دوسرا شاک لگا تو گویا وہ بھی اس کی گرفت میں تھا۔ اس لئے بار بار ٹکراتا تھا۔

"میری بات کا جواب دو"۔

"جی آپ! اس کے لب بمشکل ہلے۔

"سکھی! میں تمہارا مجرم ہوں۔ قدم قدم پر میں نے تمہیں اذیتیں دی ہیں۔ لیکن خدا گواہ ہے میں نے جانتے بوجھتے ایسا نہیں کیا" وہ گڑگڑائے۔

"وہ سب میری بد نصیبی تھی۔" اس نے روندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن ہر بار میں ہی کیوں آزمایا گیا؟" وہ احتجاً" بولے۔

"اس بات پر تو میں خود حیران ہوں" اس نے آہستہ سے کہا

"تم مجھے جانتی تھی۔ پہچان لیتی تھیں" انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں اسی لئے تو ہر بار آپ کو معاف کر دیتی تھی" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر کیسے؟ جب کہ میں صرف معافی کی خاطر تمہیں دل و جان سے قریب محسوس کرنے لگا"۔

"خدا کے واسطے یہ سب مت کہیں۔ میں نے آپ کو معاف کیا۔ اب آپ جائیں"۔

"سکھی! پلیز، صرف معافی نہیں چاہیے۔ تمہارا ساتھ بھی چاہیے"۔ وہ بے دم سے ہونے لگے۔

"نہیں مجھے اپنے نصیب کی سیاہی سے ڈر لگتا ہے"۔ وہ دکھ سے بولی۔ عبداللہ جو کچھ فاصلے پر کھڑا ان کے جانے کا انتظار کر رہا تھا بولا۔

"بہن! تمہیں جانا ہے یا میں سامان لے کر جاؤں"۔

"بھائی تم جاؤ۔ یہ اپنے گھر جائیں گے"۔ اس سے پہلے وہ خود بول پڑے۔ اور عبداللہ سامان والی ریڑھی لے کر چاچا رانجھن کے نئے آشیانے کی طرف بڑھ گیا۔

تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ تمہاری خاطر میں کتنا تڑپا ہوں" انہوں نے دکھ سے کہا

"مجھے اندازہ ہے مگر____"

"مگر کیا____ تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟ وہ چلائے۔

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں کس قابل ہوں میں"

"سکھی! بس جو کچھ بھی ہو تم صرف میری ہو"۔ وہ بے خودی میں بولے۔

"ہنہ سکھی نام ہے میرا، آنسوؤں کی بارش میری سہیلی ہے۔ جو ہر لمحہ میرے ساتھ رہتی ہے"۔ وہ اداس سی ہنس کر بولی۔

"بہت اچھی سہیلی ہے تمہاری کیونکہ اس نے ہی تو مجھے تم سے ملایا ہے"۔ وہ مسرور سے بولے۔

"خوف آتا ہے مجھے" وہ لرز رہی تھی۔

دیکھو بارش کے بعد آسمان پر قوس قزح کے رنگ ابھر آتے ہیں اسی طرح تمہاری زندگی میں بھی بارش کے بعد قوس قزح کی بہار آئی ہے۔ اعتبار کر لو" اتنے وثوق اور ٹھوس لہجے میں انہوں نے سمجھایا کہ وہ خاموش رہی۔

تاثرات

آ خیالوں میں اچھوتی خوشبو
کبھی بارش کی طرح دل پہ اتر

اور بارش جب سہیلی بن جائے تو یادیں اور بھی خوش رنگ ہو جاتی ہیں اپنی تنہائی پر کڑھنے والے دل کو آسمان کے آنسو نصیب ہو جائیں تو زندگی کا راز خود پر کھلنے لگتا ہے۔ آنسو آنسو سطر' سطر---لفظ کاغذ پر رقص کرنے لگتے ہیں۔ کن من کن من رقص---انہی لفظوں میں زندگی کی قوس قزح ابھر کر کہانی کا روپ دھار لیتی ہے۔ راحت وفا کی ان کہانیوں میں ان گنت آنکھوں کے جیتے جاگتے خواب محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ غور کریں تو کتنے دلوں کی دھڑکنیں' کتنی محبتوں کے آنسو اور کتنے گھروں کے مسائل بارش میری سہیلی میں نظر آتے ہیں۔

بارش میری سہیلی میں انسانی احساسات و جذبات کی جزئیات نگاری عروج پر نظر آتی ہے۔ راحت وفا انسانی نفسیات کے عمیق مشاہدے اور لفظوں کی کشیدہ کاری سے منظر منظر میں جان ڈال دیتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں آج کے اس تیز رفتار معاشرے کے دکھ' شہر کی چکاچوند میں آنکھیں گنوا دینے والوں کے المیے' حرص و ہوس کی بدصورتیاں اور محبت کی تلخ و شیریں تصاویر حقیقی رنگوں میں نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ بارش میری سہیلی کو زندگی کا البم بھی کہا جاسکتا ہے۔ ایسی کہانیاں دلوں کو راہ پر رکھنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ راحت وفا اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایک بڑی افسانہ نگار کا مرتبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

اختر شمار

☆

راحت وفا کے افسانے پڑھ کر دل میں میٹھا میٹھا درد جاگ اٹھتا ہے۔ وہ زندگی کے کڑوے **کسیلے** مناظر بھی نہایت شیریں انداز میں قاری کے لہو میں گھولنے کے ہنر سے آشنا ہیں۔ ان کی کہانیوں کی سطر سطر میں مشاہدے کی لو جھلملاتی نظر آتی ہے۔ اپنے اردگرد بکھری سچائیوں کو موضوع بناتے ہوئے ان کی فنی صلاحیتیں بام عروج پر ہوتی ہیں۔ راحت وفا کی تحریر میں دلنشیں پختگی' حساس دل کی دردمندی' انسانی رویوں کا خمیر' امید و بیم کی روشن کرنیں اور محبت کی دلاویز مہک جابجا محسوس کی جاسکتی ہے۔ قوی یقین ہے کہ "بارش میری سہیلی" کے افسانے پڑھنے والوں کو تادیر یاد رہیں گے۔

خواجہ ندیم اسلم